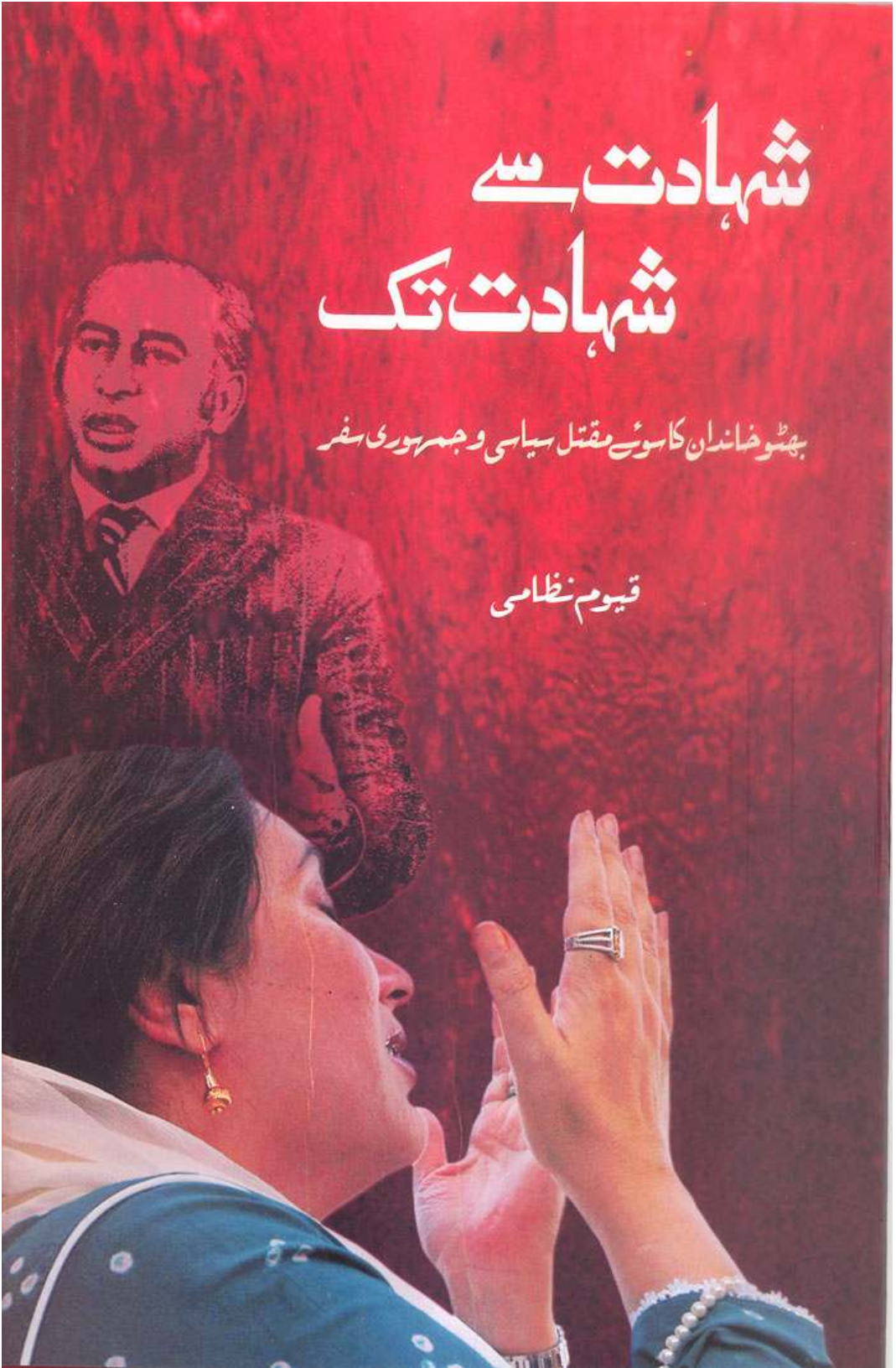

Shahadat See Shahadat Tak

By Qayoom Nizami

Reproduced by:

Sani Hussain Panhwar
Member Sindh Council, PPP

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شہادت سے شہادت تک

بھٹو خاندان کا سوئے مقتل سیاسی و جمہوری سفر

قیوم نظامی

جہانگیر بکس

لاہور ۔ راولپنڈی ۔ ملتان ۔ فیصل آباد ۔ حیدر آباد ۔ کراچی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

انتساب

سانحہ کارساز کراچی اور لیاقت باغ راولپنڈی میں
جمہوریت کے لیے شہید ہونے والے غریب پاکستانیوں
کے نام

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کتاب کے آخر میں معروف سیاست دانوں اور دانشوروں کی انگریزی تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں۔
محترمہ بےنظیر بھٹو نے جلاوطنی کے دوران انگریزی میں ایک یادگار نظم تحریر کی وہ بھی کتاب میں شامل ہے
''شہادت سے شہادت تک'' ہر لحاظ سے ایک منفرد، مستند اور مکمل کتاب ہے جسے سیاست جمہوریت اور
شخصیات میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اپنی لائبریری کی زینت بنانا پسند کریں گے۔

قیوم نظامی

اُمید کی شہادت

بےنظیر بھٹو شہید نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز 1977ء میں کیا۔ وہ پاکستان کی دوبار خاتون وزیراعظم منتخب ہوئیں انہوں نے اپنی تیس سالہ سیاسی زندگی میں بیس سال دو آمروں کا مقابلہ کیا۔ زندگی کے آخری عشرے میں وہ پاکستان کے کروڑوں عوام کی امیدوں کا مرکز بن چکی تھیں پڑھے لکھے عوام کو توقع تھی کہ بےنظیر اپنے سیاسی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں پاکستان کو حالیہ سنگین بحران سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ غریب بےروزگار نوجوان کو یقین تھا کہ ان کی لیڈر انہیں روزگار کے مواقع فراہم کرے گی۔ اور وہ بھی عزت کے ساتھ جینے کا حق حاصل کر سکیں گے۔ خواتین کو امید تھی کہ بےنظیر انہیں مردوں کے مساوی مواقع فراہم کریں گی۔ پاکستان کے وکیلوں، مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، صحافیوں، انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں اور اقلیتوں، بیواؤں، یتیموں، بزرگ شہریوں اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے پاکستانی عوام نے بےنظیر شہید سے امیدیں اور توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ پاکستان اور عوام دشمن سنگدل عناصر نے 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں کروڑوں عوام کی امیدوں کو شہید کر دیا۔

''شہادت سے شادت تک'' بھٹو سے بےنظیر تک بھٹو خاندان کے سیاسی و جمہوری سفر کی مکمل داستان ہے۔ بےنظیر کے بچپن سے لے کر ان کی شہادت تک مکمل سوانح حیات کتاب میں شامل ہے۔ بےنظیر بھٹو کے انکشافات، بھٹو کی زندگی کی آخری رات، شاہنواز بھٹو کی پراسرار موت، مرتضیٰ بھٹو کا قتل، بیگم نصرت بھٹو ایک زندہ لاش، محترمہ بےنظیر بھٹو کی آخری کتاب بلاول بھٹو کا مستقبل اور یادوں کا سفر کتاب کے اہم اور چشم کشا ابواب ہیں۔ پاکستان کے نامور صحافیوں اور دانشوروں کی بےنظیر شہید کی شخصیت اور سیاست کے بارے میں دلچسپ معیاری تحریروں نے کتاب کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

فہرست

1- بے نظیر بھٹو کا بچپن اور تعلیم 11
2- بے نظیر بھٹو شملہ میں 37
3- میری سب سے پیاری بیٹی (بھٹو کا تاریخی خط) 46
4- بے نظیر کی اپنے پاپا سے آخری ملاقات 70
5- بھٹو کی زندگی کی آخری رات 75
6- شاہ نواز بھٹو کی پُراسرار موت 83
7- بے نظیر بھٹو کی شادی 94
8- پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم 97
9- بے نظیر بھٹو کی قومی خدمات 102
10- مرتضیٰ بھٹو کا قتل 108
11- بے نظیر بھٹو کے انکشافات 113
12- شہادت سے قبل بے نظیر کا آخری خطاب 129
13- دبئی سے مقتل گاہ تک 132
14- بیگم نصرت بھٹو ایک زندہ لاش 137

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

15- محترمہ بے نظیر بھٹو کی آخری کتاب 144
16- آصف زرداری اور پی پی پی 152
17- غیر متزلزل آصف زرداری 157
18- آصف زرداری قید اور قد دونوں میں اضافہ 160
19- مستقبل کا لیڈر بلاول 163
20- بے نظیر بھٹو کی سیاسی وصیت 167
21- یادوں کا سفر 170
22- بھٹو زاور ہمارا ملک (عباس اطہر) 178
23- الوداع بے نظیر (ارشاد احمد حقانی) 186
24- کہانی ختم (عباس اطہر) 190
25- چار قبریں ایک کہانی (حامد میر) 193
26- کچھ سوکھے ہوئے آنسو (نذیر ناجی) 197
27- محترمہ کی شہادت کا خون بہا (عطاء الحق قاسمی) 200
28- پاکستان بچانے کا آخری موقع (جاوید چوہدری) 203
29- بے نظیر کی المناک موت (ڈاکٹر صفدر محمود) 207
30- پاکستان کی بیٹی (خورشید ندیم) 211
31- بے نظیر بھٹو کچھ یادیں کچھ باتیں (شیری رحمٰن) 214
32- یادیں (بابر اعوان) 217
33- قاتل کون (قیوم نظامی) 220
34- بھٹو کی بیٹی بھی گئی (عرفان صدیقی) 224
35- بے نظیر بھٹو کچھ یادیں (محمود شام) 228
36- الوداع گلاب پوش بی بی (کشور ناہید) 232
37- اور زنجیر ٹوٹ گئی (قیوم نظامی) 235

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

38- زندہ بھی بے نظیر مر کر بھی بے نظیر (قیوم نظامی)..... 239

39- لاہور سے نوڈیرو تک (قیوم نظامی)..... 242

40- بھٹو خاندان کے سیاسی اثرات (فرح ناز اصفہانی)..... 246

41- شہادت کا دوشالہ (زاہدہ حنا)..... 249

42- وڈی بواء ___ الوداع (فاطمہ بھٹو)..... 253

43- جو چلے تو جاں سے گزر گئے (عبدالقادر حسن)..... 255

44- بے نظیر بھٹو سابق ملٹری سیکرٹری کے تاثرات (جنرل (ر) عبدالقیوم)..... 258

45- منظوم نذرانۂ عقیدت..... 263

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو کا بچپن اور تعلیم

بے نظیر بھٹو 21 جون 1953ء بروز اتوار پیدا ہوئیں۔ وہ صحت مند اور خوبصورت بچی تھیں۔ اُن کے سنہرے بالوں اور گلابی رنگت کی وجہ سے اُن کی خالہ انہیں ''پنکی'' Pinki کہہ کر پکارتیں جو بعد ازاں اُن کی عرفیت بن گئی۔ اپنی معصومیت اور دل کشی کی وجہ سے وہ گھر بھر کی آنکھ کا تارا بن گئیں۔ کئی عزیزوں نے بہت سے نام تجویز کیے۔ آخر کار اُن کے دادا اور دادی کا انتخاب حتمی ثابت ہوا اور نومولود کا نام ''بے نظیر'' رکھا گیا جس کے لغوی معنی ''بے مثال'' کے ہیں۔

''بے نظیر'' کی ولادت کے موقع پر اُن کے والد لندن میں تھے جہاں شہزادی الزبتھ، شاہی خاندان کے افراد اور دنیا بھر کے ممالک سے سربراہان مملکت، ''ویسٹ منسٹر ایبے'' میں اُن کی تاج پوشی کی شاندار تقریب میں اکٹھے ہوئے تھے۔ لندن میں جشن کا سماں تھا۔ بے نظیر کے والد نے شاید ہی سوچا ہو کہ کراچی میں پیدا ہونے والی اُن کی بیٹی ساڑھے تین عشروں بعد کبھی پاکستان کی مقبول راہنما اور اپنے ملک کی وزیر اعظم بنے گی اور بکنگھم پیلس میں ملکہ برطانیہ کے ساتھ جلوہ افروز ہوگی۔

بے نظیر بھٹو کی پیدائش کے چند ماہ بعد اُن کے والد پاکستان واپس آئے۔ جب پہلی مرتبہ انہوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا تو وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو بتاتی ہیں کہ ''اس لمحے وہ اپنی پیاری بیٹی کا چہرہ اور ہاتھ مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔ یہ پہلی نظر کا عشق تھا۔'' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلکہ تین دیگر بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اُن کی پہلی اولاد کے ساتھ محبت میں شدت آتی گئی۔ لہٰذا جب بھی کوئی اہم واقعہ ہوا، خواہ وہ شملہ معاہدہ ہو یا اقوام متحدہ کا اجلاس، اُن کے والد نے ہمیشہ یہی چاہا کہ بے نظیر اُن کے ہمراہ رہیں۔

تین برس کی بے نظیر نے کراچی میں ''سر بارٹل فریئر'' کی یاد میں تعمیر کردہ تاریخی فریئر ہال کے سامنے واقع ''مس جینگز'' کے نرسنگ سکول میں جانا شروع کیا۔ اُن کے سکول سے چند گز کے فاصلے پر فلیگ سٹاف ہاؤس کی نمایاں عمارت واقع تھی جو قائداعظم کی ملکیت رہی اور اب وہاں اُن کے نام پر ایک میوزیم قائم ہے۔ اس وقت تک بھٹو خاندان، بحیرہ عرب کے ساحل سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع اپنے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نئے گھر 70 کلفٹن میں منتقل ہو چکا تھا اور بے نظیر بھٹو کی والدہ ستمبر 1954ء میں بے نظیر بھٹو کے ہمراہ کھیلنے کے لیے ایک بھائی، مرتضیٰ بھٹو کو جنم دے چکی تھیں۔ اُن کی پیدائش کے بعد آئندہ پانچ برسوں میں، ایک بہن صنم اور ایک بھائی شاہنواز پیدا ہوئے۔

ننھی بے نظیر نے اپنے والدین کو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے پایا۔ انہیں خوبصورتی، ذہانت اور خوش اخلاقی کے حوالے سے ایک مثالی جوڑا قرار دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اُن کا موازنہ امریکہ کے کینیڈی خاندان سے کیا جاتا تھا۔ اس کے والد انتہائی پُرکشش، سحر انگیز اور ذہین انسان تھے اور اُن کی بیوی نصرت بھی انہی کی طرح پُرکشش اور باوقار خاتون تھیں۔

''تمہاری ماں دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہے۔'' بھٹو اکثر اپنے بچوں کو بتایا کرتے۔ ''لیکن پاپا.....لوگ کہتے ہیں کہ 'ایوا گارڈنر' خوبصورت ترین عورت ہے۔'' بے نظیر اپنے والد کو یاد کراتیں۔ ''وہ ایسا اس لیے کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے تمہاری ماں کو نہیں دیکھا۔'' اس کے والد بڑے وثوق سے جواب دیتے۔ شہر کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں یہ جوڑا ہر دلعزیز تھا۔

بے نظیر کے دادا، دادی بھی 70 کلفٹن میں رہتے تھے۔ شاہنواز بھٹو بوڑھے ہو چکے تھے اور ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ بے نظیر کے لیے اُن کے دادا ابا تھے اور والد پاپا وہ اپنے دادا ابا کو چاندی جیسے بالوں اور سیاہ چشمے کے ساتھ ایک انتہائی شفیق انسان کے طور پر یاد کرتی ہیں۔ اکثر اوقات شام کو دادا، دادی اپنے گھر کے باغ میں بیٹھا کرتے اور ننھی بے نظیر اُن کے ہمراہ ہوتیں اور اُن کے ساتھ خوش گپیاں کرتیں۔ اُس کی والدہ نصرت بھی اُن سے آملتیں اور دوپہر کی چائے اُن کے ساتھ نوش کرتیں۔ وہ سب ننھی بے نظیر کے ساتھ کھیلا کرتے۔ وہ اُن کے اکلوتے بیٹے کی پہلی اولاد تھی۔ لہٰذا انہوں نے ان پر اپنا تمام پیار نچھاور کیا۔ ''مجھے نہیں یاد کہ میرے دادا، دادی نے کبھی بھی مجھے جھڑکا ہو۔'' بے نظیر بتاتی ہیں کہ اُن کا گھر زندگی سے بھرپور تھا۔ اُن کے والد کی ہمشیرہ، اُن کی پھوپھی ممتاز، جن کی کرنل مصطفیٰ سے شادی ہوئی تھی: اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ آیا کرتی تھیں۔ امن و محبت کے ماحول میں بچے گھنٹوں کھیلا کرتے۔ اُن کے نانا اُن کو اکثر کلفٹن میں واقع مارکیٹ میں لے جایا کرتے اور نزدیک ہی واقع اپنے وسیع و عریض گھر کی جانب جاتے ہوئے راستے سے چیزیں خرید دیتے۔ اُن کے نانا کے گھر میں بہت سے پھل دار درخت تھے۔ وہ درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں سے پھل توڑنے کے لیے اکثر بالائی منزل پر چلی جاتیں۔ بچپن میں بے نظیر کو کیلے کھانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اُن کی والدہ نے انہیں کیلوں کا پورا کریٹ خرید کر دیا اور کہا کہ وہ جتنے کیلے کھا سکتی ہیں کھا لیں، اس اُمید پر کہ اُن کی کیلوں کے لیے اشتہاء ختم ہو جائے گی لیکن اُن کی والدہ کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ جب دوسرے ہی روز وہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

دوبارہ اپنی ماں کے پاس آئیں اور مزید کیلوں کی فرمائش کر دی اور کہا ''ممی! کیلے۔''

بے نظیر کی زندگی اور اُن کے والد کی سیاست کا ایک ہی وقت میں آغاز ہوا۔ 1957ء میں جب وہ چار سال کی تھیں اور ابھی پریپ میں 'نرسری رہائیم' پڑھا کرتی تھیں، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں نمائندگی کے لیے اُن کے والد کی نامزدگی ہوئی۔ یہ کسی بھی تیس سال سے کم عمر انسان کی انفرادی کامیابی تھی کہ جسے بین الاقوامی سطح پر اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے کہا گیا ہو۔

ابھی وہ ملک سے باہر ہی تھے کہ سر شاہنواز بھٹو کراچی میں وفات پا گئے۔ بے نظیر بتاتی ہیں: ''مجھے سرگوشیوں میں آوازیں اور لوگوں کا دھیمے لہجے میں باتیں کرنا اور آہ و بکا یاد ہے۔ لوگ آ جا رہے تھے مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ کوئی بڑا واقعہ ہوا ہے لیکن اس کی نوعیت کا علم نہ تھا۔'' بیالیس سال بعد بھی یہ لمحات بے نظیر کے ذہن میں ہنوز نقش تھے۔ اُن کے والد نیویارک سے فوراً گھر واپس پہنچے۔ دسویں کے بعد انہیں روایت کے مطابق خاندان کا آئندہ سربراہ بنا دیا گیا۔ اس سے ایک برس بعد بے نظیر کی دادی بھی وفات پا گئیں۔ 1958ء میں نرسری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بے نظیر کو شہر کے اعلیٰ ترین سکول، کانونٹ آف جیسس اینڈ میری میں داخل کروایا گیا۔ اسی برس اُن کے والد کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزارت کی پیش کش ہوئی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔

انہیں وزارت تجارت کا قلم دان سونپا گیا اور اس طرح وہ ملک کے کم عمر ترین وزیر بنے اور اُن کے کندھوں پر بھاری ذمہ داریاں آن پڑیں۔ سرکاری ذمہ داریوں سے عہدہ براء ہونے کے لیے انہیں لمبے عرصہ کے لیے گھر سے دور رہنا پڑتا۔ ''مجھے یاد ہے پاپا جب بھی غیر ملکی دورے سے واپس آتے تو اُن کے سوٹ کیس کپڑوں، ٹافیوں، چاکلیٹوں اور دیگر اشیاء سے بھرے ہوتے۔ ہم اُن کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے۔''

بے نظیر بڑی زندہ دل بچی تھیں۔ وہ استفہامی ذہن کی مالک تھیں اور ہمیشہ اپنے اردگرد کی دنیا کو جاننے کے لیے سوچ کے نت نئے زاویے مرتب کرتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات ایسے تجربات بڑے خطرناک ثابت ہوتے۔ ایک مرتبہ اُن کا گھرانہ چھٹیاں گزارنے لندن گیا اور وہاں پر ایک اپارٹمنٹ کرایہ پر حاصل کیا۔ وہاں رہائش کے دوران ایک روز انہوں نے گیس کا والو کھلا چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے اُن کی والدہ بروقت پہنچ گئیں۔ ''ہم تقریباً مر چکے ہوتے لیکن خوش قسمتی سے ممی بروقت پہنچ گئیں اور کہا تم بہت شرارتی بچی ہو،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔

ایک اور موقعہ پر جب بھٹو خاندان یورپ میں تھا تو بے نظیر نے شیشے کا گلاس توڑ دیا اور کرچیوں پر چلنا شروع کر دیا۔ ہر طرف اُن کا خون پھیل گیا پھر وہ بالکنی میں جا کر اپنے والدین کا انتظار کرنے لگیں کہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

وہ آئیں اور آ کر انہیں بچائیں۔

وہ بہت سمجھ دار بھی تھیں۔ اُن پرانے وقتوں میں برطانوی روایت کے مطابق وکلاء وگ پہنا کرتے تھے۔ اُن کے والد کی وگ ہمہ وقت اُن کے ڈرائینگ روم میں پڑی رہتی تھی۔ وہ اکثر وہاں جا کر وگ پہن لیتیں اور ہر کسی کو بتایا کرتیں کہ وہ وکیل بنیں گی۔ ''دروازے پر ایک تختی بھی لگی ہوتی جس پر بے نظیر بھٹو بار ایٹ لاء تحریر ہوتا'' وہ بتاتی ہیں۔ کیونکہ اُن کے گھر کے دروازے پر ہمیشہ پیتل کی تختی جڑی رہتی جس پر ''ذوالفقار علی بھٹو بار ایٹ لاء'' درج تھا۔ وہ اپنے والد جیسا قانونی مقام تو حاصل نہ کر پائیں تاہم انہوں نے اپنے والد کی سیاسی گدی ورثے میں پائی۔ اوائل عمری سے ہی انہوں نے ایک عالم دین سے دینی تعلیم کا حصول شروع کر دیا تھا جو روزانہ مدرسے کے اوقات کے بعد دوپہر میں انہیں قرآن حکیم پڑھانے آیا کرتے۔ انہوں نے بے نظیر کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کروایا۔ اُن کی والدہ نے انہیں اسلام کی لازمی عبادت، نماز سکھلائی۔ بے نظیر کی والدہ مذہب کو خصوصی اہمیت دیتی تھیں۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر اپنی بیٹی کی خواب گاہ میں جاتیں اور اسے علی الصبح نماز فجر کے لیے جگاتیں۔ دونوں ماں بیٹی اکٹھے وضو کرتیں اور نماز ادا کرتیں۔ جب وہ سات سال کی تھی تو بے نظیر کا خاندان راولپنڈی منتقل ہو گیا جہاں اُن کے والد کو وفاقی وزیر کی حیثیت میں سرکاری رہائش گاہ فراہم کی گئی تھی جو ابتداء میں پشاور روڈ اور بعد ازاں سول لائنز، جو اُن دنوں دارالحکومت کا جدید علاقہ تھا، میں رہیں۔ انہیں شہر کے اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے ''پریزنٹیشن کانونٹ'' میں داخل کروایا گیا۔ کم سنی میں ہی کراچی سے ہٹا کر انہیں راولپنڈی کے تعلیمی ادارے میں لانے پر اُن کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بظاہر اُن کی پوری زندگی کے روز و شب بدل گئے، پرانے دوست چھوٹ گئے۔ کراچی میں اُن کے گھر گہما گہمی رہتی تھی لیکن راولپنڈی میں تنہائی اور اُداسی تھی۔ اُن سے پیار کرنے والے دادا، دادی بھی اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ کئی وزارتوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُن کے والد کی ہر گزرتے دن کے ساتھ مصروفیات بڑھتی گئیں۔ انہیں پاکستان میں اور بیرون ملک بے تحاشا سفر کرنا پڑتا۔ بچوں کو آیا کی نگرانی میں چھوڑ کر اُن کی والدہ کو بھی اُن دوروں پر جانا پڑتا۔

بے نظیر چونکہ سب سے بڑی تھیں لہٰذا اپنے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کو اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔ اُن کے والدین بھی انہیں دیگر بہن بھائیوں کی نگرانی کا فریضہ سونپ دیتے۔ بے نظیر بتاتی ہیں کہ ''میری والدہ روزانہ مجھے اخراجات کے لیے پیسے دیتی تھیں جو میں اپنے تکیے کے نیچے چھپا دیتی۔ حالانکہ ابھی میں سکول میں حساب سیکھ رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں ہر شام باورچی خانہ میں جا کر یا کسی اور جگہ بیٹھ کر اپنے وفادار، دیرینہ گھریلو ملازم بابو، کے ساتھ روزانہ اخراجات کی پڑتال کرتی۔ مجھے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نہیں یاد کہ کبھی ان حسابات کا میزانیہ صحیح ہوا ہو۔ خوش قسمتی سے زیر پڑتال اخراجات پر اُٹھنے والی رقوم کی مالیت کم ہوتی تھی۔ اس وقت تقریباً دس روپے میں پورے گھر کی ترکاری آ جاتی تھی۔'' ان تمام مصروفیات کا اُن پر ایک نفسیاتی اثر طاری ہوا اور اُن کے مزاج میں شرمیلا پن نمایاں ہو گیا۔ اُن کی چھوٹی بہن صنم بھٹو نے، کئی برس بعد جب وہ لندن میں واقع اپنے اپارٹمنٹ میں تھیں، بتایا کہ وہ شرمیلی نہیں تھیں بلکہ دکھاوے کو پسند نہیں کرتی تھیں۔

تاہم والد کی موجودگی میں زندگی اُن کے لیے بھرپور ہوتی۔ وہ بے نظیر سے بہت سی وجوہات کی بنا پر زیادہ محبت کرتے تھے۔ مثلاً وہ اپنی تعلیم میں بہترین تھیں، وہ اُن کی عزیز ترین ہمشیرہ کی ہم نام تھیں اور وہ بچوں میں سب سے پیاری تھیں۔ وہ بڑے شائستہ انداز و اطوار کی حامل لڑکی تھیں جس کے رسم الخط، اطوار اور کام کی تعریف کی جاتی تھی۔ اپنے والد کی طرح اُسے بھی مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنے ہمراہ اکثر راولپنڈی کے مشہور 'فیروز سنز' کتب خانے لے جایا کرتے۔ تاریخی کتب، خصوصاً عظیم شخصیات اُن کی سب سے پہلی ترجیح ہوا کرتیں حالانکہ اُس وقت انہوں نے یہ سوچا بھی نہ ہو گا کہ ایک دن اُن کی اپنی خود نوشت دنیا بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہو گی، بعد کے دنوں میں انہوں نے ''اگا تھا کرسٹی'' کی جرم و سزا کی کہانیاں بھی پڑھیں جو وہ پھر صنم کو سناتیں۔ رات کو بستر میں اپنی چھوٹی بہن کو کہتیں ''صنی مجھے تمام کہانی سناؤ۔''

ہر اتوار کو یہ خاندان پکنک پر جاتا۔ شہر کے اردگرد واقع بہت سے آثار قدیمہ انہوں نے دیکھے۔ موہنجوڈارو کے زمانے کے قدیم شہر ٹیکسلا کے آثار اُن کی سب سے زیادہ پسندیدہ جگہ تھی۔ اُن کی پھوپھی، ممتاز کا خاندان بھی راولپنڈی منتقل ہو چکا تھا جہاں اُن کے شوہر کی بطور آرمی کمانڈر تعیناتی ہوئی تھی۔

بعض اوقات وہ بھی اُن کے ہمراہ قریبی واقع 'دریائے سُون' میں کشتی رانی کے لیے جایا کرتے۔ دریا کنارے بیٹھ کر اُن کی والدہ انہیں کھانا پکانے کی ترکیبیں بتاتیں۔ پھر وہ وہاں کھلی فضا میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتیں، کھیلتیں، سیکھتیں اور گھومتی پھرتیں۔ ڈاک ٹکٹیں جمع کرنا بھی ایک ایسا مشغلہ تھا جس میں انہوں نے اوائل عمری میں دلچسپی لینا شروع کی۔ صنم بھٹو بتاتی ہیں ''انہیں کیک بنانے کا بہت شوق تھا خاص طور پر جب والدین پاس نہیں ہوتے تھے۔''

لیکن اس وقت تک قدرت نے یہ طے کر دیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کے خوشگوار بچپن کو ایک کڑے امتحان سے گزرنا تھا۔ اُن کے والدین کی شادی شدید دباؤ میں آ گئی۔ اُن کی والدہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ علیٰحدگی کے لیے کوشش کریں۔ وہ گھر چھوڑ کر، ایران اپنے عزیزوں کے ساتھ رہنے کے لیے چلی گئیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بچے باپ کے پاس رہے۔ بےنظیر اور اُن کے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے یہ انتہائی کرب کے لمحات تھے۔ سب سے بڑی ہونے کے ناطے، اس علیٰحدگی کے غم کو بےنظیر نے شدت سے محسوس کیا اور اپنے سب سے چھوٹے بھائی شاہنواز کی خاطر انہوں نے متبادل ماں کا کردار نبھایا۔ اُن کی پھوپھی ممتاز بھی، بچوں کی دیکھ بھال کے لیے باقاعدگی سے آیا کرتیں۔ اُن کے والد نے بھی اپنی بیوی کی غیر موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ وہ کبھی بھی علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ ایران گئے اور پھر وہاں سے کیلیفورنیا، جہاں اس وقت تک نصرت بھٹو جا چکی تھیں، تاکہ اُن کو اپنی وفاؤں کا یقین دلا سکیں۔ آخرکار اپنی شرائط منوانے کے بعد وہ واپسی پر رضامند ہوگئیں تاہم اس دوران بےرحم وقت نے اپنا خراج وصول کرلیا۔ اس بےیقینی کے عرصے نے نوعمر بےنظیر کے حساس ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے، جس میں استحکام کے لیے شدید تمنا پیدا ہو چکی تھی۔

''اگرچہ امی ہمارے ساتھ تھیں لیکن مجھے ہمیشہ یہی خدشہ رہتا کہ کہیں وہ ہمیں دوبارہ نہ چھوڑ جائیں،'' بےنظیر بتاتی ہیں۔

راولپنڈی کے پریزینٹیشن کانونٹ میں دو برس زیرِتعلیم رہنے کے بعد، بےنظیر اور صنم کو مری کے بورڈنگ سکول میں بھیج دیا گیا جو راولپنڈی کے شمال میں دیودار کے درختوں سے بھرے پہاڑی مقام پر واقع تھا۔ لڑکوں کو لاہور کے مشہور ایچی سن کالج میں داخل کروایا گیا۔ اُن کے والد کا خیال تھا کہ خاندان سے دور اور گھریلو آسائشوں کی عدم موجودگی میں زندگی گزارنے کا تجربہ انہیں زندگی کے حوادث کا سامنا کرنے کے لیے سخت جان بنا دے گا۔ ''مجھے پہلی مرتبہ اپنا بستر خود درست کرنا پڑا۔ اپنے جوتے خود پالش کرنا پڑے اور نہانے اور دانت صاف کرنے کے لیے راہ داریوں میں لگے ہوئے واش بیسن سے خود پانی لانا پڑا۔''

اُن کے والدین ہر ہفتے اُن سے ملنے راولپنڈی سے مری آتے۔ ''مجھے یاد ہے کہ ہمیں کانونٹ کے غسل خانے قطعی پسند نہیں تھے اور پہلے ہی ہفتے ہم نے اپنے والدین سے اس بابت شکوہ کر دیا۔'' بےنظیر بتاتی ہیں۔ اُن کے والد نے سکول کی انتظامیہ کو پیش کش کی کہ وہ غسل خانوں کا ایک نیا بلاک بنوا دیتے ہیں۔ سکول انتظامیہ نے ایک طالب علم کی طرف سے اپنے والدین سے شکایت پر ناگواری کا اظہار کیا۔ بےنظیر کو پرنسپل کے دفتر میں بلوایا گیا جہاں اُن سے استفسار کیا گیا کہ انہوں نے اپنے والد کو بیت الخلاء کے بارے میں کیا شکایت کی۔ بدقسمتی سے بےنظیر نے بیت الخلاء کا لفظ پہلے کبھی نہیں سنا تھا لہٰذا انہوں نے معصومیت سے جواب دیا ''کچھ نہیں۔'' بظاہر مشتعل پرنسپل جتنا زیادہ اصرار کرتے کہ وہ صحیح جواب دیں، ''میں اتنا ہی اصرار کرتی کہ میں نے اپنے والد کو بیت الخلاء کے بارے میں کچھ نہیں کہا کیونکہ میں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نے یہ لفظ پہلے کبھی نہ سنا تھا۔'' بہرحال انہیں نئے بلاک کی تعمیر تک، اساتذہ کے غسل خانے استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

اُن کے والد نے اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود اُن کی سیاسی تربیت اہم قومی اور بین الاقوامی اُمور پر انہیں تفصیلی خطوط کے ذریعے جاری رکھی۔ غالباً اُن کے سامنے جواہر لال نہرو کی مثال تھی جو اپنی بیٹی، اندرا گاندھی کو بہت سے موضوعات پر بےتحاشا خطوط لکھتے رہے۔ ''کوئی بھی راہبہ، صنم اور مجھے سکول کے باغ میں کسی بنچ پر بٹھا دیتی اور تفصیل سے خط پڑھ کر ہمیں سنایا کرتی حالانکہ ہمیں اس کے مندرجات کی کم ہی سمجھ آتی،'' بےنظیر بتاتی ہیں۔

اسی دوران جنوری 1963ء میں اُن کے والد کو ملک کا وزیرِخارجہ مقرر کیا گیا۔ اُن کے اعلیٰ امریکی قیادت کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے۔ اکتوبر 1963ء میں واشنگٹن کے ایک سرکاری دورے کے دوران انہوں نے صدر کینیڈی سے ملاقات کی۔ دونوں نوجوان راہنماؤں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ ملاقات کے اختتام پر صدر کینیڈی نے بھٹو کے ساتھ مصافحہ کیا اور کہا ''اگر آپ امریکی شہری ہوتے تو میری کابینہ میں ہوتے۔'' بھٹو نے فی البدیہہ جواب دیا ''جناب صدر محتاط رہیں، اگر میں امریکی ہوتا تو آپ کی جگہ ہوتا۔'' اس پر دونوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

ایک ماہ بعد، جب بےنظیر اپنے والد کے ہمراہ وزیرِخارجہ کے لیے مخصوص ریلوے ویگن میں سفر کر رہی تھیں تو انہوں نے صدر کینیڈی پر قاتلانہ حملے کی خبر سنی۔ اس وقت دس سالہ بےنظیر سو رہی تھیں کہ جب اُن کے والد نے اُنہیں جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا ''یہ سونے کا وقت نہیں ایک المناک حادثہ ہو گیا ہے۔ امریکہ کے جوان العمر صدر کو گولی مار دی گئی ہے،'' بےنظیر بتاتی ہیں۔ ''حالانکہ اس وقت میں محض دس سال کی تھی اور امریکی صدر کے بارے میں بہت کم جانتی تھی، اس کے باوجود میرے والد، جو صدر جان الف کینیڈی کی تشویش ناک حالت پر تازہ ترین اطلاعات لے رہے تھے، نے مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ صدر جان الف کینیڈی ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنہیں وہ کئی مرتبہ مل چکے تھے اور جن کے ترقی پسند نظریات کی وہ قدر کرتے تھے۔''

اُن دنوں برصغیر کے اُفق پر جنگ کے گہرے بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ اور اُن کی بہن، مری میں حصولِ علم میں مشغول تھیں کہ جب ستمبر 1965ء میں بھارت اور پاکستان کے مابین کشمیر کے دیرینہ مسئلے پر ایک بھرپور جنگ لڑی گئی۔ یہ وہ مسئلہ تھا جو 23 برس بعد محترمہ بےنظیر بھٹو کو وزیرِاعظم کی حیثیت سے وراثت میں ملا۔ ''جب میرے والد کشمیری عوام کے حق خودارادیت اور بھارتی جارحیت پر مکالمہ کرنے اقوامِ متحدہ گئے تو اس دوران کانونٹ آف جیسس اینڈ میری کی رہباؤں نے اپنے طلباء کو ممکنہ بھارتی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

حملے کے لیے پیشگی تیار کرنا شروع کر دیا۔ مری سے براہ راست کشمیر تک، سڑک کا راستہ موجود تھا اور بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ بھارتی افواج اس راستے آسانی سے پاکستان میں داخل ہو سکتی تھیں۔''

اس جنگ کے بارے میں بے نظیر بھٹو کی یادداشت ہمیشہ تازہ رہی۔ ''وہ جگہ جہاں ہم کبھی رات کے کھانے کے بعد بکرے کی ہڈیوں کے ساتھ جیکس کا کھیل کھیلتے تھے یا پھر Enid Blyton کی کتابیں پڑھتے تھے، وہاں اچانک ہم نے ہوائی حملے اور بلیک آؤٹ کی مشقیں شروع کر دیں۔ راہباؤں نے بڑی لڑکیوں کو اپنی چھوٹی بہنوں کو پناہ گاہوں میں لے جانے کی ذمہ داری سونپی اور میں رات کو ''صنی'' کے جوتے اس کے پاؤں سے باندھ دیا کرتی تاکہ موقع پر انہیں تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ ہماری بہت سی کلاس فیلوز لڑکیاں، اہم سرکاری حکام یا فوجی افسران کی بیٹیاں تھیں اور ہم نے بڑے جوش و خروش سے ایک دوسرے کے جھوٹے نام رکھے اور انہیں ازبر کیا تاکہ اگر کبھی ہم دشمنوں کے ہتھے چڑھ جائیں تو انہیں ہمارے اصل نام معلوم نہ ہو سکیں۔ اُمڈتے ہوئے شباب میں یہ سب کچھ ڈرامائی لگتا تھا، یعنی اس بات کا امکان کہ اغواء کر لیا جائے اور پہاڑیوں میں لے جایا جائے۔ لیکن جنگ کے سترہ روز کے دوران حملے کا خطرہ حقیقی اور ڈرا دینے والا تھا۔''

یہ لڑائی بالآخر اختتام کو پہنچی۔ ''بخیریت گھر واپس پہنچنے پر گفتگو کے موضوعات پر سیاست غالب آ گئی'' وہ بتاتی ہیں۔ ''سرد جنگ اور اسلحے پر پابندی جیسی اصطلاحات ہم بچوں کی کم مائیہ لغت کا حصہ بن چکی تھیں۔ ہمارے لیے گول میز کانفرنسوں اور کثیر الملکی اجلاسوں کے نتائج کے بارے میں جاننا ایسا ہی تھا کہ جیسے دوسرے بچوں کے لیے ورلڈ کرکٹ ٹورنامنٹس کے سکور جاننا۔'' اس بات سے بے خبر کہ مستقبل اُن کے لیے کیا لا رہا ہے، محترمہ بے نظیر بھٹو نے مری میں اپنے قیام کے دوران بھرپور لطف حاصل کیا۔ وہاں انہوں نے بہت سی سہیلیاں بنائیں۔ اُن میں سے ایک نزدیک ترین 'شیلا والیا' تھی جو بعد ازاں جوان العمری میں ہی وفات پا گئی۔ بے نظیر نے کھیلوں، تعلیم اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ اپنے والدین اور اساتذہ کی آنکھ کا تارہ تھیں اور وہ سب انہیں پسند کرتے تھے۔ ''وہ کبھی بھی اپنے والدین یا اساتذہ کے لیے مسئلہ نہیں بنیں،'' صنم اس بات کی تصدیق کرتی ہیں۔

اس طرح صنم مسابقت کا شکار ہو گئیں۔ ''تمہاری بہن اتنی اچھی ہے تم کیوں نہیں اس کی طرح بنتی، ہر کوئی سکول میں مجھے یہ کہتا،'' صنم بھٹو عشروں بعد بتاتی ہیں۔ وہ بہت عرصے تک اس صورت حال کا سامنا نہ کر سکیں اور پہاڑی مقام پر واقع سکول میں دو سال گزارنے کے بعد صنم وہاں کی یکسانیت سے اس قدر اُکتا چکی تھیں کہ صدر ایوب خاں کی پوتی کے ساتھ عملاً مری سے بھاگ گئیں۔ ''اس سے ایک بڑا اسکینڈل بن گیا،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔ اُن کے والد نے انہیں راولپنڈی واپس بلانے کا فیصلہ کیا جہاں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

انہیں شہر کے پریزینٹیشن کانونٹ میں دوبارہ داخل کروایا گیا۔

1966ء میں ان کے والد نے بچوں کو ماں کے ہمراہ یورپ کے تاریخی مقامات کی سیر کو بھیج دیا۔ بے نظیر اور اُس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے یہ انتہائی دل چسپی سے بھرپور موقع تھا۔ انہیں تین ماہ تک یورپ میں رہ کر اس براعظم کی حقیقی خوبصورتی اور خزائن کا مشاہدہ کرنا تھا۔ وہ سب سے پہلے ترکی گئے جہاں وہ انٹر کانٹینٹل ہوٹل میں ٹھہرے جہاں انہوں نے دارالحکومت انقرہ کی عظیم الشان عمارات دیکھیں۔ اس قدیم شہر کو پرانے وقتوں میں 'انگورہ' کہا جاتا تھا۔ یہ رومن صوبے 'گالیشیا' کا صدر مقام تھا' جب عثمانی ترکوں نے 1360ء میں اِس پر قبضہ کیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مشرق اور مغرب کی دو جان دار تہذیبیں آپس میں ملتی ہیں۔ بے نظیر نے ترکی سلطنت کے عہد رفتہ کے آثار کا حسن اور عظمت دریافت کی۔

پھر یہ لوگ فرانس میں پیرس چلے گئے جہاں وہ ہوٹل جارج پنجم میں ٹھہرے۔ دریائے سین کے کنارے پہلی صدی قبل مسیح میں قائم ہونے والے فرانس کے اس تجارتی اور تہذیبی مرکز کو دریافت کرنا ننھی بے نظیر کے لیے مسحور کن تجربہ تھا۔ انہوں نے مشہور زمانہ ''نوتخ دآم'' Notre Dame، ''لووغ'' Louvre، ''توغ ایفل'' Tour Eiffel، اور کئی دوسرے تاریخی مقامات، عجائب گھر، تھیٹر اور تعلیمی اداروں کی سیر کی۔

اس بیش بہا تجربے کے بعد یہ لوگ لندن چلے گئے جہاں وہ پہلے بھی رہ چکے تھے۔ وہاں پر یہ لوگ ماؤنٹ رویال ہوٹل ٹھہرے۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ اُن کی جڑیں لندن میں تھیں۔ اُن کے والد وہاں زیر تعلیم رہے تھے۔ اُن کے دادا اس شہر میں کئی مرتبہ آئے۔ اُن کے لیے نہ صرف یہ ایک خاص شہر تھا بلکہ اُن کا دوسرا گھر تھا۔ اس مرتبہ انہیں اور اُن کے دیگر بہن بھائیوں کو لندن کی تاریخی عمارات دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے دریائے ٹیمز کے شمالی کنارے پر آباد، اس عظیم دارالحکومت کی سیر کی۔

گھر واپسی پر انہوں نے حالات بدلے ہوئے پائے۔ اب وہ ملک کے وزیر خارجہ کے مراعات یافتہ بچے نہیں رہے تھے تاہم انہیں ملک کے مقبول ترین رہنما، ذوالفقار علی بھٹو کی اولاد ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ تیرہ سالہ بے نظیر نے دو عجیب و غریب واقعات کو بیک وقت رُونما ہوتے دیکھا۔ ایک طرف اُن کے والد کے حکومت کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے انہیں حکمرانوں کے ظلم و استبداد، دھمکیاں، قاتلانہ حملوں اور جھوٹے مقدمات میں زیر عتاب لایا گیا لیکن وہ اپنے ارادوں پر قائم رہے۔ دوسری جانب اُنہوں نے دیکھا کہ عوام میں اُن کے والد کے لیے محبت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے کیونکہ انہوں نے فوجی آمر کے خلاف آواز بلند کی تھی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

20 جون 1966ء کو کابینہ میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کے بعد جب اُن کے والد نے لاہور کے لیے سفر کا آغاز کیا تو اُن کے اس دورے کی اطلاع اُن کی آمد سے پہلے ہی لاہور پہنچ چکی تھی۔ جب گاڑی لاہور ریلوے اسٹیشن پر رُکی تو پلیٹ فارم عوام سے کھچا کھچ بھرے تھے۔ انہیں ہار پہنائے گئے اور اُن کے ہاتھ چومے گئے اور اُن کے ہزار ہا شائقین نے انہیں اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا جو شہر میں محض اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ رومال جس سے انہوں نے آنسوؤں سے لبریز اپنی آنکھیں صاف کی تھیں، وہ بعد میں ہزاروں روپوں میں فروخت ہوا۔ ''بے نظیر بتاتی ہیں کہ 1966ء میں جب میرے والد ایوب خان سے علیٰحدہ ہوئے تو اُن 'دنوں شہری آزادی' اور 'جمہوریت' کی اصطلاحیں زبان زدِ عام تھیں۔ پاکستان کے عوام کے لیے ان اصطلاحات میں بہت کشش تھی، جنہیں ایوب کے دورِ اقتدار میں محض محدود سیاسی سرگرمیوں کا تجربہ رہا۔''

بھٹو خاندان واپس کراچی منتقل ہو گیا جہاں بے نظیر کو دوبارہ اُن کے سکول کانونٹ آف جیسس اینڈ میری میں داخل کروایا گیا جو اُن کے گھر سے سڑک پار واقع تھا۔ وہ اپنے اولیول امتحانات کے لیے تعلیم میں منہمک ہو گئیں۔ ''میں بہت زیادہ مطالعہ کیا کرتی،'' وہ بتاتی ہیں۔ ''ایک وقت تھا کہ جب مجھے شیکسپیئر کا ہر کھیل، ہیملٹ، رومیو اینڈ جولیٹ اور جولیس سیزر، ازبر تھا۔'' اُن کی زندگی بہت منظم تھی۔ فارغ اوقات میں وہ سندھ کلب جایا کرتیں جہاں وہ پیرا کی کرتیں، سکوائش کھیلتیں اور سماجی محافل میں شریک ہوتیں۔ ''میری دوستی محدود تھی، زیادہ دوست نہیں تھے لیکن جو چند دوست تھے، وہ اچھے تھے۔''

اس عرصے میں ملک سیاسی بحران سے دوچار رہا۔ مشرقی پاکستان میں کھلی بغاوت پھوٹ پڑی۔ مغربی پاکستان، فوجی استبداد کی غیر مقبول پالیسیوں کے زیرِ اثر تھا۔ صدر ایوب خاں کی اقتدار پر گرفت کمزور ہوتی چلی گئی جب کہ بھٹو کی عوامی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ پاکستانیوں کے لیے اُمید کی واحد کرن بن کر اُبھرے۔ 1967ء کے موسمِ سرما میں اُن کے والد نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ایک ایسی پارٹی جس کی قیادت، بے نظیر بھٹو کو کئی برسوں بعد خود کرنا تھی۔ پارٹی کی بنیاد لاہور میں رکھی گئی۔ وہاں جمع ہونے والے مندوبین سے اُن کے والد نے خطاب کیا اور نئی پارٹی کا ماٹو پیش کیا۔ یہ ایک مرکزی پارٹی تھی۔ مندوبین نے مجوزہ خاکے کو منظور کر لیا اور پاکستان پیپلز پارٹی وجود میں آئی اور اُن کے والد اس کے چیئرمین منتخب ہوئے۔

14 سالہ بے نظیر، پارٹی کے ابتدائی چند ممبران میں شامل تھیں۔ ''ہمارے گھر واقع 70 کلفٹن کراچی کی پہلی منزل، پاکستان پیپلز پارٹی کا ضلعی دفتر ٹھہری۔ میری گیارہ سالہ بہن اور میں نے جوش و خروش سے پارٹی میں شامل ہونے کے لازمی واجبات یعنی چار آنے ادا کیے تا کہ ہم بھی پارٹی کی خدمت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کر سکیں۔ 'بابو' ہر روز دروازے پر قطار میں رُکنیت سازی کے انتظار میں کھڑے لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا اندراج کرتا،'' وہ بتاتی ہیں۔ پارٹی نے اپنے دفاتر ملک بھر میں جھونپڑیوں، چھوٹی دکانوں اور عام پارٹی ورکروں کے گھروں میں قائم کر دیئے جہاں لوگوں کے نہ ختم ہونے والے ہجوم اکٹھے ہوتے تا کہ وہ رُکنیت سازی کا معمولی چندہ دے کر جلد سے جلد پارٹی کی رُکنیت حاصل کریں۔

1968ء تک پورا ملک ایک غیر معمولی احتجاج کی لپیٹ میں آ گیا اور ایوب خاں کی حکومت کے خلاف بہت بے چینی پائی جاتی تھی۔ کوئی دن خالی نہ گزرتا کہ جب کوئی جلسہ یا جلوس نہ ہوتا۔ اُن کے والد نے بلا خوف و خطر کئی عوامی اجتماعات سے خطاب کیا اور حکمرانوں کی نئی پالیسیوں پر تنقید کی۔ جب یہ سب کچھ ایوب حکومت اور دیگر مفاد پرست قوتوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تو اُن پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس سے نوجوان بے نظیر نے بہت اثر لیا۔ ''تشدد کی دنیا اس وقت تک میرے لیے اجنبی تھی۔ یہ سیاسی دنیا تھی جس میں میرے والد بستے تھے یا پھر بچوں کی دنیا تھی جس میں سکول اور کھیلیں تھیں اور ساحل پر بلا گُلّا۔ لیکن یہ دونوں دنیائیں آپس میں ٹکرا گئیں جب میرے والد پر مسلح حملوں کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ایوب کے حامیوں نے اُن پر ایک دورے کے دوران رحیم یار خاں، سانگھڑ اور دیگر مقامات پر گولی چلائی۔''

نومبر 1968ء میں کہ جب وہ اپنی تعلیمی زندگی کے انتہائی اہم مرحلے کا سامنا کر رہی تھیں، یعنی آئندہ آنے والے مہینوں میں ہونے والے اولیول کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھیں کہ اُن کے والد کو پہلی مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ انہیں فوری طور پر میانوالی جیل میں پہنچا دیا گیا جو کہ پاکستان کی بدترین جیلوں میں سے ایک تھی اور انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ ایک ایسی لڑکی کے لیے یہ بدترین حالات تھے کہ جسے اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دینا تھی۔

لیکن امتحانات چھوڑنے کا مطلب پورے ایک سال کا ضیاع تھا کیونکہ یہ امتحان سال میں ایک مرتبہ انگلینڈ سے لیا جاتا تھا۔ اُن کی والدہ نے بے نظیر کو ہدایت کی کہ وہ کراچی رہیں اور امتحانات کے لیے تیاری کریں جبکہ وہ خود دوسرے بچوں کے ہمراہ لاہور چلی گئیں تا کہ اپنے شوہر کی گرفتاری کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں درخواست دائر کر سکیں۔ بے نظیر 70 کلفٹن میں اکیلی رہ گئیں۔

''اپنے آپ کو اپنے والد کی گرفتاری کی فکر سے علیٰحدہ رکھنے کے لیے میں نے خود کو اپنی تعلیمی مصروفیات میں منہمک کر لیا۔ اپنے نصابی مضامین پر بھرپور دسترس کے لیے معلمین سے راہنمائی لیتی جو روزانہ گھر پر آتے تھے،'' وہ بتاتی ہیں۔ اُن کے والد جو قیدِ تنہائی میں تھے، اُن کی تعلیم کے بارے میں بے حد فکر مند تھے۔ انہوں نے 28 نومبر کو ساہیوال جیل سے بے نظیر کے نام ایک خط لکھا:

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''میں او۔ لیول امتحانات میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ مجھے واقعی فخر ہے کہ میری بیٹی 15 سال کی عمر میں او۔ لیول کر رہی ہے جو میں نے 18 سال کی عمر میں پاس کیا۔ اس حساب سے تم صدر بھی بن سکتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مطالعہ کرتی ہو تاہم تمہیں ادب اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تمام ضروری کتابیں تمہارے پاس ہیں۔ نپولین بونا پارٹ کے بارے میں پڑھو جو جدید تاریخ میں ایک مکمل انسان تھا۔ امریکی انقلاب کا مطالعہ کرو اور ابراہیم لنکن کے بارے میں جانو۔ 'جان ریڈ' کی 'دس دن جنہوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا' پڑھو۔ بسمارک، لینن، اتاترک اور ماؤزے تنگ کے بارے میں پڑھو۔ بھارت کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرو اور سب سے بڑھ کر، تاریخ اسلام کا مطالعہ کرو۔''

انتہائی نامساعد حالات میں انہوں نے کراچی میں واقع ''ویٹی کن سفارت خانے'' میں منعقد کیے جانے والے امتحانات میں حصہ لیا۔ اُن کے والد کی گرفتاری سے ملک بھر میں غیر معمولی احتجاجی فضا بن گئی تھی۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ایوب حکومت کے خلاف بے چینی میں شدت آتی گئی۔ صدر کے لیے عوامی مقامات پر فائرنگ یا بلوے سے بچتے ہوئے تقریر کرنا، محال ہو گیا۔ ہر جگہ لوگ اُن کی حکومت کے خاتمے اور بھٹو کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کوئی اور حل نہ پاتے ہوئے فروری 1969ء میں صدر ایوب کی حکومت نے انہیں جیل سے لاڑکانہ ہاؤس اُن کے گھر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جہاں انہیں کچھ عرصہ نظر بند رکھا گیا۔ آخر کار مارچ 1969ء میں صدر ایوب خاں نے اقتدار چھوڑنے کا فیصلہ کیا تاہم سیاسی قیادت کو اقتدار سونپنے کے بجائے انہوں نے فوج کے سربراہ کو حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اُس وقت کے فوجی سربراہ، جنرل آغا محمد یحییٰ خاں نے ملک میں مارشل لاء لگانے کا اعلان کیا اور اس طرح ملک فوجی آمریت کے دوسرے دور میں داخل ہوا۔

بے نظیر بھٹو نے او۔ لیول کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اب اُن کے پاس دو راستے تھے۔ یا تو وہ کسی امریکی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے رُجوع کرتیں یا پھر کراچی میں ہی اے لیول کرنے کے بعد بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں۔ وہ اور اُن کے والد، دونوں نے پہلی ترجیح پر عمل کیا۔ تاہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ انتہائی نوعمر تھیں یعنی محض پندرہ برس، جو کسی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے مطلوبہ عمر کی حد سے کم تھی۔ انہیں سکول میں دو مرتبہ دوہری ترقی ملی تھی اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی تعلیم اپنے ہم عصروں سے پیشتر ہی مکمل کر لی تھی۔

لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں مواقع ایک ساتھ حاصل کیے جائیں۔ ایک طرف انہوں نے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے ریڈکلف کالج میں داخلے کے لیے درخواست دی تو دوسری جانب انہوں نے کراچی گرائمر سکول میں اے لیول کے لیے داخلہ لیا۔ وہاں وہ بہت سے مشاغل، مباحثوں وغیرہ میں بھی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مصروف رہیں۔ اسی طرح کے ایک مباحثے میں انہوں نے 'اسلام میں عورت کا کردار' کے گرما گرم موضوع پر تقریر کی لیکن کراچی گرائمر سکول میں انہوں نے بہت کم عرصہ گزارا۔

اپریل میں شدید انتظار کے بعد انہیں ریڈکلف کالج سے موسم خزاں میں داخلے کی توثیق کا خط موصول ہوا۔ انہیں اسی سال اپنی والدہ کے ہمراہ اگست میں امریکہ روانہ ہونا تھا۔ روانگی پر اُن کے والد نے تحفے کے طور پر موتیوں جیسے نقش و نگار سے مزین قرآن پاک کا نسخہ دیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو نصیحت کی ''تمہیں امریکہ میں بہت سی حیرانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور تمہیں اچنبھا بھی ہو سکتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ماحول اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں انتہائی محنت سے تعلیم حاصل کرنا ہے۔ پاکستان میں بہت کم لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے جو اس وقت تمہیں حاصل ہو رہا ہے اور تم لازمی طور پر اس کا بھرپور فائدہ اُٹھاؤ۔ یہ مت بھولنا کہ تمہیں وہاں بھیجنے پر جو رقم خرچ آ رہی ہے وہ اس سرزمین اور ایسے لوگوں سے فراہم ہوئی ہے جو زمین کا سینہ چیرتے ہیں اور پسینہ بہاتے ہیں۔ یہ تم پر اُن لوگوں کا قرض ہوگا۔ یہ ایسا قرض ہے جو تم اللہ کی رضا سے اپنی تعلیم کو اُن کی زندگیاں بہتر بنانے کے لیے استعمال میں لا کر واپس چکا سکتی ہو۔'' یہ اگست کے آخری دن تھے کہ جب تمام گھرانہ ہوائی اڈے پر اُن کو الوداع کہنے کے لیے اکٹھا ہوا۔ اُن کی والدہ بھی امریکہ کے لیے اُن کے سفر میں ہمراہ تھیں۔ اپنے پیاروں میں گھری ہوئی بے نظیر، امریکہ پرواز کرنے، طیارے میں داخل ہوئیں اور وہ بھٹو خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جو تعلیم کے لیے ملک سے باہر گئی۔

امریکہ میں موسم خزاں کی ایک صبح تھی کہ جب نوخیز بے نظیر اور ان کی والدہ کا طیارہ نیویارک ایئرپورٹ پر اُترا۔ ان کی آمد سے ایک ماہ پیشتر نیل آرمسٹرانگ چاند پر سب سے پہلے قدم رکھنے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ جس کے ٹھیک ایک ماہ بعد حصول تعلیم کی غرض سے بے نظیر بھٹو نے کسی اجنبی سرزمین پر قدم رکھا اور اس طرح وہ، بھٹو خاندان کی پہلی خاتون قرار پائیں کہ جس نے بیرون ملک تعلیم حاصل کی۔ ایک روایتی معاشرے سے نکل کر آنے والی اس شرمیلی لڑکی کے لیے جدید امریکی معاشرے میں اپنے آپ کو ڈھالنا انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ نیویارک کی آسمان کو چھوتی، بلند و بالا عمارات کا فلائی اوور، کشادہ سڑکیں، جدید ترین شاپنگ مال، خوبصورت عمارات اور جدید طرز زندگی، ہزاروں میل دور، اُن کی اپنی چھوٹی سی دنیا سے صدیوں کا فرق رکھتے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب لیکن خوبصورت اور مسحور کن دنیا میں اُتری تھیں۔

کیمبرج آنے سے پیشتر، جہاں بے نظیر کا داخلہ ہوا تھا، ماں اور بیٹی چند روز کے لیے نیویارک کے چارلس ہوٹل میں ٹھہریں۔ اُن کی کلاس میں زیادہ تر طلباء امریکی تھے اور اُن کے سمیت صرف پانچ غیر ملکی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تھے۔ انہیں ایلیٹ ہال نامی لڑکیوں کے ہاسٹل میں شراکت کی بنیاد پر کمرہ الاٹ ہوا۔ یہ ایک خوبصورت عمارت تھی جس میں سنگل اور ڈبل کمروں کی دو قطاروں کے درمیان سے ایک راہ داری گزرتی تھی اور جو اکیڈمک بلاک سے تیس منٹ پیدل مسافت کی دوری پر تھی۔ بیگم نصرت بھٹو نے خانہ کعبہ کی سمت متعین کرنے میں اُن کی مدد کی کہ جس طرف رُخ کر کے دنیا بھر کے مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ وہاں اُن کی ملاقات ہارورڈ کے شہرت یافتہ پروفیسر جان کینتھ گالبریتھ سے ہوئی جو ان کے والد کے دوست تھے اور ساٹھ کی دہائی میں بھارت میں امریکی حکومت کی جانب سے سفیر رہے۔ اُن کی والدہ کی وطن واپسی سے پیشتر ہی پروفیسر اور اُن کی بیوی کو بے نظیر کے مقامی سرپرستوں کی حیثیت سے نامزد کر دیا گیا۔

زندگی میں پہلی بار بے نظیر کو ایک کثیر الاقوامی معاشرے میں رہنا تھا۔ وسیع میدان، گھاس سے بھرے لان اور گھومنے پھرنے کے لیے تمام شہر اور اُن کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں۔ وہاں آزادی کا مثبت احساس تھا۔ شخصی آزادی، کہ جس سے انسان کو خود اچھے بُرے کی تمیز کا اختیار حاصل تھا۔ اس شریر لڑکی کو ایک اضافی سہولت حاصل تھی، وہ یہ کہ کیمپس میں سوائے چند لوگوں کے، کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون اور کس کی بیٹی ہے۔ اس سولہ سالہ لڑکی کے لیے یہ ایک انتہائی نئی بات تھی کیونکہ اُس کے اپنے ملک میں اُس کے خاندانی نام ''بھٹو'' کو سماجی حلقوں میں فوری شناسائی حاصل تھی اور اس حوالے سے ''بھٹو'' خاندان کے افراد کو رکھ رکھاؤ نبھانا پڑتا تھا۔ تاہم یہاں پر اکثر لوگ تو پاکستان نام کے کسی ملک کے وجود سے بھی ناواقف تھے لہٰذا ''بھٹو'' ہونا، یا نہ ہونا، کوئی امتیاز نہ تھا۔ چنانچہ انہیں پوری طرح ادراک تھا کہ نئے ماحول میں اُن کا موازنہ، اُن کی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

تاہم اُن کا حد سے زیادہ شرمیلا پن اُن کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ گھر میں وہ انتہائی غیر معمولی طور پر امتیازی ماحول میں پروان چڑھی تھیں کہ جہاں خاموش طبعی اور شرمیلا پن میل کھاتا تھا۔ لیکن یہاں انہیں اجنبیوں سے ملنا پڑتا اور لائبریری، لیکچر ہال، ڈائننگ ہال یا کہیں بھی جانے کے لے استفسار کرنا پڑتا۔ ''مجھے ایک اجنبی اور عجیب تالاب کی اتھاہ گہرائی میں پھینک دیا گیا تھا جہاں سے مجھے خود ہی اُوپر اُٹھنا تھا''، وہ بتاتی ہیں۔ انہوں نے کوشش کی اور بالآخر شرمیلے پن کا خول اُتار پھینکا۔ اُن کا دوسرا فوری مسئلہ اُن کا لباس تھا۔ نئی جگہ کے موسم اور روایات کی پیچیدگیوں سے بے خبر، وہ پاکستان سے اپنے ہمراہ شلوار قمیض کے درجنوں جوڑے لائی تھیں۔ انہوں نے انہیں حفاظت سے رکھ دیا اور ہارورڈ کے کوآپریٹو سٹور سے چند جوڑے جینز اور شرٹس خرید لیں۔ انہوں نے اپنے بال لمبے اور سیدھے رکھ لیے۔ اب پاکستان سے آنے والی ''پنکی'' نے خود کو نئی دنیا یعنی مغربی دنیا میں، ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔ امریکہ میں نت نئی سائنسی دریافتوں اور سیاسی تبدیلیوں کا دور تھا۔ ناسا کامیابی سے خلابازوں، نیل آرمسٹرانگ اور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ایڈون ایلڈرین کو چاند پر بھیج چکا تھا۔ انہوں نے 21 جولائی 1969ء کو چاند پر اُتر کر انسان کے دیرینہ خواب کو سچ کر دکھایا۔ وہ اپنے ہمراہ وہاں سے چاند کا ایک ٹکڑا ساتھ لائے جسے ماسا چیوسٹ انسٹیٹیوٹ کے عجائب گھر میں رکھا گیا۔ ''ہم سب لوگ دوسری دنیا سے لائے گئے چاند کے اس ٹکڑے کو دیکھنے کے لیے وہاں گئے،'' وہ اپنی یادداشتوں میں بیان کرتی ہیں۔ خلابازوں نے چاند کی سطح پر ایک امریکی جھنڈا گاڑا اور ایک تختی نصب کی جس پر درج تھا ''ہم نوع انسانی کے لیے امن و آشتی چاہتے ہیں۔''

اس دور میں امریکہ میں 'تحریک نسواں' بھی ملک بھر میں جڑیں پکڑ رہی تھی۔ ہارورڈ میں کتابوں کی دکانیں، خواتین سے متعلق موضوعات پر مبنی کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ بے نظیر اور اُن کے دوست، دونوں اصناف کے مابین تعلق کو ترتیب دینے والے نئے نظریات سے متاثر تھے۔ انہوں نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور اُن نظریات کی حمائتی بن گئیں۔ اُن کا کمرہ اسی رجحان کی حامل خواتین کے اجتماعات کا مرکز بن گیا جہاں یہ نوعمر لڑکیاں مستقبل میں مردوں کے ساتھ سماجی تعلقات کار کے منصوبے بناتیں۔ ''ہر رات میری سہیلیاں اور میں، مل بیٹھتے اور مستقبل کے تحفظات کے بارے میں گفتگو کرتے اور اس بات پر بحث ہوتی کہ جن حضرات کے ساتھ ہمیں اپنی مرضی سے شادی کرنے کا اگر موقع ملا تو اُن کے ساتھ تعلقات کار، کن اُصولوں پر اُستوار کیے جائیں۔

اس دوران اُن کی دوستوں کا دائرہ کار وسیع ہوتا گیا۔ جب ایلیٹ ہال کے سیکرٹری کی نشست کے انتخابات کا موقع آیا تو انہوں نے مقابلے کا فیصلہ کیا۔ سہیلیوں میں اپنی مقبولیت کی وجہ سے وہ یہ انتخابات جیت گئیں۔ یہ اُن کی زندگی کے نئے سیاسی سفر، جس کا آغاز چند برس بعد ہونا تھا، کا پہلا الیکشن تھا۔

سماجی سرگرمیاں ہارورڈ میں اُن کی زندگی کا لازمی جزو بن گئیں۔ جب مشرقی پاکستان میں سمندری طوفان آیا تو انہوں نے آفت کے شکار لوگوں کے لیے "Save" نامی ایک بین الاقوامی، سماجی و فلاحی تنظیم کے پلیٹ فارم سے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی۔ انہی سرگرمیوں کی بنا پر پورے کیمپس میں انہوں نے اچھا نام اور شہرت کمائی۔ متاثرہ لوگوں کے لیے اُن کی خدمات کے اعتراف میں ایشین سوسائٹی نے انہیں مشرقی پاکستان کے موضوع پر ایک اجتماع سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے سکول کے ایام میں متنوع موضوعات پر بہت سی تقاریر کرتی رہی تھیں لیکن اتنے اعلیٰ سطحی فورم سے دعوت خطاب ملنا ایک نوعمر لڑکی کے لیے انتہائی حیران کن مسرت کا باعث تھا۔ اُن کی تقریر بہت متاثر کن رہی اور حاضرین نے تالیوں کی گونج میں انہیں داد پیش کی۔ باقاعدہ تقریر کرنے کا انہیں یہ پہلا اعزاز حاصل ہوا جس کے بعد یہ سلسلہ اُن کی بعد کی زندگی میں جاری رہا۔

اُن کے لیے معاملات یکسر بدل گئے کہ جب دسمبر میں پہلی برف باری سے تمام ہاسٹل خالی ہو گئے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اور اُن کی سہیلیاں اور ہر کوئی کرسمس منانے چلے گئے۔ ''اپنے پہلے تعلیمی سال کے موسم سرما میں، میں بہت اکیلی تھی،'' تیس سال بعد بھی وہ اس اکلاپے کو اپنے اندر محسوس کرتی ہیں۔ یہ ایک خوف زدہ کرنے والا تجربہ تھا لیکن انہوں نے اس کا حل تلاش کر لیا جس کا اطلاق انہوں نے آئندہ زندگی میں آنے والے ایسے تمام مواقع پر کیا۔ وہ جب بھی اکیلی ہوتیں یا کسی پریشانی سے دوچار ہوتیں تو وہ اپنے آپ کو بہت سے دوسرے اُمور میں مصروف کر لیتیں تاکہ اُن کی توجہ ناخوش گوار معاملات سے ہٹ جائے۔ ''جب آپ بہت سے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں تو سوچنے کا وقت نہیں ملتا،'' وہ بتاتی ہیں۔ ''میں بیٹھ کر افسوس نہیں کرتی بلکہ حالات اور جس جگہ میں موجود ہوتی ہوں، کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہوں۔'' یہ وہ سبق تھا جو انہوں نے اُن سردیوں میں سیکھا۔ انہوں نے بہت سے دوسرے اُمور پر بھی توجہ دی جن میں ٹائپنگ، مطالعہ، مضامین تحریر کرنا، فلمیں دیکھنا اور سٹیج ڈرامے دیکھنا شامل تھے اور اس طرح وقت گزر گیا۔ اس موسم سرما کی تنہائی کا ہمیشہ یاد رہنے والا تحفہ، اُن کی تحریری صلاحیتوں کی دریافت تھا۔ جب انہوں نے 'لائف میگزین' میں ''اسوان ڈیم'' پر ایک تنقیدی مضمون پڑھا تو انہوں نے ''اسوان ڈیم'' کی حمایت میں ایڈیٹر کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ سولہ سالہ بے نظیر حیران رہ گئیں کہ اُن کا خط شائع ہو گیا۔ ذات کے اظہار کا یہ پہلا موقع تھا جس نے دو عشروں بعد، اُن کی خودنوشت لکھے جانے کی بنیاد رکھی، جو کہ دنیا بھر میں بے حد مقبول ہوئی اور اس تصنیف کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔ تاہم اُن کے علمی سفر میں یہ غیر نصابی سرگرمیاں اُن کی توجہ، تعلیم پر مرکوز رہنے کی راہ میں حائل نہیں ہوئیں اور اُن کا زیادہ تر وقت حصول علم میں ہی گزرا۔ وہ ایک اچھی طالبہ ثابت ہوئیں اور انہوں نے دوران تعلیم زیادہ تر 'اے' اور 'بی' گریڈ ہی حاصل کیے۔ صرف پہلی مدت کے امتحانات میں انہوں نے ''سی'' گریڈ حاصل کیا۔ ''میں اپنے آپ میں شرمندہ تھی۔ میں سوچتی تھی کہ جب میرے والد کو میرے حاصل کردہ نمبروں کی بابت معلوم ہوگا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔'' یہ اُن کی تمام تر تعلیمی زندگی میں پہلا اور آخری موقع تھا کہ انہوں نے اپنے کسی ایک مضمون میں 'سی' گریڈ لیا۔

دوسرے تعلیمی برس انہیں مخصوص اختیاری مضمون کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ شروع میں نفسیات پڑھنے کا شوق رکھتی تھیں لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ ایسے طبی مضامین بھی پڑھنا ہوں گے جن میں جانوروں کی سرجری کرنا ضروری ہے تو انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ اُن کے والد چاہتے تھے کہ وہ سیاست کی تعلیم حاصل کریں۔ ''جب مجھے پتہ چلا کہ میرے والد چاہتے ہیں کہ میں تقابلی حکومتوں کی تعلیم حاصل کروں تو میں نے ایسا ہی کیا،'' وہ بتاتی ہیں۔ آئندہ سات برس، بے نظیر نے اپنی خواہش اور ذہانت کو اپنے والد کا خواب پورا کرنے میں صرف کیے۔ اپنے والد کی شیدائی بیٹی، بے نظیر بتاتی ہیں ''میں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نے ہمیشہ اپنے والد کو خوش کرنا چاہا۔ میں اُن کی پوجا کرتی تھی۔ اتنا زیادہ پیار پا کر اُن کی آنکھیں دمکنے لگتیں کہ میں اپنی معیت میں انہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اُن کے پولیٹیکل سائنس کا مضمون اختیار کرنے کے فیصلے سے اُن کے والد بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ اس کردار کے لیے انتہائی موزوں تھا جس کے لیے وہ انہیں بچپن سے تیار کرتے آئے تھے اور وہ تمام قومی اور بین الاقوامی اُمور، دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی ہوتے انہیں طویل خط لکھتے تاکہ وہ اُن کی سیاست، روایت اور نظریات کی وارث بنیں۔

اس وقت تک یونیورسٹی کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ لڑکیوں کے لیے مخصوص ہاسٹل یعنی ایلیٹ ہال کو مخلوط ہاسٹل میں بدل دیا جائے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ثقافتی اقدار کے فرق کی وجہ سے اُن کے لیے انتہائی دشوار تھا کہ وہ مردوں میں گھل مل کر رہیں۔ ''حتیٰ کہ لانڈری روم میں اگر کوئی جونیئر لڑکا موجود ہوتا تو مجبوراً مجھے اپنے کپڑوں کی دھلائی ملتوی کرنا پڑتی۔'' وہ زیادہ دیر اس ماحول میں نہ رہ سکیں اور ایلیٹ ہاؤس میں شراکت کی بنیاد پر ایک اپارٹمنٹ حاصل کرنے کا سوچا جس میں انہیں اپنی دوست یولانڈا کاڈرزکی کے ساتھ رہنا تھا۔ دونوں سہیلیاں اس نئی جگہ منتقل ہو گئیں جو اکیڈمک بلاک سے بارہ منٹ پیدل مسافت پر واقع تھا۔ یہاں انہیں دو کمرے، ایک علیٰحدہ غسل خانہ اور ایک کامن روم میسر تھا اور یہ رہائش کے لیے معقول جگہ تھی۔

اُن دنوں جب بے نظیر ہارورڈ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں، دنیا کے دوسرے کونے پر واقع اُن کا ملک ایک غیر معمولی سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ جنرل یحییٰ خان کی سربراہی میں فوجی حکومت نے ''ون یونٹ سکیم'' کو توڑ دیا جس سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبے، ایک اکائی کی صورت میں اکٹھے تھے۔ مغربی حصے میں چاروں صوبوں کی بحالی کے بعد حکومت نے ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان برابری کو ختم کر دیا اور تب ہی اعلان کیا گیا کہ آئندہ انتخابات میں ''ایک آدمی۔ ایک ووٹ'' کا اُصول اپنایا جائے گا۔ اس طرح مشرقی حصے کو یقینی اہمیت دی گئی جو علاقے کے لحاظ سے چھ گنا چھوٹا تھا لیکن آبادی کے لحاظ سے اکثریتی حصہ تھا۔ 1951ء سے سول اور فوجی حکومتوں کی اختیار کردہ پالیسیوں کی وجہ سے پانچوں صوبوں کے مابین اختلافات کی خلیج پہلے ہی گہری تھی اور خصوصاً ملک کے دونوں حصوں کے درمیان۔ اس پس منظر میں ملک کی پچیس سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ، اس دسمبر میں عام انتخابات کا انعقاد ہو رہا تھا۔

اگرچہ امریکہ میں اُن کا پہلا موسم سرما، اُداس گزرا تاہم دوسرا موسم سرما اُن کے لیے پُرجوش ثابت ہوا۔ ان کے والد کی پاکستان پیپلز پارٹی جس کے پاس عوام کے لیے زندگی کی بنیادی ضروریات یعنی روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنے کا مکمل ایجنڈا تھا، انتخابات میں ایک بڑی پارٹی بن کر اُبھری۔ 7 دسمبر

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

1970ء کی رات، الیکشن والے روز، ہزاروں میل دور اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھی، وہ پاکستان سے خبروں کی بے چینی سے منتظر تھیں۔ ''کیمبرج میں دنیا کے دوسرے حصے میں، میں ٹیلی فون سیٹ اپنے پاس رکھے، تمام رات مطالعہ کرتی رہی،'' وہ بتاتی ہیں۔ آخر کار طویل انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور انہیں اپنی والدہ کی طرف سے کال موصول ہوئی جس میں انہوں نے بتایا کہ اُن کے والد کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی حصے میں قومی اسمبلی کی 138 میں سے 82 نشستیں جیت کر اکثریت حاصل کر لی ہے۔ خود اُن کے والد نے ملک کے مختلف حصوں میں کئی حلقہ بندیوں سے قومی اسمبلی کی 5 نشستیں جیتیں۔

اگلے روز انہیں اخبارات کے ذریعے، مغربی پاکستان میں شاندار انتخابی فتح کے بارے میں معلوم ہوا۔ اُن کے پارٹی اُمیدواروں کی اکثریت نے بڑے جاگیرداروں اور دولت مند سیاسی رقیبوں کو شکست دے کر ملکی سیاست میں نئی طرح ڈال دی۔ تب انہیں یہ شائبہ بھی نہ تھا کہ پاکستان کے روائتی جاگیردارانہ معاشرے میں اُن کے والد کے حریفوں کی انتخابی شکست اُن کے لیے ایک مستقل عداوت کو جنم دے گی جو محض نو برس بعد اُن کے خون کی قربانی سے بھی ختم نہ ہوگی اور اُن کے قتل کے بعد یہ رقابت سیاسی وراثت کے طور پر اُن کی بیٹی کو منتقل ہو جائے گی جسے برسوں اور عشروں بعد بھی ان بدنصیب انتخابات کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ اُن تمام عوامل سے نا آشنا، اس موسم سرما میں اپنے والد کی شاندار فتح پر وہ بے حد خوش تھیں۔ 1971ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر جارحیت کی۔ بھٹو اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے نیویارک پہنچے۔

بے نظیر بھٹو اس عرصے میں اپنے والد کے ہوٹل کے کمرے میں اُن کے ہمراہ معاونت کے لیے موجود رہیں۔ انہوں نے بیک وقت کئی ایک سفارتی اور سیاسی اقدامات کیے تا کہ بھارت کی جانب سے مزید جارحیت کو روکا جا سکے۔ ''پیئر ہوٹل میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بلا وقفہ بجتی رہتیں تھیں،'' بے نظیر بتاتی ہیں جو اپنے والد کی جگہ خود فون کالز سنتی تھیں۔ ''اگر روسی یہاں موجود ہوں تو مجھے بتانا کہ چینی قیادت مجھے فون کر رہی ہے اور اگر یہاں امریکی موجود ہوں تو مجھے بتانا کہ مجھ سے روسی یا بھارتی قیادت فون پر بات کرنا چاہتی ہے اور کسی کو بھی ہرگز یہ نہ بتانا کہ حقیقت میں یہاں کون موجود ہے۔ سفارت کاری کے بنیادی اُصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ شک کی فضا پیدا کر دو۔ کبھی اپنے پتے میز پر مت بکھیرو،'' اُن کے والد نے انہیں ہدایت کی۔ ''میں نے اُن کی ہدایات پر عمل کیا تاہم سبق پر نہیں۔ میں ہمیشہ اپنے کارڈ میز پر بکھیر کر رکھتی ہوں۔''

اُن کے والد نے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے اَنتھک کوشش کی تاہم اُن کاوشوں کے نتیجے کا زیادہ تر انحصار اس بات پر تھا کہ پاکستانی فوج کتنی قوت اور اہلیت سے بھارتی فوج کے حملے کی مزاحمت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کر پاتی ہے۔ ردِعمل حسب منشاء نہ تھا، ہر کوئی واضح طور پر آگاہ تھا کہ مشرقی حصے میں پاکستانی فوج بھارتی حملے کو زیادہ دیر تک روک نہیں پائے گی اور یہ کہ پاکستانی افواج کی جانب سے غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کی کارروائی کسی وقت بھی متوقع تھی۔ اس صورت حال نے پاکستان کی سفارتی قوت کو متزلزل کر دیا اور اس طرح ابتلاء سے آبرومندانہ بچاؤ کے راستے معدوم ہو گئے۔ ہر طرف سے مایوس کن خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ چھ گنا زیادہ بھارتی عسکری طاقت بھرپور متحرک تھی۔ پاکستان عملاً دفاع سے محروم ہو چکا تھا۔ بے نظیر پیغامات وصول کرتیں اور انہیں اپنے والد تک پہنچاتیں۔

12 دسمبر کو آٹھویں مرتبہ سلامتی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تا کہ برصغیر میں جاری جنگ کے مسئلے پر غور و خوض کیا جائے۔ اُن کے والد کو اپنے ملک کا مقدمہ پیش کرنا تھا۔ بے نظیر اُن کے ہمراہ تھیں اور ہال میں ان سے دو قطاریں پیچھے، دنیا بھر سے آئے ہوئے وزراء اور سفارت کاروں کے درمیان تشریف فرما ہوئیں۔ اُن کے والد نے جنگ بندی کے لیے اپنا کیس بہترین طریقے سے پیش کیا کہ بھارتی افواج پاکستانی علاقے سے واپس چلی جائیں۔ اقوام متحدہ کی فوج تعینات کی جائے اور اس امر کا انتظام کیا جائے کہ مشرقی پاکستان میں دوبارہ کوئی شورش سر نہ اُٹھائے۔ مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ بین الاقوامی برادری کے ساتھ ساتھ، پاکستان کی حکمران فوجی جنتا بھی نفسیاتی طور پر ڈھا کہ کھو جانے کو ناگزیر سمجھ چکی تھی۔ سلامتی کونسل نے مسئلے کا آسان حل نکالا اور اجلاس بار بار برخاست کیا جاتا رہا۔ نازک معاملات پر گھنٹوں بحث ہوتی جبکہ پاکستان جل رہا تھا۔ بین الاقوامی برادری درحقیقت، میدان جنگ سے فاتح اور مفتوح کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔

اقوام متحدہ کے کھوکھلے ایوانوں میں ہونے والے ڈرامے، اُن کے والد کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے اور بالآخر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ 15 دسمبر کو بھارتی افواج نے مشرقی پاکستان پر عملاً کنٹرول حاصل کر لیا۔ بے نظیر اُس وقت اپنے والد کے پیچھے رکھی مخصوص نشست پر بیٹھی تھیں کہ جب وہ اپنے نوٹس پھاڑتے ہوئے دھاڑے! ''اپنی سلامتی کونسل اپنے پاس رکھو۔ یہ لو! میں جا رہا ہوں۔'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور متحیر سکوت میں پاؤں پٹختے کمرے سے باہر نکل گئے۔ بے نظیر نے جلدی جلدی اپنے کاغذات سنبھالے اور دیگر پاکستانی مندوبین کے ہمراہ ان کے پیچھے پیچھے نکل گئیں۔ ''پاکستان کو آئندہ درپیش حالات پر میرے والد بہت پریشان تھے اور ہم چلتے جا رہے تھے،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔ اگلے روز جنرل نیازی نے بھارتی کمانڈر کے سامنے ڈھا کہ ریس کورس گراؤنڈ میں رسمی طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ تقریباً ایک لاکھ کے قریب پاکستان کے بہترین سپاہی اپنے بھارتی مدمقابل جنرل جگجیت اروڑہ کی کمانڈ اور کنٹرول میں دے دیئے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ پاکستانی افواج کے ہتھیار ڈالنے کی خبر پاکستان کے عوام کو 'آل انڈیا ریڈیو' پر بھارتی وزیراعظم سے سننے کو ملی۔ آخرکار جب انہونی ہوگئی تو ریڈیو پاکستان نے شام کو خبروں میں ہتھیار ڈالے جانے کی خبر سنائی۔ ''بھارتی اور پاکستانی فوجی قیادت کے مابین معاملات طے پاجانے کے بعد' مشرقی محاذ پر جنگ رُک گئی ہے اور بھارتی افواج ڈھاکہ میں داخل ہوچکی ہیں۔'' چند گھنٹے بعد صدر پاکستان ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر شکست کا اعتراف کرنے نمودار ہوئے۔ یہ پاکستانی عوام کے لیے انتہائی شدید دھچکا تھا جو سرکاری ذرائع ابلاغ پر شکست سے ایک روز پیشتر تک، پاکستانی افواج کی فتوحات کی کہانیاں سنتے رہے تھے۔

اس سے ملک بھر میں بڑے بڑے اجتماعات اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لوگ فوجی جنتا کو لعن طعن کررہے تھے اور جنرل یحییٰ کو پھانسی دینے کا مطالبہ کررہے تھے۔ منتخب سول قیادت کو اقتدار کی فوج سے، منتقلی کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ بے حس فوجی قیادت اب بھی برسراقتدار رہنے پر مصر تھی اور عنان حکومت اکثریتی رائے سے منتخب نمائندوں کو سونپنے سے گریزاں تھی حالانکہ اتنا عظیم سانحہ ہوچکا تھا۔ پھر راولپنڈی کے نیشنل ڈیفنس کالج میں ایسا واقعہ رُونما ہوا جس سے پورا منظرنامہ بدل گیا اور جرنیل اقتدار منتقل کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ہوا یوں کہ جب صدر یحییٰ کے چیف آف سٹاف، جنرل حمید خان نے مشرقی پاکستان کے حالیہ واقعات پر جونیئر فوجی افسران کو معلومات دینے کی کوشش کی تو اُن کا مذاق اُڑایا گیا اور انہیں گالیاں دی گئیں۔ اعلیٰ فوجی قیادت کی شان وشوکت ہمیشہ کے لیے جاتی رہی۔ یحییٰ کا کھیل ختم ہوچکا تھا۔ کوئی اور راستہ نہ پاتے ہوئے جرنیلوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کی سب سے بڑی پارلیمانی پارٹی کے راہنما اور کثرت رائے سے منتخب ہونے والے قائد، ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار دے دیا جائے۔

بھٹو ابھی ملک سے باہر تھے کہ جب جرنیلوں نے انہیں تار بھیجا اور واپس پہنچ کر بچے کھچے پاکستان کا اقتدار سنبھالنے کی درخواست کی۔ ملک نے لاکھوں جانوں کے لہو کی قربانی دے کر اور اپنا آدھا بازو گنوا کر گزشتہ دہائیوں کی غیرنمائندہ حکومت سے نجات حاصل کی۔

جیسے ہی ذوالفقار علی بھٹو واپس پہنچے، انہیں فوری طور پر ایوان صدر لایا گیا جہاں انہیں اقتدار حوالے کیا گیا۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی آئین نہیں تھا لہٰذا انہیں صدر اور ملک کے پہلے سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حلف اُٹھانا پڑا۔ پاکستان ٹوٹ چکا تھا اور اس کا وقار مجروح تھا۔ اُن کے والد کو ٹکڑے چُننا تھے، بہت چھوٹے ٹکڑے، جیسا کہ انہوں نے تقریب حلف برداری کے فوراً بعد ٹیلی ویژن نشریئے میں کہا ''ہم ایک نیا پاکستان بنائیں گے۔ ایک خوشحال اور ترقی پسند پاکستان، استحصال سے پاک پاکستان، قائداعظم کا تخیل پاکستان۔ میں اپنے معاشرے میں پھول کھلانا چاہتا ہوں۔ میں تکالیف

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کا خاتمہ چاہتا ہوں..... تہذیب یافتہ ممالک ایسے نہیں چلائے جاتے۔ تہذیب کا مطلب ہے سول حکومت..... جمہوریت..... ہمیں جمہوری ادارے پھر سے بنانے ہیں..... ہمیں مستقبل میں اُمید جگانی ہے۔'' پاکستان کے صدر، ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے مقاصد سے ہم وطنوں کو آگاہ کیا۔

اب ہارورڈ میں بے نظیر کو پاکستان کی 'پنکی' کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صدر پاکستان کی بیٹی ''پنکی بھٹو'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

اُن کے والد نے انہیں بتا رکھا تھا کہ ہارورڈ کی نسبت کہ جہاں تعلیم سہل انداز سے دی جاتی ہے آکسفورڈ میں بڑے دباؤ میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ''جب مجھے سیاست، فلسفے اور معاشیات کے درس میں ہر ہفتے مطلوبہ دو مضامین تخلیق کرنا پڑے تو میں نے تسلیم کیا کہ وہ درست کہتے تھے۔'' وہ اپنی خودنوشت میں تحریر کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور وہ آکسفورڈ کے ماحول میں اچھی طرح گھل مل گئیں۔

ابھی وہیں زیرتعلیم تھیں کہ ستمبر 1973ء میں وہ اپنے والد کے ہمراہ ایک سرکاری دورے پر امریکہ گئیں۔ جہاں وہ صدر نکسن اور وزیرخارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر سے ملیں۔ انہیں وائٹ ہاؤس کے ایک پُرتکلف عشائیے میں کسنجر کے ساتھ نشست ملی۔ ''جب مچھلی کا دور چل رہا تھا تو میں نے ہمت جمع کر کے اُن کے ساتھ ہارورڈ کے اشرافیہ اور دیگر غیرمتنازعہ موضوعات پر بات چیت کی'' وہ بتاتی ہیں۔ میں بہت گھبرائی ہوئی تھی اس لیے اگلی شام جب کسنجر نے ایک اور عشائیے میں میرے والد کو گھیر لیا اور کہا ''جناب وزیراعظم آپ کی بیٹی آپ سے زیادہ رعب ودبدبے کی مالک ہے،'' میرے والد نے اس طنز کو توصیف گردانتے ہوئے کھل کر قہقہہ لگایا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں۔''

فروری 1974ء میں اُن کے والد نے لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ چاہتے تھے کہ اس تاریخی موقع پر اُن کی بیٹی موجود ہو۔ وہ اُن کی ہمراہی کے لیے لندن سے لاہور پہنچیں۔ 38 مسلم مملکتوں کی اعلیٰ قیادت پر مشتمل یہ ایک اہم اجتماع تھا جس میں سعودی عرب کے شاہ فیصل، مصر کے صدر انورالسادات، لیبیا سے کرنل قذافی، بنگلہ دیش سے شیخ مجیب الرحمٰن، فلسطینی تحریک آزادی کے چیئرمین یاسر عرفات اور اسلامی دنیا کے غالباً ہر بادشاہ، صدر اور وزیراعظم شریک ہوئے۔

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' وہ وزیراعظم کی گیلری میں بیٹھ کر اپنے والد کا خطاب سن رہی تھیں۔ ''ظل سبحانی، شاہان مملکت اور پیارے مسلمان بھائیو!'' اُن کے والد نے خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا میزبان ملک بین الاقوامی سازشوں کا شکار رہا ہے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اور ایک اہم معاملے پر فکر مند ہے جس میں اس کے مؤقف کی بنیاد انصاف اور مسلمانوں کے حقوق کی فکر کے علاوہ کچھ نہیں۔'' انہوں نے شرکاء کی توجہ کشمیر کی طرف دلائی۔ ''اسرائیل کے زیر قبضہ عرب علاقوں میں، القدس کا مسلمانوں کے دلوں میں خاص مقام ہے۔'' انہوں نے یروشلم پر اسرائیلی قبضے سے متعلق اپنا بیان جاری رکھا جو عالم اسلام کے تین مقدس ترین شہروں میں سے ایک ہے۔

اس غیر معمولی اجتماع میں جو تین روز تک جاری رہا، دنیا بھر کے اسلامی ممالک کو درپیش تمام اہم مسائل پر توجہ دی گئی۔ کانفرنس کے اختتام پر اُن کے والد کو اسلامی ممالک کی تنظیم کا چیئرپرسن منتخب کیا گیا جو کہ مسلم اُمہ کے سب سے بڑے ادارے میں اعلیٰ ترین منصب تھا۔ اُن تین روز کے دوران اُن کے والد نے تمام معزز مہمانوں سے بے نظیر کا تعارف کرایا۔

''میرے والد نے فروری 1974ء میں پاکستان میں منعقدہ اسلامی کانفرنس کے لیے مجھے بلوایا۔ میں وہاں موجود رہی اور متحدہ عرب امارات کے صدر سے لے کر کویت، قطر اور بحرین کے امراء سے ملی،'' وہ بتاتی ہیں۔ اُن کے والد جانے انجانے میں اُن کے مستقبل کے کردار کے لیے اُن کی تربیت کر رہے تھے جو انہیں پاکستان کی سیاست میں ادا کرنا تھا۔ آکسفورڈ واپسی پر بے نظیر نے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کی۔ اس وقت تک اُن کا شمار ہردلعزیز اور متحرک طلباء میں ہونے لگا تھا۔ ''وہ اکثر اوقات ظہرانے اور عشائیوں کے لیے دوستوں کے ہمراہ جایا کرتیں۔'' اُن کے آکسفورڈ کے ایام کی دوست وکٹوریہ شفیلڈ بتاتی ہیں جو اسی کالج میں اُن سے ایک سال پیچھے تھیں۔ وہ آکسفورڈ کی انتہائی قابل تکریم 'آکسفورڈ یونین ڈیبیٹنگ سوسائٹی' کی سٹینڈنگ کمیٹی کی رُکن بھی منتخب ہوئیں۔ یہ مقام انہوں نے اپنی ذہانت اور اہلیت کی بنا پر حاصل کیا کیونکہ آکسفورڈ میں وہ اکیلی نہ تھیں کہ جس کا شاندار خاندانی پس منظر تھا۔ ''وہاں اور بھی ایسے طلباء تھے جن کے باپ اثر ورُسوخ والے تھے۔ وہاں پر بہت سے برطانوی بااثر شہری بھی تھے۔ لہٰذا ایسا ہرگز نہ تھا کہ ہر کوئی بے نظیر سے متاثر ہوتا۔'' وکٹوریہ نے وضاحت کی۔ ''یہ ہمارے لیے معمول کے مطابق تھا۔''

وہ ضرورت کے وقت اپنے دوستوں کی مدد کرنے میں بڑی فراخ دل تھیں۔ ''ایک مرتبہ میں لندن جانا چاہتی تھی،'' وکٹوریہ نے اُن کی مہربان عادت کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا۔ ''انہوں نے کہا کہ میری گاڑی لے جاؤ۔ انہوں نے میری بائیسکل چلائی اور میں اُن کی گاڑی لے کر لندن چلی گئی۔'' وہ حقیقتاً لوگوں اور اُن کے مسائل میں دلچسپی لیتیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہو کر خوش ہوتیں۔ ''وہ اکثر اوقات دعوتیں دیا کرتیں۔ وہ ہمیشہ اپنی سالگرہ دھوم دھام سے مناتی ہیں اور اس معاملے میں بڑے کھلے دل کی مالک ہیں۔''

آکسفورڈ میں تین برس پلک جھپکتے گزر گئے۔ 1976ء میں انہوں نے سیاست، فلسفہ اور معاشیات (PPE) میں گریجویشن پاس کیا۔ وہ پاکستان واپس لوٹیں اور انہوں نے ملک کی فارن سروس میں ملازمت کا ارادہ کیا۔ لیکن اُن کے والد چاہتے تھے کہ وہ ملازمت شروع کرنے سے قبل ایک سالہ پوسٹ گریجویشن کورس مکمل کریں۔ ''میرے والد اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اُن کی اولاد، وزیراعظم کی اولاد ہونے کے ناطے کسی بھی ملازمت کے لیے دوگنی اہلیت کی حامل ہو۔ تاکہ کوئی انہیں، یا ہمیں اقرباء پروری کا الزام نہ دے سکے۔'' چنانچہ وہ دوبارہ آکسفورڈ لوٹ گئیں۔ اس مرتبہ اُن کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے بھی ہارورڈ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں سال اول میں داخلہ لیا تھا۔ اُن کی آکسفورڈ واپسی خوش آئند رہی۔

آکسفورڈ میں متنوع دلچسپیاں رکھنے والے طلباء کے گروپس کے لیے کئی سوسائٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔ ان میں سب سے قابل تکریم 'آکسفورڈ یونین ڈیبیٹنگ سوسائٹی' تھی۔ یہ 1823ء میں قائم ہوئی اور اسے برطانوی دارالعوام کی طرز پر اُستوار کیا گیا تھا۔ یہ ایسے طلباء کی ابلاغی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں مددگار تھی جو سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سوسائٹی میں مردوں کی اجارہ داری تھی اور حال ہی میں خواتین کو بھی رُکنیت کی اجازت ملی تھی تاہم مخلوط نظام کے دس برس گزر جانے کے باوجود مرد اور خواتین اراکین کا تناسب 7 اور ایک رہا۔ گریجویشن کے دوران وہ سٹینڈنگ کمیٹی کی عہدے دار رہ چکی تھیں لیکن اب وہ اس یونین کی صدارت کا الیکشن لڑنا چاہتی تھی جو ایک خاتون اور اس پر مستزاد یہ کہ ایشیائی ہونے کی وجہ سے یقینی طور پر ایک دشوار منزل تھی۔

اُن کے والد سمیت کوئی بھی اُن کی کامیابی کے لیے زیادہ پر اُمید نہ تھا۔ اُن کی واضح شکست کو مدّنظر رکھتے ہوئے اور اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کے والد نے انہیں امریکہ میں صدارتی انتخابات کے پس منظر میں ایک خط تحریر کیا جہاں نومبر 1976ء میں جیرالڈ فورڈ کا مقابلہ جمی کارٹر سے تھا۔ ''ایک انتخاب میں ایک فریق کی جیت ہوتی ہے تو لازمی طور پر دوسرے کی ہار۔ آپ کو اپنی جانب سے بھرپور کاوش کرنا ہوتی ہے اور نتیجے کو تحمل سے قبول کرنا ہوتا ہے۔'' تاہم یہ تحفظات غلط ثابت ہوئے اور انہیں 'آکسفورڈ یونین' کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اُن کے والد بہت خوش ہوئے۔ ''تمہارے 'آکسفورڈ یونین' کا صدر منتخب ہونے پر ہمارے دل مسرت سے لبریز ہیں۔ تم نے کمال کر دیا۔ تمہاری اس شاندار کامیابی پر ہماری جانب سے بھرپور مبارک باد ہو۔'' یہ اس تار میں درج تھا جو انہیں اپنے باپ کی جانب سے موصول ہوا۔

جنوری 1977ء میں یونین کا دفتر سنبھالنے سے پہلے وہ اور اُن کے بھائی میر مرتضیٰ، موسم خزاں کی

چھٹیوں میں پاکستان آئے۔ 5 جنوری کو اپنے والد کی سالگرہ کے موقع پر وہ پہلی مرتبہ اپنے والد کے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق سے ملیں جس نے چھ ماہ بعد اُن کے والد کو اقتدار سے نکال باہر کر کے بالآخر پھانسی کے تختے تک پہنچایا۔ ''مجھے یاد ہے کہ میں اُسے دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ ایک بچے کے ایک سپاہی کے بارے میں تخیل، یعنی لمبا چوڑا اور کرخت جو جیمز بانڈ جیسے اعصاب کا مالک ہو، کی طرح میرا بھی تصور تھا لیکن جو جنرل میرے سامنے کھڑا تھا پستہ قد، نروس، تاثرات سے عاری نظر آنے والی شخصیت کا مالک جس نے رنگے ہوئے بالوں کے درمیان سے چیر نکال رکھا تھا جو سر سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ ایک مثالی فوجی سالار کے بجائے کسی انگریزی کارٹون فلم کا ولن لگ رہا تھا۔ وہ مجھے بار بار یہ بتاتے ہوئے انتہائی نامعقول لگ رہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے عظیم انسان کی بیٹی سے مل کر اُس کی عزت افزائی ہوئی۔'' انہوں نے اس شخص کے بارے میں اپنے اولین تاثر کا اظہار کیا۔ ''یقیناً میرے والد کو زیادہ رُسوخ والا چیف آف سٹاف مل سکتا تھا، میں نے سوچا تاہم اس بابت میں نے اپنے والد سے کوئی بات نہیں کی۔''

اپنی عوامی مقبولیت اور اقتدار کی معراج پر پہنچ کر اُن کے والد نے 1977ء کے آغاز میں اسی سال مارچ میں قومی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ ''میں مزید لینڈ ریفارمز کا اعلان کرنے جا رہا ہوں،'' اُن کے والد نے اپنی سالگرہ والے روز کی دوپہر انہیں آگاہ کیا۔ ''اور میں مارچ میں انتخابات کا اعلان بھی کرنے جا رہا ہوں۔ آئین کے مطابق ابھی اگست تک الیکشن کی ضرورت نہیں مگر میری نظر میں انتظار کی کوئی ضرورت نہیں۔ جمہوری ادارے جو ہم نے آئین کے تحت قائم کیے ہیں، اپنی جگہ پر کام کر رہے ہیں۔ پارلیمنٹ اور صوبائی حکومتیں کام کر رہی ہیں۔ اب عوام سے تائید لے کر ہم عمل درآمد کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو سکتے ہیں یعنی ملک کی صنعتی بنیادوں کی وسعت، نئے ٹیوب ویلوں کی تنصیب سے زراعت میں جدت، بیجوں کی تقسیم اور کھاد کی پیداوار میں اضافہ۔'' انہوں نے ترقی کی طرف گامزن خوشحال پاکستان کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

وہ پاکستان میں عام انتخابات کی گہما گہمی چھوڑ کر آکسفورڈ واپس لوٹ گئیں جہاں انہیں یونین میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالنا تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے جو مباحثہ کرایا اس کا موضوع تھا 'سرمایہ داری نظام ہی کامیاب ہوگا'۔ انہوں نے موضوع کی مخالفت میں بات کرنے کے لیے یونین کے ایک سابق صدر طارق علی کو مدعو کیا جو بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انتہائی متحرک پاکستانی اور محترم تھے۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں مباحثہ بڑا کامیاب رہا۔ اگلا مباحثہ بھی اسی طرح سے اہمیت کا حامل تھا جس کا موضوع تھا ''مغرب، تیسری دنیا کے وسائل پر زیادہ دیر تسلط نہیں رکھ سکتا۔'' یہ شمال اور جنوب میں تقسیم کے پس منظر پر تھا کہ جس پر اُن دنوں عام بحث چل رہی تھی۔ ''انہوں نے اس مباحثے کے لیے دعوت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

عام جارحی کی تاکہ ہر کوئی یہ جانے کہ آکسفورڈ یونین کس طرح کام کرتی ہے۔ چنانچہ اس بار بھی حاضری بھرپور رہی،'' وکٹوریہ بتاتی ہیں۔

بے نظیر بھٹو کی صدارت میں وکٹوریہ شفیلڈ بھی آکسفورڈ یونین کی لائبریرین منتخب ہوئیں۔ انہیں پہلا کام جو یونین کی صدر نے تفویض کیا وہ یہ تھا کہ ایسے جرائد کے بارے میں معلومات اکٹھی کریں جو خریدے تو گئے لیکن مطالعہ نہیں کیے گئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ غیر ضروری مواد پر خرچ کیے جانے والے فنڈز بچا کر مفید کاموں پر لگائے جائیں۔ اُن کی ہدایت پر وکٹوریہ نے ایک طویل سوالنامہ تیار کیا جسے تمام اراکین کو بھیجا گیا اور متفرق جرائد پر اُن کی ترجیحات پوچھی گئیں۔

یہ مشق انتہائی مفید ثابت ہوئی اور اس طرح اخراجات میں خاطر خواہ کمی کے ساتھ ساتھ خریداری کی فہرست میں واقعتاً مفید جرائد کا اضافہ ہوا۔ شاید یہ ایک تنظیمی رُجحان کی ابتدا تھی۔

پاکستان میں پی این اے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلا رہی تھی اور ہزاروں میل دور بے نظیر آکسفورڈ کے کوئین الزبتھ ہاؤس میں اپنی 24ویں سالگرہ منا رہی تھیں۔ ''میں نے آکسفورڈ کی ایڈریس بک میں شامل تمام لوگوں کو مدعو کر لیا تھا اور لوگوں کا ہجوم دیکھ کر لگا کہ ہر کوئی آن پہنچا۔ سٹرابیری اور کریم سے بھرے پیالوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم گھل مل گئے اور آپس میں گھر کے پتوں کا تبادلہ کیا،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔ وہ آکسفورڈ چھوڑتے ہوئے افسردہ تھیں جہاں انہوں نے چار برس آزادی سے گزارے تاہم اب اُن کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور انہیں اپنی عملی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ انہوں نے سفارت کاری کا پیشہ اپنانے کے لیے بڑے منصوبے بنا رکھے تھے۔ جب وہ واپس پاکستان آ رہی تھیں تو تقدیر اُن کے منصوبوں پر مسکرا رہی تھی۔

جب بے نظیر جون 1977ء میں واپس پاکستان لوٹیں تو اُن کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اسمبلی الیکشن میں حصہ لیں۔ اُن کی والدہ اسی برس مارچ میں منعقدہ انتخابات میں قومی اسمبلی کی رُکن منتخب ہوئی تھیں مگر وہ چاہتی تھیں کہ اُن کی جگہ بے نظیر ایم این اے ہوں۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان کی خاتون اول ہونے کے ناطے اُن کا بہت سا وقت اور توانائیاں صرف ہوئیں۔ تاہم اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لیے عمر کی کم از کم حد 25 سال تھی اور عمر کی یہ حد پوری کرنے میں ابھی مزید ایک برس درکار تھا۔ اُن کی والدہ نے انہیں آگاہ کیا کہ جب وہ مطلوبہ عمر کی حد تک پہنچیں گی تو وہ استعفیٰ دے کر سیاست میں اُن کی راہ ہموار کریں گی۔

بے نظیر نے اپنے لیے اور ہی منصوبہ بنایا تھا۔ وہ فارن سروس اختیار کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں سیاست میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اپنے والدین کی انتہائی مصروف زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے، جو

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو شملہ میں

جون 1972ء میں موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے جب بے نظیر بھٹو وطن واپس اپنے گھر لوٹیں تو انہوں نے اپنے والد اور بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے درمیان ملاقات کا ماحول تیار پایا جو شملہ میں ہونا تھی تاکہ جنوبی ایشیا کے دو ہمسائیوں کے مابین کشیدگی کم ہو سکے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان دسمبر 1971ء کی جنگ کے زخم ابھی تک رس رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کٹ کر دنیا کے نقشے پر بنگلہ دیش کی صورت میں اُبھر چکا تھا۔ سابقہ مشرقی پاکستان میں مبینہ فوجی جارحیت کی وجہ سے عالمی سطح پر پاکستان کی ناک کٹ گئی۔ بھارت نے 93,000 سے زائد پاکستانی فوجیوں کو جنگی قیدی بنا لیا اور 5139 مربع میل کے پاکستانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ دوسری جانب پاکستان کے پاس محض 637 بھارتی فوجی اور 69 مربع میل کا بھارتی علاقہ زیرِ تسلط تھا۔ 1947ء سے لے کر اب تک طاقت کا توازن کبھی بھی اتنا زیادہ بھارت کے حق میں نہیں رہا تھا کہ جب دونوں ممالک نے برطانوی راج سے آزادی حاصل کی۔ شکست خوردہ اور منتشر پاکستان، بے نظیر بھٹو کے والد کی قیادت میں مذاکرات کی میز پر وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس ملک نے میدان جنگ میں ہار دیا تھا۔ دوسری جانب بھارت بطور فاتح اپنی پوزیشن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بھارتی قیادت شاید ''معاہدہ ورسائی'' برصغیر میں دہرانا چاہتی تھی! اس موقع پر دونوں ممالک کی تاریخ میں عظیم سفارتی کش مکش یقینی تھی۔

اُن کے والد چاہتے تھے کہ بے نظیر بھارت کے دورے میں اُن کے ہمراہ چلیں تاکہ ممکنہ معاہدہ اپنے سامنے تکمیل پاتا دیکھیں۔ وہ بخوشی راضی ہو گئیں۔ تاہم انہیں چھوٹے سے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ محض گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آئی تھیں اور ایسے موقع پر پہننے کے لیے اُن کے پاس مناسب لباس نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی سہیلیوں، سمیعہ اور سلیمہ کو کہا کہ انہیں چند جوڑے کپڑے دے دیں۔ اتفاقاً اُن کی سہیلی کی بڑی بہن، عظمیٰ کے کپڑے انہیں پورے آئے۔ چنانچہ انہوں نے بھارت میں پہننے کے لیے چند جوڑے لے لیے۔ ''جب میں وہاں گئی تو ہر کوئی یہی سمجھا کہ میں نے نئے فیشن کی طرح ڈالی ہے حالانکہ وہ کپڑے میں نے انتہائی مجبوری میں اپنی دوست سے مستعار لیے تھے،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کھچاؤ اور دباؤ سے عبارت تھی، وہ سیاست بطور پیشہ اپنانے کے خیال سے ہی گھبراتی تھیں لیکن فارن سروس سے منسلک ہونے میں بھی یہ مسئلہ تھا کہ اس اعلیٰ ملازمت کے لیے داخلے کا امتحان دسمبر میں ہونا تھا اور ابھی اس میں چھ ماہ کا عرصہ باقی تھا۔ اُن کے والد نے ایک درمیانی تجویز پیش کی۔ ''پاکستانی سیاست کے بارے میں ازخود معلومات حاصل کرو۔ آئندہ چھ ماہ کے لیے میرے دفتر میں آ کر میری مدد کیا کرو۔ اگر تمہیں اس میں دلچسپی محسوس ہو تو پھر جاری رکھو بصورت دیگر فارن سروس کے لیے مطلوبہ اہلیت حاصل کرو۔'' وہ رضامند ہو گئیں۔

انہیں اپنے والد کے دفتر سے ملحقہ، ایک کشادہ دفتر فراہم کیا گیا جہاں انہیں وزیراعظم کے مشیر کے فرائض سرانجام دینا تھے نیز اُن کا رابطہ بین الصوبائی رابطہ کمیٹی سے تھا۔ اس کمیٹی کا بنیادی مقصد صوبوں اور وفاق پاکستان کے مابین اختلافات دور کرنا تھا۔ اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان سے ہی صوبوں اور وفاق پاکستان کے مابین تعلقات کار، پاکستانی سیاست کا محور رہے۔

صوبائی رابطوں کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اُن کے والد نے انہیں سمریاں تیار کرنے کی ہدایت بھی کی تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ اُن میں سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت کس قدر تھی۔ ''جب میں نے پہلے دن کی سمری پیش کی تو میرے والد سوچ میں پڑ گئے،'' وہ بتاتی ہیں۔ ''یہ بے کار ہے،'' انہوں نے کہا۔ ''لگتا ہے کسی میٹرک پاس نے تیار کی ہے۔ یہ کسی ایسے طالب علم کی تیار کردہ نہیں لگتی جو ہارورڈ یا آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو۔'' دراصل انہوں نے بہت سی سمریوں کو مختصر ایک سمری میں پیش کر دیا تھا۔ یہ کام ان کے لیے نیا تھا اور انہوں نے فرض کر لیا کہ اُن کا کام وزیراعظم کے لیے تیار کی گئی مختلف مختصر رپورٹوں کو مزید مختصر کر کے پیش کرنا ہے۔ اگلے ہی روز انہوں نے اپنا طریقہ کار بدل دیا اور رپورٹوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اُن کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی نشاندہی کر دی۔ ''چنانچہ اگلے روز وہ مجھ سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ سے ایسا ہی کچھ کرنے کی توقع رکھتے تھے۔''

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اپنی 19 ویں سالگرہ منانے کے ہفتہ بھر بعد وہ چندی گڑھ کی پرواز کے لیے صدارتی طیارے پر سوار ہوئیں۔ اُن کے ہمراہ اُن کے والد کا سرکاری وفد تھا۔ روانگی کے وقت لاہور میں ایک تقریب منعقد ہوئی جہاں انہیں پرتپاک ماحول میں رخصت کیا گیا۔ ہوائی اڈے پر سیاسی عمائدین، اراکین اسمبلی اور عوام کی بڑی تعداد نے انہیں خدا حافظ کہا۔ ہر کسی نے اس نازک مشن کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ اُمیدوں، آنسوؤں اور دعاؤں کی معیت میں، لاہور سے چندی گڑھ کے لیے خصوصی پرواز محوِ سفر ہوئی۔ دوران پرواز ان کے والد نے انہیں سفارت کاری کی بابت آگاہ کیا۔ ''ہر کوئی ملاقاتوں کی پیش رفت کے بارے میں سُن گُن لے گا۔ لہٰذا محتاط رہنا، تم ہرگز نہ مسکرانا اور یہ تأثر نہ دینا کہ تم محظوظ ہو رہی ہو جبکہ ہمارے سپاہی ابھی بھارت کے جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں ہیں۔ تمہیں آزردہ نظر آنا چاہیے تاکہ لوگ اسے افسردگی کی علامت جانیں۔''

''تو پھر مجھے کیسا دکھائی دینا چاہیے؟'' اُلجھن میں بے نظیر نے پوچھا۔

''میں نے قبل ازیں بھی تمہیں بتایا ہے۔ نہ تو غمگین نظر آؤ اور نہ ہی خوش،'' حیران بے نظیر کو اُن کے والد نے جواب دیا۔

''میں مخمصے میں تھی کہ اگر مجھے خوش یا غمگین دکھائی نہیں دینا تو پھر مجھے کیا کرنا ہے تاہم میرا خیال ہے کہ میں نے صورت حال سنبھال لی تھی کیونکہ وہ مجھ سے خوش تھے۔'' بے نظیر 27 سال بعد انکشاف کرتی ہیں۔

چندی گڑھ پہنچنے پر بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے اُن کا استقبال کیا کیونکہ مسز گاندھی ملاقات کے انتظامات کا حتمی جائزہ لینے، پہلے ہی شملہ روانہ ہو چکی تھیں۔ جیسے ہی بے نظیر بھٹو اپنے والد کی پیروی میں سرخ رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض میں ملبوس، طیارے سے برآمد ہوئیں، ایک بھارتی خاتون آگے بڑھی اور انہیں پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔ معززین کی ایک لمبی قطار سے اُن کا تعارف کرایا گیا جنہوں نے بھارتی سرزمین پر اُن کا استقبال کیا۔ انہوں نے وہاں کچھ وقت گزارا اور پھر شمال میں پہاڑی علاقے کی جانب، اپنے سفر کے اگلے مرحلے میں روسی ساختہ ایم۔8 ہیلی کاپٹر پر سوار ہو گئے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد، دوپہر سوا ایک بجے ہیلی کاپٹر شملہ میں اُتر گیا جہاں فٹ بال گراؤنڈ کو بھارتی حکام نے عارضی ہیلی پیڈ میں تبدیل کر دیا تھا۔ نظاروں سے بھرپور پہاڑی مقام میں خوشگوار موسم نے انہیں خوش آمدید کہا جو برطانوی راج میں موسم گرما کا دارالحکومت رہا۔ ابھی ایک روز قبل موسلا دھار بارش سے یہاں سب جل تھل ہو چکا تھا۔ اگرچہ آسمان ابھی تک بادلوں سے پُر تھا تاہم بارش تھم چکی تھی۔ ہلکی سی ٹھنڈک تھی جس نے سندھ کے میدانوں سے آنے والے مہمانوں کو خوشگوار تاثر دیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہیلی پیڈ پر ابر آلود فضا میں، ساڑھی میں لپٹی اور برساتی اوڑھے، مسز اندرا گاندھی نے بے نظیر اور اُن کے والد کو خوش آمدید کہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بے نظیر بھٹو کی مسز اندرا گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ ''میں نے مسز اندرا گاندھی سے متعلق بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور جب میں اُن سے ملی تو انہیں اپنے تخیل سے بڑھ کر پستہ قد اور شائستہ تر پا کر حیران رہ گئی،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔

''السلام علیکم،'' بے نظیر نے اندرا گاندھی کو سلام کیا۔

''نمستے،'' اندرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

رسمی استقبال کے بعد اندرا نے مہمانوں کو سیاہ لیموزین میں بٹھایا جس پر بھارت اور پاکستان کے جھنڈے لہرا رہے تھے، اور انہیں صوبائی گورنر ہاؤس 'ہما چل بھون' لے گئیں جسے شملہ میں اُن کی سرکاری قیام گاہ کا درجہ دیا گیا تھا۔ اُن کے والد کے سکول کے ایام کے دوست 'پیلو مودی' (80-1926ء) اور اُن کی بیوی 'وینا' دہلی سے خاص طور پر اُن کے والد سے ملنے آئے تھے۔ ''مجھے پیلو مودی سے شملہ میں ملاقات یاد ہے..... میں اُن سے قصے کہانیاں سن کر بڑی محظوظ ہوئی،'' بے نظیر بتاتی ہیں۔

30 جون کو وزیراعظم اندرا گاندھی نے مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ بے نظیر نے پہننے کے لیے ریشمی ساڑھی کا انتخاب کیا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں دوسری مرتبہ ساڑھی پہنی اور وہاں پر ممی موجود نہیں تھیں جو اسے پہننے میں میری مدد کرتیں۔ میں حقیقتاً گھبرا رہی تھی اور ڈر رہی تھی کہ کہیں ساڑھی پر پاؤں نہ آ جائے، مبادا یہ گر جائے اور میری وجہ سے میرے والد کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔'' اندرا گاندھی مسلسل انہیں تکے جا رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ مزید نروس ہو گئیں۔ شاید وہ اُن سفارتی دوروں کو یاد کر رہی تھیں کہ جن میں وہ (بے نظیر) اپنے والد کے ہمراہ رہیں۔ انہوں نے خیال کیا۔ ''کیا وہ مجھ میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھیں؟ ایک اور سٹیٹس مین کی بیٹی؟ کیا وہ ایک بیٹی کا اپنے باپ کے لیے پیار یا ایک باپ کی اپنی بیٹی کے لیے محبت یاد کر رہی تھیں؟'' وہ مسلسل سوچتی رہیں۔

ابتدائی مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد دونوں ممالک کے مندوبین نے متفقہ اور قابل قبول معاہدے کی جستجو میں خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ بھارتی چاہتے تھے کہ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کر لے، کشمیر میں جنگ بندی لائن کو مستقل سرحد مان لے، جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دے، دفاعی اخراجات اور افواج میں کمی پر رضامند ہو جائے اور دیگر اسی نوعیت کی شرائط۔ یہ وہ قیمت تھی جو بھارت پاکستانی علاقے اور فوجیوں کی واپسی کے بدلے میں چاہتا تھا۔ اگرچہ پاکستان انتہائی نامساعد صورت حال سے دوچار تھا لیکن خودی کا احساس باقی تھا اور پھر بھارتیوں کو صدر بھٹو سے معاملہ کرنا تھا جو منجھے ہوئے سٹیٹس مین تھے اور جنہوں نے سابقہ فوجی آمروں کی طرح کوئی احمقانہ اقدام نہیں اُٹھایا تھا۔ وہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اپنے ملک کی کمزوری سے واقف تھے لیکن وہ اپنے ملک کی طاقت سے بھی آگاہ تھے۔

شملہ آنے سے پیشتر انہوں نے خطے کے 14 مسلم ممالک کا دورہ کیا اور پاکستان کے لیے اُن کی یقینی حمایت حاصل کی۔ اندرون ملک انہوں نے حزب اختلاف کے راہنماؤں، صنعتی کارکنوں، طلباء، اساتذہ، وکلاء، صحافیوں، مذہبی راہنماؤں اور ملٹری کمانڈروں سے مشاورت کی۔ اُن سب نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کے لیے اُن کی بھرپور حمایت کی لہٰذا وہ نہ صرف اپنے ملک کے مختلف طبقات کے واحد ترجمان تھے بلکہ خطے کے اہم مسلم ممالک کی ترجمانی بھی کر رہے تھے۔ یوں پاکستان کی اضافی قوت بھارت کے ہم پلہ ہوگئی تھی۔ مذاکرات مسلسل جاری تھے۔ بعض اوقات سیاسی موسم خوشگوار ہو جاتا اور کبھی ابر آلود۔ بے نظیر کے لیے یہ صورت حال ''جذبات کا رولر کوسٹر'' تھی۔

اسی دوران جب سفارتی اور سیاسی پیش رفت جاری تھی، ایک اور عجیب واقعہ ظہور پذیر تھا۔ نوعمر بے نظیر، زندگی میں پہلی مرتبہ میڈیا اور عوام کی توجہ کا مرکز بن رہی تھیں۔ ''جب بھی میں 'ہما چل بھون' (برطانوی راج میں پنجاب کے گورنروں کی سابقہ رہائش گاہ) سے نکلتی لوگ گلیوں میں قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے دیکھتے۔'' بے نظیر بتاتی ہیں، وہ جہاں بھی جاتیں، پُرجوش عوام اور صحافی اُن کا تعاقب کرتے۔ بھارتی حکومت نے اُن کی سرکاری مصروفیات علیٰحدہ سے ترتیب دے رکھی تھیں جن میں گڑیوں کا عجائب گھر، دستکاری مرکز، ٹن فروٹ فیکٹری اور ایک کانوینٹ میں رقص کے پروگرام میں شرکت شامل تھے۔

''جب میں 'مال' پر جاتی جہاں کبھی تاج برطانیہ کے افسران اپنی بیویوں کے ہمراہ چہل قدمی کیا کرتے تھے، اتنا زیادہ ہجوم اکٹھا ہو جاتا کہ ٹریفک روکنا پڑتی۔'' اس عوامی توجہ اور میڈیا کی چکاچوند نے انہیں بے زار کر دیا۔ بھارتی اخبارات اُن کی تصاویر اور خبروں سے بھرے ہوتے۔

اپنی آمد والے دن کی شام کو وہ چند کتب خریدنے 'مال' پر گئیں۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گئیں کہ شملہ کے ٹھنڈے موسم میں اُن کی قیام گاہ سے باہر بہت سے صحافی اور پریس فوٹو گرافرز انتظار میں کھڑے تھے۔ جیسے ہی وہ روانہ ہوئیں، وہ اُن کے پیچھے لپکے۔ کتابوں کی دکان پر ایک اور حیرانی اُن کی منتظر تھی۔ ''یہ میرے لیے اچنبھے کا باعث تھا کہ جب میں کتابوں کی دکان میں گئی اور دیکھا کہ وہاں مشرقی پاکستان کی صورت حال پر شائع شدہ کتابیں موجود تھیں۔ میں نے سوچا یہ لوگ لکھنے میں کتنے مستعد ہیں کہ ابھی حال ہی میں جنگ ختم ہوئی ہے اور اس پر کتب ابھی سے موجود ہیں؟ اتنے کم عرصے میں یہ اتنا زیادہ مواد کیسے اکٹھا کر لیتے ہیں؟''

جیسے ہی انہوں نے خریداری شروع کی، کیمروں کی فلیش نے جھماکے شروع کر دیئے اور اُن کی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

معمول کی مصروفیت اگلے روز کے اخبار کی خبر بن گئی۔ یونائیٹڈ پریس آف انڈیا نے یہ کہانی اس سرخی کے ساتھ شائع کی۔ ''بے نظیر خریداری کرتی ہیں۔ عوام نے پذیرائی کی۔''

خبر میں بتایا گیا!

شملہ جون 28: آج مس بے نظیر بھٹو نے خریداری کی جبکہ اُن کے والد صدر بھٹو، مسز اندرا گاندھی کے ساتھ بات چیت کرتے رہے۔ 18 سالہ بے نظیر بھٹو 'مال' پر واقع جدید شاپنگ سنٹر گئیں اور تین کتابیں خریدیں۔ جب وہ بازار سے گزر رہی تھیں تو وہاں پر موجود لوگوں نے اُن کی پذیرائی کی۔

اُن کی کوریج محض علاقائی پریس تک محدود نہیں تھی۔ ''ٹریبیون'' نے انہیں نمایاں جگہ دی اور کہا ''جدید طرز کے ملبوسات پہننے کے باوجود بے نظیر بھٹو کے اطوار خالصتاً مشرقی تھے۔ اُونچی آواز میں گفتگو نہ کرنا اور نہ ہی منہ کھول کر قہقہے لگاتیں تاہم اُن کی آنکھوں اور ہونٹوں سے خوشگوار مسکراہٹ مترشح ہوتی۔ وہ بڑی مؤدب رہتیں مگر تیز مشاہدے کی مالک اور انتہائی سمجھدار!'' ہما چل گورنمنٹ ایمپوریم میں اُن کی آمد کے بارے میں 'ٹریبیون' نے لکھا کہ ''وہ ایمپوریم سے باہر نکلتے ہی سیڑھیوں پر کھڑی ہوگئیں اور وہاں موجود جم غفیر کی پذیرائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر کار میں بیٹھ گئیں۔''

الیکٹرانک میڈیا بھی پیچھے نہیں رہا۔ آل انڈیا ریڈیو نے اُن کا انٹرویو نشر کیا جو اگلے روز کے اخبارات کی خبروں کا موضوع رہا۔ روزنامہ ''ڈان'' نے اپنی یکم جولائی کی اشاعت میں اس سرخی کے ساتھ خبر جاری کی ''بے نظیر بھارتی عوام کے دوستانہ رویے سے متاثر ہوئیں''۔

خبر میں بتایا گیا!

شملہ جون 30: مس بے نظیر بھٹو نے کہا ہے کہ وہ بھارتی عوام کی محبت اور دوستانہ احساسات سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ وہ آج شام آل انڈیا ریڈیو کو انٹرویو دے رہی تھیں۔ انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ بات چیت کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ بھارتی عوام پاکستان کے ساتھ دوستانہ مراسم کے خواہش مند ہیں۔ صدر بھٹو کی 18 سالہ سادہ رو بیٹی، بے نظیر بھٹو کی تہذیب اور اطوار کی بھارتی پریس نے بھرپور تعریف کی ہے۔ آج انہوں نے شملہ میں ایک اور بھرپور دن گزارا۔ انہوں نے جسمانی کرتب کا مظاہرہ اور ایک اوپیرا دیکھا۔

''میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ مجھے ایسی توجہ ملی؟'' وہ اپنے آپ سے سوال کرتیں۔ بھارت میں انہیں خوش آمدید کہنے والے خطوط اور ٹیلی گراموں کے انبار لگ گئے حتیٰ کہ ایک خط میں اُن کے والد کو مشورہ دیا گیا تھا کہ انہیں (بے نظیر) بھارت میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دیا جائے۔

''تم نے بھارتی عوام کے دل چرا لیے ہیں''۔ اُن کے والد انہیں چھیڑتے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''نہیں پاپا، یہ ممکن نہیں،'' وہ احتجاجاً جواب دیتیں۔

تاہم اُن کے شفیق والد انہیں یہ بتانے سے باز نہیں آئے کہ وہ بھارت میں خود اُن سے زیادہ مشہور ہوگئی تھیں۔

اسی دوران کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ دونوں ممالک کے مابین سنجیدہ مذاکرات جاری تھے۔ بیشتر مسائل پر بھارت کے غیر لچک دار رویے کی وجہ سے پیش رفت دشوار ہو رہی تھی۔ تاہم صدر بھٹو کی زیر قیادت پاکستان، بھارتی استعماریت کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ مذاکرات کے ڈیڈ لاک کے چوتھے روز اُن کے والد نے انہیں سامان باندھنے کو کہہ دیا کیونکہ وہ بھارت کے تجویز کردہ معاہدے کو تسلیم کرنے کے بجائے بغیر معاہدہ کیے واپس جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ''معاہدہ کیے بغیر،'' متفکر بے نظیر نے باپ سے پوچھا۔ ''ہاں! بغیر کوئی معاہدہ کیے، اُن کے والد نے جواب دیا۔ ''میں بھارت کی طرف سے کسی زبردستی کے معاہدے کے بجائے پاکستان بغیر کوئی معاہدہ کیے جاؤں گا۔ بھارتی یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی معاہدے کے بغیر واپس نہیں جا سکتا اور بالآخر اُن کا مطالبہ مان لوں گا لیکن میں اُن کی خام خیالی کو چیلنج کر رہا ہوں۔ میں پاکستان میں موہومیت کا سامنا کر لوں گا لیکن ایسا معاہدہ نہیں کروں گا جس میں ہمارے ملک کا سودا ہوتا ہو۔''

دوپہر کو صدر بھٹو نے اپنے وزیر خارجہ عزیز احمد کو ہدایات دے دیں کہ بھارتیوں کو باضابطہ طور پر آگاہ کر دیں کہ پاکستانی وفد مذاکرات چھوڑ کر واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ بھارتی سفارت کار، جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ پاکستان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اُن کی شرائط مان لے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ واقعات ایسا رُخ اختیار کریں گے۔ مذاکرات کی ناکامی نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت کے لیے بھی تازیانہ تھا۔

غروب آفتاب سے کچھ پہلے اُن کے والد کو چائے پر مسز گاندھی سے ملنا تھا۔ مایوس بے نظیر اپنی خواب گاہ کے فرش پر بیٹھی تھی کہ اُن کے والد اچانک راہ داری میں نمودار ہوئے۔ ''کسی کو بتانا مت۔'' آنکھوں میں ایک نئی چمک لیے انہوں نے بے نظیر کو آگاہ کیا۔ ''میں مسز گاندھی سے اسی رسمی ملاقات میں آخری مرتبہ پھر کوشش کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ بے نظیر کو ایک طویل انتظار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ انتظار کی تلخ گھڑیاں اختتام کو پہنچیں اور وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے واپس لوٹے۔ انہوں نے مسز گاندھی کو باور کرا دیا تھا کہ مذاکرات کی ناکامی نہ صرف پاکستان بلکہ دونوں فریقین کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ سیاست دان اور بھارتی راہنما ہونے کے ناطے مسز اندرا گاندھی بھی جنوبی ایشیا میں کشیدگی کے لیے برابر کی ذمہ دار ہوں گی۔ یہ منطق

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بہت احسن طور سے بیان کی گئی اور بھارتی حکام اختتامی عشائیے کے بعد مذاکرات کا دور دوبارہ شروع کرنے پر رضامند ہوگئے، جو پاکستانی مندوبین نے اپنے بھارتی میزبانوں کے اعزاز میں اس رات 'ہما چل بھون' میں ترتیب دیا تھا۔

''ہم سب نے کھانے کی دعوت، تقاریر اور خوش گپیاں کیسے گزاریں، یہ میں کبھی نہ جان سکوں گی۔ اس مرتبہ میں مسز گاندھی کو ٹک ٹک دیکھتی رہی مگر اُن کے چہرے سے کچھ نہ پڑھ سکی،۔ بے نظیر بتاتی ہیں۔

عشائیہ ختم ہونے پر صدر بھٹو اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ملحقہ نشست گاہ میں چلے گئے جبکہ مذاکراتی ٹیم بلیئرڈ روم میں تشریف فرما ہوئی جو وہاں سب سے بڑا کمرہ تھا۔ جب بھی کسی مرحلے پر اتفاق رائے یا اختلاف ہوتا تو مذاکراتی ٹیم دونوں راہنماؤں سے رُجوع کرتی تاکہ اُن سے ہاں یا ناں میں عندلیہ لیا جائے۔ دونوں وفود کے مابین ہر پوائنٹ پر تبادلہ خیالات ہوا۔ ہر 'کومے' اور 'فل سٹاپ' پر باہم مشاورت ہوتی اور بالآخر ایک معاہدہ تشکیل پا کر 3 جولائی کی اختتامی گھڑیوں میں دستخط ہوگئے۔

مہمان وفد کی جانب سے دیئے گئے اس رسمی عشائیے کے دوران معاہدے کا طے پانا اتنا غیر متوقع تھا کہ 'ہما چل بھون' میں الیکٹرک ٹائپ رائٹر موجود نہ تھا اور مسودہ ٹائپ کرنے کے لیے اسے منگوانا پڑا۔

جس خاص کاغذ پر مسودہ ٹائپ کیا جانا تھا، وہ بھی موجود نہ تھا اور منگوانا پڑا۔ پھر مسز اندرا گاندھی کی سرکاری مہر 17 میل دور، اُن کی رہائش گاہ سے منگوائی گئی تاہم دونوں قائدین کے عزم نے اُن دشواریوں کے باوجود معاہدے کو ممکن کر دکھایا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدے کا دیباچہ ایسے تاریخ ساز لمحات میں طے پایا کہ جن سے برصغیر میں برطانوی راج کے خاتمے کے بعد، طویل ترین امن کا دور شروع ہونا تھا۔ دیباچے میں کہا گیا:

> ''بھارتی حکومت اور حکومت پاکستان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں ممالک تنازعہ اور مڈبھیڑ ترک کر دیں کہ جس سے ان کے تعلقات کو گزند پہنچی اور دوستانہ برابری کے تعلقات کے لیے کام کریں نیز برصغیر میں پائیدار امن کے قیام کی راہ ہموار کریں تاکہ دونوں ممالک اپنے وسائل اور توانائیاں اپنے عوام کی فلاح اور ترقی کے فروغ میں صرف کر سکیں۔''

شرائط میں یہ بھی تھا کہ ہر دو فریق ممالک کی جانب سے بین الاقوامی تسلیم شدہ سرحد سے ملحقہ قبضے میں لیے گئے علاقے خالی کر دیئے جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے دو اہم صوبوں،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سندھ اور پنجاب کا 5 ہزار مربع میل سے زائد علاقہ بھارتی افواج کے قبضے سے آزاد ہو جائے گا اور اس طرح لاکھوں بے گھر شہری اپنے گھروں میں واپس جا سکیں گے۔ دوسری جانب پاکستان کو محض 70 مربع میل کا علاقہ خالی کرنا تھا جو اس کی فوج نے دوران جنگ قبضہ کیا تھا۔ پاکستان کے دو اہم مقاصد یعنی مقبوضہ علاقوں اور جنگی قیدیوں کی واپسی میں سے ایک مقصد مکمل طور پر پورا ہو گیا۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے بارے میں معاہدے میں اگرچہ ذکر نہیں تھا تاہم بھارت، بنگلہ دیش کی نئی حکومت کے قیام کی شرط پر جنگی قیدیوں کی واپسی پر رسمی طور پر رضامند ہو گیا۔ بنگلہ دیش کی نئی حکومت کا قیام اس وقت عمل میں آیا کہ جب پاکستان نے بنگلہ دیش کے وجود کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔

لیکن اس موقع پر بے نظیر بھٹو بہت پریشان ہوئیں کہ بھارتی جنگی کیمپوں میں محصور اُن کے ملک کی فوج کے سپاہی فوری طور پر رہائی نہ پا سکے۔ جب اُن کے والد معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد اُوپر آئے تو یہ موضوع باپ بیٹی کے درمیان زیر بحث رہا۔ ''مسز گاندھی اس بات پر رضامند تھیں کہ یا تو جنگی قیدی واپس کر دیئے جائیں یا پھر علاقہ، تمہارا کیا خیال ہے میں نے علاقے کو ترجیح کیوں دی؟'' اُن کے والد نے استفسار کیا۔

''میں واقعتاً نہیں جانتی پاپا۔ پاکستان کے عوام کو زیادہ خوشی ہوتی اگر قیدی رہائی پاتے،'' متذبذب بے نظیر نے جواب دیا۔

''اور وہ آزاد ہو جائیں گے۔'' اُن کے والد نے یقین دہانی کرائی۔ قیدی ایک انسانی مسئلہ ہیں۔ اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اُن کی تعداد 93,000 ہے۔ انہیں غیر معینہ مدت تک رکھنا بھارت کے لیے غیر انسانی فعل ہو گا اور انہیں پاس رکھنا، کھلانا بھی ایک مسئلہ ہو گا۔ دوسری طرف علاقہ ایک انسانی مسئلہ نہیں۔ علاقے کو اپنایا جا سکتا ہے لیکن قیدیوں کو نہیں۔ عرب ابھی تک 1967ء کی جنگ میں کھویا ہوا علاقہ واپس نہیں لے سکے۔ لیکن علاقے پر قبضہ عالمی توجہ حاصل نہیں کر پاتا جیسا کہ قیدیوں کو حاصل ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اسے سفارتی داؤ پیچ سے آگاہ کیا۔

اگلے روز وفد کو واپس پاکستان روانہ ہونا تھا۔ بے نظیر، بمبئی کے قریب واقع ایک خوبصورت شہر 'پونا' جانا چاہتی تھیں جہاں اُن کی ہم نام خالہ مدفون تھیں۔ وہ بمبئی بھی جانا چاہتی تھیں جہاں اُن کی نانی 'فاطمہ اصفہانی' مدفون تھیں اور جہاں ان کے والد نے اپنا عنفوان شباب گزارا اور جہاں تقسیم سے پہلے کے ایام میں اُن کے دادا سر شاہنواز بھٹو نے اپنی سیاسی زندگی کا اہم ترین دور گزارا تاہم برصغیر کی گرما گرم سیاسی فضا نے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ اپنے والد اور سرکاری وفد کے دیگر اراکین کے ہمراہ شملہ سے چندی گڑھ بذریعہ ہیلی کاپٹر پرواز کر گئیں اور وہاں سے پھر پی آئی اے کی خصوصی پرواز سے لاہور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

روانہ ہوئیں۔

انہوں نے واپسی پر لاہور شہر کو انتہائی پُر جوش پایا۔ جب ان کا طیارہ لاہور کے ہوائی اڈے پر اُترا تو لاہور کے عوام نے شاندار خیر مقدم کیا کیونکہ انہیں فخر تھا کہ اُن کے قائد نے بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ مذاکرات کے دوران اُصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ صدر بھٹو نے قومی اسمبلی کا خصوصی اجلاس طلب کر لیا تاکہ ان کے بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی بحث کے بعد منظوری ہو سکے۔ معاہدے کے ایک ہفتہ بعد پاکستان کی قومی اسمبلی نے بلا ترمیم اس معاہدے کی توثیق کر دی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھٹو شہید کا بے نظیر کے نام آخری خط

میری سب سے پیاری بیٹی

ایک سزا یافتہ قیدی کس طرح اپنی خوبصورت اور ذہین بیٹی کو اس کے یومِ پیدائش پر تہنیت کا خط لکھ سکتا ہے جبکہ اس کی بیٹی (جو خود بھی مقید ہے اور جانتی ہے کہ اس کی والدہ بھی اسی کی طرح تکلیف میں مبتلا ہے) اس کی جان بچانے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہ رابطہ سے زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ محبت و ہمدردی کا پیغام کس طرح ایک جیل سے دوسری جیل اور ایک زنجیر سے دوسری زنجیر تک پہنچ سکتا ہے؟

نہرو بھی اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے۔ نہرو نے بھی جیل سے اُسے اُس کے یومِ پیدائش پر تہنیت کا پیغام بھیجا تھا۔ میں اس امر کا تذکرہ تم سے پہلے یا دوسرے خط میں کر چکا ہوں جو میں نے تمہیں لکھا تھا اور دوسرے تین خطوط 1964ء میں جکارتہ سے لکھے تھے جب تم چھوٹی بچی تھیں اور مری میں کانوینٹ میں زیرِ تعلیم تھیں۔ صنم، تو اور بھی چھوٹی تھی۔ میں نے اس طویل خط میں ذکر کیا تھا کہ نہرو نے کس طرح تاریخ عالم کے بارے میں اپنی بیٹی اندرا کو خطوط لکھے تھے۔ بعد میں یہ خطوط ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیئے گئے تھے اور کتاب کا نام ''گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری'' (عالمی تاریخ کے مناظر) رکھا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلا خط اندو (اندرا) کے یومِ پیدائش پر ایک تہنیتی خط تھا۔ وہ اندرا کو پیار سے ''اندو'' کہتے تھے، جب وہ تیرہ سال کی تھی۔ جس وقت تک میں 23 سال کا ہوا تھا میں نے ''گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری'' کو چار بار پڑھا تھا۔ نہرو ہمارے زمانہ کے انتہائی صاف ستھری انگریزی لکھنے والوں میں سے تھے۔ اُن کے الفاظ میں ایک قسم کا فیضان اور ترنم ہوتا تھا۔

جکارتہ سے 14 سال پہلے میں نے جو خط لکھا تھا اس میں تمہیں متنبہ کر دیا تھا کہ میں نہرو کی نقالی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے اُن کی نقالی اُس وقت بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی اب میں اُن کی پیروی کر رہا ہوں۔ بے شک اس وقت میں بھی جیل میں ہوں اور وہ بھی اُس وقت جیل ہی میں تھے جب انہوں نے اپنی بیٹی کو خطوط لکھے تھے۔ یہ عنصر میرے اور نہرو کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ دوسرا عنصر جو میرے اور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نہرو کے درمیان قدرِ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ میں یہ خط اپنی بیٹی کو اُس کی پیدائش کی سالگرہ پر لکھ رہا ہوں۔ لیکن میرے اور نہرو کے درمیان مماثلت بہت زیادہ نہیں ہے۔ نہرو کو جیل میں غیر ملکی حکمرانوں نے ایک جگہ عزت و وقار کے ساتھ رکھا تھا۔ انہوں نے آزادی کے حصول کے لیے جنگ کی تھی۔ وہ بھارتی عوام کے ایک عظیم لیڈر تھے۔ انہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی اور بڑے عزت و وقار کے مالک تھے۔ وہ کوئی گھٹیا قسم کے قیدی نہیں تھے اور نہ ہی سرکاری رقوم کے غبن کرنے والے تھے۔ وہ لاڑکانہ کے گاؤں کی کوئی غیر اہم شخصیت نہیں تھے جو حکمران ٹولہ کے ہاتھوں موت کی کوٹھڑی میں گھل رہے تھے۔ میرے اور نہرو کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔ اُن کی بیٹی ایک تیرہ سالہ چھوٹی سی لڑکی تھی جس نے اُس زمانہ کی سیاست میں اپنا کردار ادا کیا تھا اور اُس ادارہ کو منظم کیا تھا جس کو اُس نے ''منکی بریگیڈز'' (بندروں کا بریگیڈ) کا نام دیا تھا۔ اس وقت تک اُن کی بیٹی سیاست کی آگ میں سے ہو کر نہیں گزری تھی تمہارے گرد آگ جلا دی گئی ہے۔

اور یہ آگ ایک بے رحم جنتا نے جلائی ہے۔ یہ آگ تباہ کن اور ہولناک ہے۔ اس لیے بہت زیادہ فرق ہے۔ دونوں ناقابلِ موازنہ ہیں۔ اگر کوئی مماثلت ہے تو وہ اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اندرا گاندھی کی طرح تم بھی تاریخ سازی کر رہی ہو۔ میں اندرا گاندھی سے اچھی طرح واقف ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں حالانکہ میں اُن کے والد کو زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا جیسا کہ تمہارے دادا اس کے دادا کو اس سے بہتر طور پر جانتے تھے جس قدر کہ میں اس کے والد کو جانتا تھا۔ میں اُن کی خوبیوں اور اوصاف کا بہت احترام کرتا ہوں اور میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں اُن کے سب سے بڑے مداحوں میں سے نہیں ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بھارت کی وزیرِ اعظم ہوئیں اور گیارہ سال تک اس اعلیٰ عہدہ پر فائز رہیں۔ وہ بھارت کی دوبارہ بھی وزیرِ اعظم ہو سکتی ہیں۔ انہیں ''دیوی'' کا خطاب دیا گیا جب انہوں نے مشرقی پاکستان پر قبضہ جمایا۔ ان تمام باتوں کا علم رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تذبذب نہیں ہے کہ میری بیٹی جواہر لال نہرو کی بیٹی کے مقابلہ میں جس کو بھارت کی دیوی کہا جاتا ہے کہیں بہتر ہے۔ میں کوئی جذباتی یا ذاتی قسم کا اندازہ نہیں لگا رہا ہوں۔ یہ میری دیانتدارانہ رائے ہے۔

تم میں اور اندرا گاندھی میں ایک شے قدرِ مشترک ہے کہ تم دونوں یکساں طور پر بہادر ہو۔ تم دونوں پختہ فولاد کی بنی ہوئی ہو، یعنی تم دونوں کی قوتِ ارادی فولادی نوعیت کی ہے۔ لیکن تمہاری صلاحیت و ذہانت تمہیں کہاں لے جائے گی؟ عام طور پر تو یہ صلاحیت و ذہانت تمہیں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے گی۔ لیکن ہم ایک ایسے معاشرہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ذہانت و صلاحیت ایک نقص شمار ہوتی ہے اور دم گھونٹنے والی معمولی قسم کی ذہانت ایک اثاثہ شمار کی جاتی ہے۔ سوائے تمہارے والد کے،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

قائداعظم اور شاہد سہروردی کے اس ملک پر حکومت شعبدہ بازوں اور کپتانوں نے کی ہے۔ شاید اس صورت حال میں تبدیلی پیدا ہو جائے، اگر کوئی جنگ جو قسم کا نوجوان جدو جہد کا آغاز کرے۔ اگر حالات تبدیل نہیں ہوتے ہیں تو پھر تبدیل کرنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔ یا تو اقتدار عوام کو حاصل ہوگا یا پھر ہر شے تباہ و برباد ہو جائے گی۔

تمہارے دادا نے مجھے فخر کی سیاست سکھائی۔ تمہاری دادی نے مجھے غربت کی سیاست کا سبق دیا۔ میں ان دونوں باتوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں تا کہ ان دونوں کا انضمام ہو سکے۔ پیاری بیٹی میں تمہیں صرف ایک پیغام دیتا ہوں۔ یہ پیغام آنے والے دن کا پیغام ہے اور تاریخ کا پیغام ہے۔ صرف عوام پر یقین کرو۔ ان کی نجات و مساوات کے لیے کام کرو۔ اللہ تعالیٰ کی جنت تمہاری والدہ کے قدموں تلے ہے۔ سیاست کی جنت عوام کے قدموں تلے ہے۔ برصغیر کی پبلک زندگی میں کچھ کامیابیاں میرے کریڈٹ پر ہیں لیکن میری یادداشت میں صرف وہ کامیابیاں انعام و اکرام کی مستحق ہیں جن کے ذریعہ مصیبت زدہ عوام کے تھکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹیں بکھر گئی ہیں اور جن کے باعث کسی دیہاتی کی غم ناک آنکھ میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کے عظیم لیڈروں نے جو خراجِ تحسین مجھے پیش کیا ہے اُن کے مقابلہ میں اِس موت کی کال کوٹھری میں میں زیادہ فخر و اطمینان کے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک بیوہ کے الفاظ یاد کرتا ہوں جس نے مجھ سے کہا تھا کہ "صد کوواریاں سولر سائیں"۔ اُس نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب میں نے اُس کے کسان بیٹے کو ایک غیر ملکی وظیفہ پر باہر بھیج دیا تھا۔

بڑے آدمیوں کے نزدیک تو یہ چھوٹی باتیں ہیں لیکن میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لیے یہ حقیقتاً بڑی باتیں ہیں۔ تم بڑی نہیں ہو سکتی ہو، جب تک کہ تم زمین کو چومنے کے لیے تیار نہ ہو یعنی عاجزی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ تم زمین کا دفاع نہیں کر سکتی جب تک کہ تم زمین کی خوشبو سے واقف نہ ہو۔ میں اپنی زمین کی خوشبو سے واقف ہوں۔ نظریات، اُصول، تحریریں تاریخ کے دروازہ سے باہر ہی رہتی ہیں۔ غالب عنصر عوام کی تمنائیں ہیں اور اُن کے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہے۔ جب اس راگ یا موسیقی کے معنی سمجھ لیے جاتے ہیں تو منزل کے نشان واضح ہو جاتے ہیں اور اُصول و نظریات کو پیر لگ جاتے ہیں کہ وہ وقت پر اس راگ کی شان کو بڑھانے کے لیے آموجود ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں عملیّت کے نظریہ کا پرچار کر رہا ہوں۔ عملیّت کے نظریہ میں تو بہت کچھ موقع و محل کے لحاظ سے آسانی ہوتی ہے۔ میں مسئلے کے اصل سبب کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چیلنج کی اصل وجہ اور جدو جہد کے اصل سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں اس جیل کی کوٹھڑی سے تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں جس میں سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں نکال

سکتا؟ میں تمہیں عوام کا ہاتھ تحفہ میں دیتا ہوں۔ میں تمہارے لیے کیا تقریب منعقد کر سکتا ہوں؟ میں تمہیں ایک مشہور نام اور ایک مشہور یادداشت کی تقریب کا تحفہ دیتا ہوں۔ تم سب سے قدیم تہذیب کی وارث ہو۔ اس قدیم تہذیب کو انتہائی ترقی یافتہ اور انتہائی طاقتور بنانے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرو۔ ترقی یافتہ اور طاقتور سے میری مراد یہ نہیں کہ معاشرہ انتہائی ڈراؤنا ہو جائے۔ ایک خوفزدہ کرنے والا معاشرہ ایک مہذب معاشرہ نہیں ہوتا۔ مہذب کے معنی میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور معاشرہ وہ ہوتا ہے جس نے قوم کے خصوصی جذبہ کی شناخت کر لی ہو۔ جس نے ماضی و حال سے، مذہب اور سائنس سے، جدیدیت اور تصوف سے، مادیت اور روحانیت سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ ایسا معاشرہ ہیجان و خلفشار سے پاک ہوتا ہے اور کلچر سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس قسم کا معاشرہ شعبدہ بازی کے فارمولوں اور دھوکہ بازی کے ذریعہ معرضِ وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ وہ روحانی یا آفاقی اقدار، تلاش کی گہرائی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی تخلیق ہونی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ مارکسٹ معاشرہ ہو۔ مارکسٹ معاشرہ نے خود اپنا طبقاتی ڈھانچہ تخلیق کر لیا ہے۔ یورپ کے مارکسٹوں نے کمیونزم سے انحراف کیا ہے اور انہوں نے ایسا موجودہ طبقاتی ڈھانچہ سے سمجھوتہ کر کے کیا ہے۔ ورنہ ایزیکو برلنگر "تاریخی سمجھوتہ" کی کوشش نہ کرتا جو دراصل بالآخر ایلڈ مورو کے قتل کا باعث ہوا۔

جب میں وزیرِ خارجہ تھا تو ایک جرمن سفارت کار نے مجھ سے اسلام آباد میں 1965ء میں کہا تھا کہ افریقہ ایک برف کی چادر کے مانند ہے جس پر تیل کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ اس حالت میں طویل عرصہ تک رہے گا۔ اس کے ایسا کہنے سے میں متاثر ہوا تھا۔ میرے جیسا دیسی آدمی ایک ایسے سفارت کار کے تجزیہ پر اعتراض یا تنقید نہیں کر سکتا تھا جس کا تعلق آقاؤں کی نسل سے تھا اور پھر وہ تو ایسے مشہور سائنس دان کا بھائی تھا جو میزائلز بنانے کے لیے امریکہ منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں اُس کے تجزیہ کا احترام کرتا ہوں لیکن میری منکسرانہ رائے میں افریقہ گو کہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے، اُسے نظر انداز کیا گیا ہے اور اُس کا تمسخر اُڑایا گیا ہے لیکن وہ دو عشروں سے کم عرصہ میں دنیا کے اسٹیج کے مرکز پر نمودار ہوگا یعنی مرکزی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ ایسا ہی ہوا ہے۔ لیکن جو جدو جہد افریقہ میں جاری ہے وہ بنیادی طور پر کمیونزم اور آزادی کے درمیان جدو جہد نہیں ہے۔ یہ جدو جہد اس وسیع و عریض اور مشہور و معروف براعظم کے وسائل اور خام مال کے لیے ہے۔ فرق یہ ہے کہ جدو جہد کرنے والی ایک پارٹی نے افریقہ کے عوام کی تمناؤں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے۔ دوسری پارٹی ایسا کرنے میں ناکام رہی ہے باوجود اس کے کہ اینڈریو ینگ نے جرأت مندانہ لیکن ناکام کوششیں کی ہیں۔ ابتدا میں تو میں اینڈریو ینگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس نے افریقہ کے مسئلے کی

جزئیات کو سمجھ لیا ہے اور ایسا دوسری پارٹی کے نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ لیکن اینڈریو ینگ تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یا تو بالکل نکال باہر کیا جائے گا یا پھر غیر مؤثر کر دیا جائے گا اور ایسا اُس حکومت کی طرف سے ہوگا جو فرانس کے بوربنوں کی طرح کچھ بھی سیکھنے سے انکاری ہے۔

اس سلسلہ میں ایشیا کے حوالہ سے سیلگ ہیریسن نے حال ہی میں ایک اور محققانہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ''دی وائڈ ینگ گلف'' (بڑھتی ہوئی خلیج) ہے۔ یہ کتاب ایشیائی قوم پرستی کے موضوع پر ہے اور اس میں اس ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے کہ امریکہ وسیع تر تناظر میں اس صورت حال کو سمجھے۔ پاکستان سے متعلق باب میں کتاب کے صفحہ 273 پر اس نے کہا ہے کہ ''ذوالفقار علی بھٹو نے (جنہوں نے بعد میں وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے پیکنگ کے ساتھ قریبی روابط کا آغاز کیا) نومبر 1962ء سے ہی پاکستان کو چین کے خلاف تصورات سے الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب انہوں نے قومی اسمبلی سے کہا تھا کہ پیکنگ کے ساتھ پاکستان کی دوستی ایک آزاد عنصر ہے اور یہ کہ اگر کشمیر کا تنازعہ صلح صفائی کے ساتھ طے بھی ہو جاتا ہے تب بھی ہم چین کے خلاف بھارت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ برصغیر ہند کے واسطے مشترکہ دفاع کا مغربی مقصد ایک مخالف چین کے تصور پر مبنی تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے لیے اس مسئلے کا حل چین کے ساتھ ہماری دوستی کو خطرہ میں ڈالے بغیر ہمارے درمیان ایک قسم کی مساوات کو دریافت کرنا ہے۔ اگر ہم دونوں صحیح پالیسی پر عمل کریں تو مشترکہ دفاع کا سوال غیر متعلق ہو جائے گا۔ اس کے فوراً بعد ایک انٹرویو میں (راولپنڈی 10 دسمبر 1962ء) بھٹو نے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ چین کے بارے میں امریکی مفاد کی شناخت کی جو اُن کی پالیسیوں میں نمایاں رہی اور جس کی توضیح بعد کے برسوں میں وہ مجھ سے اکثر اوقات کرتے تھے۔ (بھٹو نے 20 دسمبر 1967ء کو لاڑکانہ میں ایک انٹرویو کے دوران چین اور امریکہ کے درمیان دینانت کی توقع کی ازسرِ نو تصدیق کی اور بعد میں ''مِتھ آف انڈی پینڈینس'' (آزادئ موہوم) صفحہ 21 پر ایسا کیا۔) انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ قلیل المیعاد لحاظ سے تو چین اور پاکستان کے تعلقات پاک امریکہ تعلقات کے لیے نقصان دہ ہوں گے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ چین اور امریکہ اپنے اختلافات کو ختم کر دیں گے اور غالباً ایسا 1970ء کے عشرہ کے شروع میں ہوگا۔ بہرحال چین، پاکستان کی دوستی کا اس لیے حق دار ہے کہ وہ ایشیائی خود داری اور خود اعتمادی کا چیمپئن ہے جس کو پاکستان میں وسیع پیمانہ پر سراہا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ منطق نہ صرف بذاتِ خود توجہ کی مستحق ہے بلکہ اس میں مزید کشش و جاذبیت پیدا ہو جائے گی۔ اگر بھارت اور چین کی رقابت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں لازمی طور پر پاکستان اور چین کے درمیان سلامتی کے مشترکہ مفادات پیدا ہو جائیں گے۔ بھٹو نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ بھارت اور چین کے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تنازعہ میں شدت پیدا ہوگی اور چین اور پاکستان کا تعلق جلد ہی لازمی طور پر بھارتی تعلق کے اثر سے مستحکم ہوا جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ پیکنگ نے نئی دہلی کو 1965ء کی جنگ کے دوران الٹی میٹم دیا اور پاکستان کو کافی فوجی امداد دی۔''

اس سے پہلے اپنی کتاب کے صفحہ 27 پر سیلگ ہیریسن نے لکھا ہے کہ ''مسلم لیگ کے لیڈروں نے جو ابتدا میں پاکستان کی تخلیق کے ذمہ دار تھے اپنی اپیل کی بنیاد صرف مذہب پر رکھی تھی اس لیے کہ وہ تنگ نظر جاگیرداروں کے اقتصادی مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ بعد کی حکومتوں نے زیادہ تر سماجی انصاف کو نظر انداز کیا، یہاں تک کہ ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش جنگ کے بعد جو کچھ بچا تھا اس کو بچانے کی کوشش کی۔''

جب میں پاکستان کی قسمت کا نگراں تھا تو 1975ء کے وسط میں میں نے اُن خاص قوتوں کے بارے میں ابتدائی تبصرہ کیا تھا جو عالمی سطح پر سرگرمِ عمل تھیں۔ پھر 1976ء اور 1977ء میں کئی مواقع پر میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ تین خوفناک قوتیں سرگرمِ عمل ہیں جو کبھی تو ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں کبھی ایک دوسرے سے تنازعہ کرتی ہیں، کبھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ محاذ آرائی کرتی ہیں۔ یہ قوتیں مذہب، کمیونزم اور نیشنلزم (وطنیت) ہیں۔ یہ تین نظریات افراد اور قوموں کے ذہن کو متاثر کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ بجائے اس کے کہ ہم چمک دار زرہ بکتر پہن کر کسی ایک نظریہ کے لیے جہاد کریں۔ یہ بات علاقائی، عالمی توازن کے حق میں ہے کہ ہم ان کے مشترکہ پوائنٹس (نکات) میں ہم آہنگی پیدا کریں اور تنازع اور ٹکراؤ والے نکات میں تلخی اور شدت پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔ میں نے مزید واضح کیا تھا کہ ہُنر تو یہ ہے کہ ایسا رول اس طرح ادا کیا جائے کہ اپنا نظریہ نہ تو کمزور ہو اور نہ ہی اس کے ساتھ وفاداری میں کوئی ردّوبدل یا سمجھوتہ کرنا پڑے۔ اس کا مطلب ''جیو اور جینے دو'' سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب سفید یا کالے رنگ کے مقابلہ میں بھورے رنگ پر زیادہ توجہ مبذول کرنا تھا۔ آپ براہِ راست یروشلم کی راہ اختیار نہیں کر سکتے اور وہاں محض اس لیے امن و سکون نہیں پا سکتے کہ وہ ایک مقدس شہر ہے۔ افریقہ کے مسئلے کو وہاں سی۔ 141 طیاروں کے ذریعہ چھاتہ بردار فوج اُتار کر حل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ماؤزے تنگ کی غالب خواہش ایک نئے انسان کی تخلیق تھی۔ ایک ایسے نئے چینی کی تخلیق تھی جو انقلاب کے پرچم کو ہمیشہ ہمیشہ بلند رکھے۔ سیاسی اُفق سے دوبارہ غائب ہو جانے والے تنگ سیاؤ پنگ اس قسم کا نیا انسان تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ انہوں نے اس

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

عظیم کام کو اس صدی کے آخر تک مکمل کرنے کا اپنے آپ کو پابند کیا ہے۔ جو لوگ آنے والی تباہی کے خوف سے مغلوب ہیں وہی لوگ اس تباہی کو لانے والے ہیں۔ جو لوگ موجودہ صورت حال کے ساتھ گھبراہٹ کے عالم میں چپکے ہوئے ہیں کہ جیسے وہ ناقابلِ تغیر ہے، وہی لوگ موجودہ صورت حال کی جلد تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ صورت حال میں ناقابلِ تصور باتیں پیدا ہو رہی ہیں اور کمپیوٹر والی یقینی صورت حال کم ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کس چیز کا سہارا لیتے ہیں؟ یا کس بات پر بھروسہ کرتے ہیں؟ میں عوام پر بھروسہ کرتا ہوں اور ان کے باطنی ردِعمل پر اعتماد کرتا ہوں۔ لوگ ہی رہنمائی کرتے ہیں اور لوگوں ہی کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ لیڈر کو عوام کی تمناؤں کا علم ہونا چاہیے اور اُن کی تمناؤں کی بنیاد پر عوام کو ایک جرأت مندانہ جہت عطا کرنی چاہیے۔ اس معاہدہ میں دھوکہ بازی سب سے زیادہ مہلک ہے۔

یہ پاکستان کے بارے میں خط نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھ دیتا جس کا عنوان ''کلمپسیز آف پاکستان ہسٹری'' (پاکستان کی تاریخ کے مناظر) ہوتا۔ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ قوم بدترین قسم کے بحران میں مبتلا ہوگئی ہے۔ وہ بقا اور شکست و ریخت کے درمیان سڑک کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد سے ہی بحران کے بعد بحران بڑی تیزی سے آتا رہا ہے۔ اس ملک کی تخلیق کی خاطر لاکھوں جانوں کو قربان ہونا پڑا تھا۔ پاکستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ محمد اقبال کا خواب اور قائداعظم محمد علی جناح کی تخلیق ہے۔ کیا خواب میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔ اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ اگلے چند سال میں یہ مسئلہ غالباً طے ہو جائے گا اور شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسا ہو جائے لیکن ایسا بغیر کشت و خون کے نہیں ہوگا۔ یہ عمل ناگزیر نہیں ہے۔ لیکن حکمران فوجی جنتا کی موجودہ پالیسیاں اس ملک کو اس افسوسناک صورت حال کی جانب دھکیل رہی ہیں جو ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ 9 جون 1978ء کو عوامی جمہوریہ چین کے نائب وزیراعظم ننگ سیاؤ پنگ نے کہا ہے کہ نسلِ انسانی تیسری عالمی جنگ کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ اگر عالمگیر جنگ کی خوفناک تباہی ہوتی ہے تو پاکستان کے مستقبل کا تعین باقی دنیا کے مستقبل کے تعین سے ہوگا۔

ایک وقت تھا کہ قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا تھا۔ بعد میں جب انہیں ہندو نیشنلزم کی تنگ نظر ذہنیت کا یقین ہو گیا جو سیاست اور اقتصادیات پر ہندو غلبہ پر مبنی تھی تو انہوں نے اقبال کے خواب کی تکمیل کی جانب توجہ مبذول کی اور ایسا غیر معمولی عزم کے ساتھ کیا۔ پاکستان کی تخلیق کی مزاحمت ایک ایسی پہاڑ کی چوٹی کی مانند تھی جو ناقابل رسائی ہو۔ یہ مزاحمت انڈین کانگریس کی طرف سے اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے کی گئی جن میں مودودی اور اُن کی جماعت اسلامی شامل تھی۔ گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ بھارت ماتا کی تقسیم کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ مسلم اکثریت والے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

صوبوں میں پاکستان کی مزاحمت سرخضر حیات خاں ٹوانہ کی طرف سے ہوئی جو پنجاب کے وزیراعلیٰ اور صوبہ میں مخصوص مفادات والے طبقات کے لیڈر تھے۔ بنگال میں یہ مزاحمت شیرِ بنگال فضل الحق کی پارہ صفت سیاست کے ذریعہ ہوئی۔ (مشکل یہ ہے کہ ہماری سیاست میں بہت سے شیر پیدا ہوتے ہیں لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو وہ بلیاں بن جاتے ہیں۔) سندھ میں پاکستان کی مزاحمت اللہ بخش کی طرف سے ہوئی لیکن وہ 1943ء میں قتل کر دیئے گئے اور جی ایم سید نے اُن کا چوغہ پہن لیا یعنی اُن کی پیروی شروع کر دی۔ صوبہ سرحد میں مزاحمت کی قیادت سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں نے کی اور یہاں تک تخلیق پاکستان کی مخالفت کی کہ صوبہ سرحد کی مستقبل میں وابستگی کے لیے ریفرنڈم منعقد کرانا پڑا۔ بلوچستان کے زیادہ تر بااثر سردار پاکستان کے حق میں نہیں تھے۔ اس معاملے کو طے کرنے کے لیے جو شاہی جرگہ منعقد ہوا تھا اس کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے بہت کچھ کام کرنا پڑا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ دو قومی نظریہ کے خلاف تھے۔

پھر پاکستان کس طرح عالم وجود میں آیا۔ مسلم عوام نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنے روایتی قسم کے لیڈروں کو مسترد کر دیا اور پاکستان اپنے خون میں رنگے ہوئے ہاتھوں کے ذریعہ حاصل کیا۔ انڈین کانگریس کی معاندانہ پالیسیوں نے اور انگریزوں کے منفی رویہ نے انہیں تخلیق پاکستان کے لیے مزید اُکسایا۔ یہ مسلم عوام کے عزم و جذبہ کی فتح تھی جن کی قیادت ایک جرأت مند اور بے باک لیڈر کر رہا تھا۔

قراردادِ پاکستان جو مسلم لیگ نے قائداعظم کی زیر صدارت لاہور میں 23 مارچ 1940ء کو منظور کی تھی اس کی دو خصوصیات تھیں:

(الف) اس نے برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریت والے صوبوں اور علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کے ایک وطن کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔

(ب) اس نے پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کو صوبائی خودمختاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اس جذباتی تموج کے زمانہ میں آئینی مسائل پر اور پاکستان کی سرحدوں کے بارے میں بہت کم توجہ مبذول کی گئی۔ ہر خواب دیکھنے والے نے اپنے خواب کی شاندار تعبیر پیش کی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جب تحریک پاکستان پر سورج غروب ہو چکا تھا اور طبل جنگ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تو صوبائی خودمختاری کے سوال نے اپنا سر اُٹھایا۔ بعد کے برسوں میں یہ ایک مرکزی مسئلہ بنا رہا۔

پاکستان کی سیاست کے اُلجھے ہوئے تانے بانے میں صوبائی خودمختاری کا مسئلہ شروع سے ہی ایک بنیادی مسئلہ بنا رہا ہے۔ آئین سازی کی پہلی کوشش جو بیسک پرنسپلز کمیٹی رپورٹ (بنیادی اُصولوں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کی کمیٹی رپورٹ) کے نام سے مشہور ہے اسی مسئلہ پر ناکامی کا شکار ہوگئی۔ میرا ارادہ اس موجودہ بحران کی شدت و اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اُن سیاسی غلطیوں کو گنانے کا نہیں ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے کی جاتی رہی ہیں۔ اندرونی طور پر یہ بحران بہت سنگین ہے۔ میں صوبائی خودمختاری کے مسئلہ پر اس لیے بحث کر رہا ہوں کہ یہ ایک محوری یا مرکزی مسئلہ ہے۔ بعد میں یہ بحران پیریٹی (مساوات) کے فارمولا سے پیچیدہ بنا دیا گیا جس کو مشرقی پاکستان کو اُس کے جائز حقوق سے محروم کرنے کے لیے عوام دشمنوں نے وضع کیا۔ جس وقت صوبائی خودمختاری کے مسئلہ پر سمجھوتہ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا گورنر جنرل غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو غیر قانونی طور پر برطرف کر دیا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اس کے گروہ یا گروپ کے خصوصی مفادات کو آئینی سمجھوتہ سے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ 1955ء میں مغربی پاکستان میں ایک یونٹ (صوبہ) قائم کر دیا گیا۔ جس سے مغربی پاکستان کے صوبوں کی جیسی کچھ بھی خودمختاری تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ ایک یونٹ اور مساوات کے جڑواں ستونوں پر 1956ء کا آئین دوسری آئین ساز اسمبلی نے تعمیر کیا جو پہلی آئین ساز اسمبلی کی طرح حقیقی معنی میں عوام کی نمائندہ نہیں تھی۔

ایک یونٹ اور مساوات کے اطلاق کا مطلب دو ریاستیں تھا جس میں ایک ریاست کو دوسری ریاست پر غلبہ حاصل تھا۔ دونوں مغربی اور مشرقی پاکستان پر غلبہ کا آلہ کار وہی رجعت پسند جتھایا گروہ تھا۔ 1958ء میں جبکہ عام انتخابات میں صرف پانچ مہینے باقی رہ گئے تھے، 1956ء کے آئین کو جنرل ایوب خاں کے پہلے مارشل لاء نے منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء کے تحت خودمختاری کے مسئلے کو نظرانداز کر دیا گیا۔ ایسا تین سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک ہوتا رہا۔ 1962ء میں ایوب خاں نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی بنیاد پر اپنا آئین دیا جو بالواسطہ انتخابی حلقہء انتخاب (Electoral College) پر مبنی تھا اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے صوبوں کے لیے سیاسی خودمختاری کے بجائے انتظامی نوعیت کا تھا۔ سیاسی خودمختاری کا کوئی متبادل نہ ہونے کے باعث خودمختاری کا مسئلہ اور زیادہ شدید ہوگیا۔ وہی رجعت پسند جتھایا گروہ حکومت کرتا رہا۔ 1969ء میں عوام کی زبردست شورش نے ایوب خاں کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل کرتے جیسا کہ خود اُن کے 1962ء کے آئین میں درج تھا۔ ایوب خاں نے اپنے فوجی جرنیل یحییٰ خاں کو دوبارہ مارشل لاء نافذ کرنے کے لیے کہا اور اس طرح ملک پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ عوام کے مزاج کو دیکھتے ہوئے جنرل یحییٰ خاں نے بالغ رائے دہی اور ایک فرد ایک ووٹ کی بنیاد پر انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے ایک یونٹ توڑ کر صوبائی خودمختاری بھی بحال کر دی۔ اپنے لیگل فریم ورک آرڈر (قانونی ڈھانچہ کا نظام) کے ذریعہ یحییٰ خاں نے حالات کو اس طریقہ سے ڈھالنے کی کوشش کی کہ جس سے یہ تأثر پیدا ہوتا تھا کہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

انہوں نے عوام کے مطالبات کو تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے اور اپنے گروہ کے اختیارات برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ تاہم صورت حال اُن کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ آگے نکل چکی تھی۔

برسوں کے ظلم کے بعد جب سیلاب کے دروازے کھلے تو کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ ایک انقلاب عظیم کے بحر کو بند کر سکے۔ مجیب الرحمٰن نے محسوس کیا کہ بس اب کافی کچھ ہو چکا۔ اس نے اپنے مشہور چھ نکات کے انتخابی منشور پر انتخابی مہم چلائی جس کا مطلب کنفیڈرل نوعیت کی صوبائی خود مختاری تھا۔ اس جنگ جویانہ فریاد پر اس نے مشرقی پاکستان میں انتخابات میں عظیم کامیابی حاصل کرلی۔ ہماری پارٹی نے سندھ اور پنجاب میں اکثریت حاصل کی اور وہ مغربی پاکستان میں ایک اکثریت والی پارٹی بن گئی۔ ہم نے مجیب الرحمٰن کو واضح طور پر بتا دیا کہ ہم نہ صرف خوش ہوں گے بلکہ عزت محسوس کریں گے اگر ہم حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھیں لیکن ایسا ہم صرف وفاقی ڈھانچہ ہی میں کریں گے۔ لیکن اگر ڈھانچہ کنفیڈریشن کا ہوا تو کنفیڈریشن کے دونوں بازوؤں کو حکومت میں شرکت کرنا ہوگی۔ یہ ایک سادہ سی اور ناقابلِ تردید تجویز تھی۔ اگر مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات کے ساتھ اس حد تک سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوتا کہ حکومت کا ڈھانچہ وفاقی نوعیت کا ہو تو وہ بڑی خوشی سے وفاقی حکومت کی تشکیل کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے مؤقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ ہوا اور اُس نے کنفیڈریشن بنانے کا تہیہ کر رکھا ہو تو وہ ملک کے دوسرے بازو کی اکثریتی پارٹی کو مسترد کر کے کنفیڈریشن پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ لے لینے یا بالکل چھوڑ دینے کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اس طرح حقیقی تعطل پیدا ہوگیا۔ جنرل یحییٰ خاں نے خیال کیا کہ یہ تعطل انہیں عمر بھر برسرِ اقتدار رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اس تعطل کو ختم کرنے کے لیے فوجی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کی فوجی کارروائی نے جس کو کسی معقول سیاسی طریقہ کے مطابق حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا تھا، بھارت کو نومبر 1971ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا۔ 16 دسمبر 1971ء تک ڈھاکہ بھارتی فوج کے قبضہ میں آ گیا اور مغربی پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی بھارت کی تحویل میں آ گئے۔

میں اس وقت اقوام متحدہ میں تھا اور ایک ناممکن صورت حال کو بچانے کے لیے از حد کوشش کر رہا تھا۔ جب جنرل یحییٰ خاں نے ہونے والی تباہی کا جائزہ لیا اور اُنہیں شکست ہو جانے کا مکمل یقین ہوگیا اور یہ امکان پیدا ہوگیا کہ کچھ بھی واپس نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو کچھ تھوڑا بہت بچا ہے وہ بھی خطرہ میں ہے تو انہوں نے ایک خصوصی طیارہ مجھے پاکستان واپس لانے کے لیے بھیجا۔ یحییٰ خاں کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور شراب کی بوتل اُن کے پاس رکھی ہوئی تھی جب 20 دسمبر 1971ء کو صبح کے ساڑھے دس بجے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ بُری طرح ناکام ہو گئے ہیں اور یہ کہ میں شکست خوردہ پاکستان کا چارج سنبھال لوں اس لیے کہ صرف میں ہی باقی ملک کو بچانے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ ان ناسازگار حالات میں میں نے سوا بارہ بجے دوپہر کو صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔

میں نے تمام محاذوں پر بڑی سرگرمی کے ساتھ پیش رفت کی۔ جن اولین کاموں پر میں نے توجہ مبذول کی اُن میں آئین سازی کا کام شامل تھا تاکہ آئین صوبائی خودمختاری کے پریشان کن سوال پر جمہوری اتفاق رائے سے منظور ہو جائے۔ میں نے اقتصادیات کو مجتمع کیا۔ میں نے اہم سماجی اور اقتصادی اصلاحات کیں۔ میں نے بنگلہ دیش کے مسئلہ کو بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے حل کیا۔ میں نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا جس میں کوئی خفیہ شق نہیں تھی اور سندھ اور پنجاب کا 5 ہزار مربع میل سے زائد علاقہ پاکستان کے لیے واپس لیا۔ میں نے 90 ہزار جنگی قیدی عزت کے ساتھ لیے اور ایسا بغیر جنگی مقدمات کے ہوا جن کے چلائے جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کی۔ میں نے امریکہ کی جانب سے اسلحہ کی سپلائی پر جو پابندی عائد تھی اُسے ختم کرایا۔ میں نے مسلح افواج کو جدید بنایا۔ میں نے ملک کو دوبارہ راستہ پر ڈال دیا۔ ملک کی بحالی حیرت انگیز تھی۔ مجھے سب سے بڑا اطمینان اس بات سے حاصل ہوا کہ میں نے جمہوری طریقوں سے ملک کو کل پارٹی آئین دیا۔ 1973ء کا آئین وہ پہلا آئین تھا جس کو ایک جمہوری اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا۔ جو اسلام، جمہوریت اور خودمختاری کی بنیاد پر ایک بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ یہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے باشندوں کی آواز تھی جس کا اظہار اُن کے منتخب لیڈروں نے ایک آئینی دستاویز میں کیا تھا۔ خودمختاری کا مسئلہ جو ایک نسل کے دور سے زیادہ عرصہ تک حل نہیں ہوا تھا اور جو برصغیر کی سیاست کے لیے زمانۂ قدیم سے ایک لعنت سمجھا جاتا تھا آخرکار طے ہو گیا تھا اور عوام اور اُن کے منتخب نمائندے مطمئن ہو گئے تھے۔ میں نے ایسی خوشی اور مسرت کی لہر محسوس کی جس سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

بلند توقعات اور نئے پیدا شدہ اعتماد کے ساتھ ہم نے 1973ء کے آئین کے نظام اور تحفظ کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ صوبائی خودمختاری کی جمہوری طریقہ سے وضاحت کی گئی تھی۔ اس نے چاروں صوبوں میں کام شروع کر دیا۔ یہ ایک حیرت انگیز یا معرکتہ الآرا کارنامہ تھا۔ ہماری پارٹی کو پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل تھی اور اُس نے ان دونوں صوبوں میں صوبائی حکومتیں تشکیل دی تھیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نہ تو نیپ کو اور نہ ہی اس کی ساتھی چھوٹی جماعت یعنی مفتی محمود کی جمعیت علماء اسلام کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو نیپ نے بلوچستان اسمبلی کے عورتوں کے بالواسطہ انتخاب میں صرف ایک ووٹ کی اکثریت حاصل کی تھی۔ یہ اکثریت اس قدر کم یا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

برائے نام تھی کہ وہ کوئی مستحکم حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ صوبائی اسمبلی کی تشکیل ہوئی تھی۔

دوسری باتوں کے علاوہ اس سبب سے کافی ہیرا پھیری ہو رہی تھی۔ دونوں اسمبلیوں میں کچھ بااثر آزاد ممبر تھے لیکن صوبہ سرحد میں اُن کی تعداد زیادہ تھی۔ آزاد ممبروں کے ساتھ بات کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں اُن کو ناقابل اصلاح موقع پرست خیال کرتا ہوں اور وہ غیر ملکی حکومت کا ورثہ ہیں۔ بہرحال ان دونوں اسمبلی کے آزاد ممبران، وفاقی حکومت کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے یا اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے بہت سی دل کو لبھانے والی تجاویز بھیجیں۔ اس قسم کی تجاویز صوبہ سرحد کے آزاد ممبروں کی جانب سے زیادہ تواتر کے ساتھ آ رہی تھیں۔ شروع میں اور کچھ عرصہ کے لیے میں نے حقارت کے ساتھ اُن کی تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ میں نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے کہہ دیا تھا کہ آزاد ارکان اسمبلی پھیل جانے والے افراد ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہیں۔

میں نے مرکزی کمیٹی سے کہا تھا کہ نیپ اور جے یو آئی نے بالآخر ایک متفقہ آئین بنانے میں تعاون کیا ہے اور اگر تعاون نہیں بھی کیا ہے تو کم از کم انہوں نے اس سے اتفاق رائے کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے مرکزی کمیٹی کے ارکان سے کہا کہ مجھے بہت اہم داخلی اور خارجی معاملات طے کرنے ہیں اس لیے میں اپنی توانائیوں کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آزاد ممبروں کی پارہ صفت حمایت کی بنیاد پر غیر مستحکم حکومتیں برقرار نہیں رکھ سکتا۔ میں نے مرکزی کمیٹی سے کہا کہ دوسری وجوہات کے علاوہ ان وجوہات کی بنیاد پر میں نیپ اور جے یو آئی کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ وہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومتیں بنائیں۔ میں نے مرکزی کمیٹی کے سامنے وضاحت کی کہ ایسا کرنے سے میرے مسائل میں کمی ہو جائے گی اور نیپ اور جے یو آئی والے بجائے ایجی ٹیشن والی سیاست کے تعمیری نوعیت کی سیاست میں لگ جائیں گے۔ میں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر مقرر کرنے کا انوکھا اور غیر متوقع قدم اُٹھایا تاکہ دونوں صوبوں میں نیپ اور جے یو آئی کے درمیان جو ڈانواں ڈول قسم کا اتحاد ہے اُس کو استحکام حاصل ہو جائے اور آزاد ممبروں کی پارلیمانی ریشہ دوانیوں کا توڑ ہو سکے۔

نیپ کے حق میں اس قدر خیر سگالی کا جذبہ دکھانے کی کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔ میری پارٹی اور دوسری پارٹیوں میں بہت سے سیاست دان خصوصاً قیوم خاں کی مسلم لیگ کے سیاست دان اس خیر سگالی کے جذبہ کے اظہار پر بڑے چوکنا اور حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اب خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ نہ صرف سیاست دان بلکہ ہمارے معاشرے کے بہت سے طاقت ور اور بااثر طبقات

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پریشان ہو گئے تھے۔ نیپ کا پاکستان کی مخالفت میں ایک طویل اور انمٹ ریکارڈ تھا۔ تخلیق پاکستان کے بعد نیپ کے لیڈر بہت برسوں تک یکے بعد دیگرے حکومتوں کے ہاتھوں جیلوں میں رہے تھے۔ جنرل یحییٰ خاں جنہوں نے اپنے مارشل لاء کا آغاز نیپ کے ساتھ دوستی کا اظہار کر کے کیا تھا اپنے زوال سے چند ماہ پیشتر ہی اُسے غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ اب میں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر مقرر کر کے ایک غیر معمولی اقدام کر رہا تھا اور جے یو آئی کی شرکت میں حکومتیں بنانے میں اُن کی مدد کر رہا تھا۔ نیپ کے بارے میں کچھ وائٹ پیپر (قرطاس ابیض)، دستاویزات اور سپریم کورٹ کا فیصلہ موجود ہے جن میں اس دور کے واقعات کا ذکر ہے۔ اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ملک کے دولخت ہو جانے کے بعد میں نے نیپ کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھانے کی انتہائی سنجیدہ اور مخلصانہ کوششیں کیں۔ یہ پالیسی کا نہ کہ موقع یا محل کی سہولت والا معاملہ تھا۔ میرا ایسا کرنے کی وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات ذاتی نوعیت کی یا مطلب پرستی پر مبنی نہیں تھیں۔ کوئی بھی وجہ کسی طرف داری کے سبب سے نہیں تھی۔ میری وجوہات کا اصل سبب پاکستان اور سارے خطہ کا مفاد تھا۔ میری وجوہات بلند خیال پر مبنی تھیں، نہ کہ نچلی سطح سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں پاکستان کو ایک اور موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ میں صاف دل کے ساتھ ابتدا کرنا چاہتا تھا۔

یہ کہنا بالکل فضول بات ہے اور یہ دلیل دینا انتہائی لغو اور بیہودہ ہے کہ میں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی کی حکومتیں قائم کرنے کے لیے نیپ، جے یو آئی کی حکومتوں کو ختم کرنے کی سازش کی۔ اگر میرا یہ مقصد ہوتا تو میں ان دونوں صوبوں میں نیپ، جے یو آئی کی حکومتیں بنانے میں اس قدر غیر معمولی طور پر کیوں مدد کرتا۔ مجھے آبادی کے ایک طبقہ کی طرف سے اس تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو مجھے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کی حکومتیں قائم کرا کر برداشت کرنی پڑی۔ میں دونوں اسمبلیوں کے آزاد ممبروں کو جھڑکی نہیں دیتا جو وفاقی حکومت کی حمایت و سرپرستی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ مرکز میں تو پی پی پی کی حکومت تھی۔ سندھ اور پنجاب میں بھی پی پی پی کی حکومتیں تھیں۔ مجھے نئے آئین کے تحت جمہوریت کے منظم طور پر ارتقا میں اور دیرپا استحکام کے حصول میں زیادہ دلچسپی تھی بمقابلہ اس امر کے کہ میں دو صوبائی حکومتوں کو گرا کر ناقابلِ اعتماد آزاد اُمیدواروں اور کچھ پی پی پی کے ممبروں پر مشتمل حکومتیں بناؤں۔ ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اعلیٰ تر مقاصد زیادہ اہم تھے۔ اس سطح پر کامیابی کا مطلب ہر طرف کامیابی تھا۔ میں اس قدر احمق نہیں تھا کہ میں اپنے عظیم مشن کو خطرہ میں ڈالتا اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی کی حکومتوں کو قائم کرنے کے مشکوک اور غیر دل کش مقصد کی خاطر ہر شے کو خدا حافظ کہہ دیتا۔

محاذ آرائی سے بچنے کے لیے میری کوششیں جامع قسم کی تھیں۔ میں سانڈ سے لڑنے والے پہلوان

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کی مانند تھا۔ بہت سے مفاد پرست عناصر چاہتے تھے کہ میں سانڈ کے پیٹ میں تلوار گھونپ دوں لیکن میں ہر بھگدڑ میں ایک طرف کو جاتا تھا یا طرح دے جاتا تھا، یہاں تک کہ میرے ایک دوست نے، جن کا اس محاذ آرائی میں کوئی بے جا مقصد نہیں تھا، مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا مجھ میں لڑنے کا حوصلہ اور چیلنج قبول کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست کو وضاحت کرتے ہوئے محاذ آرائی کے وسیع معنی بتائے تھے اور اُنہیں یقین دلایا تھا کہ اگر قومی اتحاد کی خاطر یہ بات ناگزیر ہو گئی تو میں نہ صرف ثابت قدم رہوں گا بلکہ سرخرو ہو کر نکلوں گا جو قومی اتحاد کے لیے مفید ہو گا۔ میں نے حساب لگا لیا تھا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہر مسئلہ کے حل سے پہلے ایک سمجھوتہ یا مفاہمت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ جے یو آئی کوئی بڑا عنصر نہیں تھی۔ پارٹی کے لیڈر مفتی محمود ایک معمولی ذہانت والے آدمی تھے جو صرف ہمارے پس ماندہ معاشرہ میں ہی وزیر اعلیٰ ہو سکتے تھے۔ نیپ ایک دوسری نوعیت کی جماعت تھی لیکن اس کی عوامی بنیاد کچھ جنگ جو قسم کے لوگوں کی حمایت تک محدود تھی۔ صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں نیپ کو کوئی قابلِ ذکر حمایت حاصل نہیں تھی۔ اس کے مضبوط گڑھ ضلع پشاور کے کچھ حصوں میں اور مردان اور صوابی میں تھے۔ اس نے مالاکنڈ میں بھی کچھ پیش رفت کی تھی۔ بلوچستان میں چونکہ قبائلی نظام تھا اس لیے نیپ بلوچستان کے صرف اُن علاقوں میں طاقت ور تھی جہاں قبائلی سرداروں کا تعلق نیپ سے تھا۔ ایسا خاص طور پر مری، بگٹی کے علاقہ میں اور جھلوان کے منگل علاقہ میں تھا۔ سیروان کے کچھ علاقوں میں بھی نیپ کے خاصے حامی تھے۔ لسبیلہ، سبی، کچھی اور پختون علاقوں میں اس کا اثر و رسوخ برائے نام تھا۔ کوئٹہ میں بھی نیپ کا کچھ اثر و رسوخ تھا لیکن آبادکاروں کی خاصی آبادی کی وجہ سے یہ اثر و رسوخ زائل ہو گیا تھا۔ ان آبادکاروں میں ہزارہ کے لوگ اور مختلف طبقات کے لوگ شامل تھے۔ پارلیمانی جمہوریت کی ریاضی میں نیپ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔

لیکن مسئلہ زیادہ وسیع جہت کا تھا۔ نیپ کے لیڈر خصوصاً بلوچوں میں مخلص اور ذہین تھے۔ میری ایمان دارانہ اور غیر جانب دارانہ رائے میں نیپ کے صدر جو ایک سربرآوردہ پختون ہیں ایک ایسے سیاست دان ہیں جن کی استحقاق یا اصلیت سے بڑھ کر قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ وہ بلاشبہ ذہین ہیں لیکن وہ مایوس کن حد تک صرف ذاتی تصورات تک محدود ہیں۔ یا تو اپنے ذاتی تصورات کی وجہ سے یا پھر اپنی مزاجی کیفیت کے باعث اُن میں یکا یک ایک زاویۂ نگاہ اپنا لینے کا رُجحان پایا جاتا ہے اور وہ نقصان اور غلطیاں کرتے ہیں اور مہلک قسم کے غلط اندازے قائم کرتے ہیں۔ وہ فرومایہ اور کم ظرف بھی ہو سکتے ہیں۔ اکبر بگٹی کے علاوہ دوسرے بلوچ لیڈر اس قدر چمک دمک والے تو نہیں ہیں لیکن زیادہ پختہ کار ہیں۔ عوامی مقبولیت اور قیادت کی صلاحیت سے زیادہ نیپ کی اہمیت اس کے مؤقف یا عزم و یقین میں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہے۔اس کے مؤقف ہی کی مقناطیسی اپیل نے ذیلی نیشنلسٹ عناصر کو خصوصاً نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔اس کے اِسی مؤقف کے باعث بالآخر میری اس سے محاذ آرائی ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک طویل اور ناخوشگوار جدوجہد ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس محاذ آرائی کا سنگین ردِعمل قومی اتحاد پر، ہماری سیاست میں جمہوریت کی حیثیت پر ہوگا۔ان اسباب کی بنا پر میں کوشش کر رہا تھا کہ نیپ کو ''تاریخی سمجھوتہ'' کرنے کی ترغیب دوں۔ میں وہی بات کر رہا تھا جو ایلڈوموروا ٹلی میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نیپ پاکستان کے اتحاد کے حلقہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن جیسا کہ میں نے اپنا حساب کتاب لگایا تھا۔ نیپ کے لیڈروں نے بھی اپنے اندازے قائم کیے تھے۔ وہ پاکستان کے ایز یکو بیلنگرز ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ڈھاکہ کے زوال اور افغانستان میں سردار محمد داؤد کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد نیپ کے لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اب اُن کے اقدام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ واقعات تیزی سے رُونما ہو رہے تھے۔ اُن کے چیلنج کرنے کے رویہ کے باعث بلوچستان کی صوبائی حکومت کو برطرف کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ آئین کے تحت میں نے صوبہ بلوچستان میں صدارتی راج نافذ کر دیا اور اکبر بگٹی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اکبر بگٹی میری پارٹی کے رُکن نہیں تھے۔ انہوں نے میری پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ اُس وقت وہ ایک ایسی پارٹی میں شامل ہیں جس کی شناخت ہی مشکل ہے۔ حالانکہ میرا اقدام بلوچستان تک محدود تھا لیکن صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ مفتی محمود نے نیپ سے ہمدردی کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے ایسا غالباً برطرف کیے جانے کے خوف سے نہ کہ ہمدردی کی بنا پر کیا۔ اس کے بعد گہرے اور خوفناک بادل آئے۔ بلوچستان میں بغاوت کو کچلنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ اس بغاوت کو کچلنے میں تین سال سے زائد عرصہ لگا۔ فوج کو بغاوت کچلنے کے لیے ملوث کرنا ناگزیر ہو گیا۔ فوجی رول میں توسیع ہوتی رہی۔ اس کے تانے بانے سویلین تقریبات تک پھیل گئے۔

تاہم اگر فوجی کارروائی کے ساتھ ساتھ میں اس بحران میں زبردست سیاسی اور سماجی و اقتصادی حل کا استعمال نہ کرتا تو فوجی آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ زرعی شعبہ میں میری بنیادی اصلاحات، سرداری نظام کا خاتمہ، سڑکوں کی تعمیر، دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کے کام، ٹیوب ویلوں کے لیے کھدائی، ٹریکٹروں کی آوازوں اور دوسرے بہت سے فوائد نے بلوچستان کے غریب لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دی۔ میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں اور نہ ہی خودستائی کر رہا ہوں، جب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے خوابیدہ بلوچستان کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے بیسویں صدی میں چلنے کے قابل بنایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ باقی پاکستان کی حالت اس صدی میں ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

دو مواقع پر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ فوج کو بلوچستان سے واپس بلانے کا وقت آ گیا ہے۔ دونوں ہی مواقع پر فوج کے موجودہ سربراہ نے مجھ سے اپیل کی تھی کہ میں انہیں ڈھیلے سروں کو باندھنے کے لیے آخری توسیع کی اجازت دوں۔ فوجی اقدام کو نمٹانے کے بجائے وہ اور زیادہ اختیارات فوجی اقدام کو نمٹانے کے نام پر طلب کر رہے تھے۔ جب جنرل ٹکا خان فوج کے سربراہ تھے تو ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ فوج کے موجودہ سربراہ کے برعکس وہ سیاسی یا انتظامی نوعیت کی سفارشات نہیں کرتے تھے۔ جنرل ٹکا خان اپنی ذمہ داریوں کو فوجی رول تک ہی محدود رکھتے تھے اور وہ غیر فوجی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ شخص حیدرآباد کے مقدمہ میں لوگوں کو پھانسنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ اجازت طلب کرتا رہتا تھا کہ اسے افغانستان میں باغیوں کا پیچھا کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ سول ملازمین پر سخت تنقید کرتا تھا۔ خصوصاً بلوچستان کے آخری چیف سیکرٹری پر۔ چونکہ میں نے مارچ 1977ء کے انتخابات کے ایک ماہ بعد فوج کو بلوچستان سے واپس بلانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اس لیے یہ صورت حال مجھے اس کی عجیب و غریب باتیں برداشت کرنے کے لیے مجبور کرتی تھی۔

صوبہ سرحد میں تشدد ہوا اور گڑبڑ ہوئی لیکن کہیں بھی اس پیمانہ پر ایسا نہیں ہوا جیسا کہ بلوچستان میں ہوا تھا۔ اس صوبہ میں بموں کے دھماکے کیے گئے اور تخریب کاری کے طریقے اختیار کیے گئے۔ سکول اور بنک اس تخریب کاری کی کارروائیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ بدقسمتی سے نوجوان شیر پاؤ پشاور یونیورسٹی میں ایک بم کے دھماکہ میں ہلاک ہو گئے۔ تاہم مناسب مدت کے اندر صوبہ سرحد کی صورت حال قابو میں آ گئی۔

افغانستان کے صدر محمد داؤد اِن واقعات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں صورت حال کو مؤثر طور پر کنٹرول کر لیا ہے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں نے بحران پر قابو پا لیا ہے تو ایک حقیقت پسند شخص کی طرح انہوں نے مجھے کابل مدعو کیا تاکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی اختلافات کو طے کیا جا سکے۔ وہ دوسرے متبادل طریقے آزما چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے نہ صرف داخلی بحران پر قابو حاصل کر لیا ہے بلکہ غیر ملکی مداخلت کو بھی غیر مؤثر بنا دیا ہے جس میں امکانی امداد اور اصل امداد دونوں ہی شامل تھیں۔ پانسہ پھینکا جا چکا تھا۔ میں نے خلوصِ دل سے بات چیت کے لیے اُن کی دعوت پر لبیک کہا۔ جب جون 1976ء کے پہلے ہفتہ میں میں نے افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو صدر افغانستان نے میرا خوش دلی اور مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تین سال پہلے اپنی پہلی ہی تقریر میں پاکستان کو دھمکیاں دی تھیں جب وہ ایک فوجی انقلاب کے ذریعے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ کابل میں بات چیت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ صدر

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

داؤد چاہتے تھے کہ میں نیپ کے لیڈروں کو خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے رہا کردوں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جب خیر سگالی کا خوشگوار اثر ہوگا تو افغانستان متنازعہ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لے گا۔ اُن وجوہات کی بنیاد پر، جن کے تذکرہ کی اس خط میں ضرورت نہیں ہے۔ میں نے افغانستان کے صدر سے کہا کہ دونوں کے خیر سگالی کے جذبات پر ایک ساتھ ایک معاہدہ کی شکل میں عمل ہوگا۔ میں نے اُن سے کہا کہ انصاف کا توازن لینے اور دینے کے معاہدہ پر جو ایک ہی وقت ہو۔ میں نے نیپ کے لیڈروں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا اور اُن کے خلاف الزامات واپس لینے کو کہا جس کے بدلہ میں انہیں ساتھ ہی ساتھ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہم نے اگست 1974ء میں پاکستان میں مذاکرات جاری رکھنے سے اتفاق رائے کیا۔ میرے کابل سے روانہ ہونے سے قبل ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ دونوں ممالک اپنے سیاسی اختلافات کو پُرامن بقائے باہمی کے پانچ اُصولوں کی بنیاد پر طے کریں گے۔

جب داؤد اگست 1976ء میں پاکستان آئے تو یہ بالآخر طے ہوگیا کہ دونوں جانب سے اکٹھا معاہدہ ہوگا جس پر ایک ساتھ عمل کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان نیپ کے لیڈروں کو رہا کردے گی اور اُن کے خلاف غداری کے الزامات واپس لے لے گی اور افغانستان کی حکومت موجودہ سرحد (ڈیورنڈ لائن) کو تسلیم کر لے گی۔ افغانستان اور پاکستان کے دفاتر خارجہ کے حکام نے اپنے اپنے وزراء کی قیادت میں ''پیکیج فارمولہ'' کی تفصیلات لاہور میں اگست 1976ء میں بذریعہ تحریر طے کیں۔ طرفین نے اس امر سے اتفاق کیا کہ میں اکتوبر/نومبر 1976ء میں کابل کا دورہ کروں گا اور افغانستان کے صدر کے ساتھ باضابطہ معاہدہ، معاہدہ کے مسودہ کی شرائط کے مطابق کروں گا۔ دیر میں جو گڑبڑ ہوئی خواہ وہ کسی سازش کے تحت ہوئی یا نہیں اس کے باعث میں نومبر 1976ء میں کابل نہیں جاسکا۔ پھر 6 جنوری 1977ء کو نواب شاہ میں میرے اور پاکستان میں متعین افغان سفیر مسٹر نور احمد اعتمادی کے درمیان یہ طے ہوا کہ میں مارچ 1977ء کے آخر میں کابل جاؤں گا اور ایسا پاکستان میں انتخابات کے ایک یا دو ہفتے بعد کروں گا۔

بلوچستان میں بغاوت کے عروج کے دوران بھی میں آخری سیاسی حل کے بارے میں برابر سوچ رہا تھا۔ میں حیدرآباد جیل میں ایک بلوچ لیڈر سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا اور ایسا ذمہ دار درمیانی لوگوں کے ذریعہ کر رہا تھا۔ اُن کے ذریعہ میرے اور بلوچ لیڈر کے درمیان خاصہ تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ جب لاہور میں اگست 1976ء میں معاہدہ کا مسودہ تیار ہوا تو میں اُن روابط کو بہت زیادہ اور فوری اہمیت دینے لگا۔ بلوچ لیڈر کے ساتھ مذاکرات خاصے تفصیلی نوعیت کے تھے۔ نیپ کے صدر کے ساتھ رابطہ کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ 1977ء کے موسمِ بہار کی اُکھاڑ پچھاڑ نے میری غیر منقسم توجہ کو ایجی ٹیشن کی جانب

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

موڑ دیا۔

لاج تو رکھنی ہی تھی۔ خون بالکل بیکار میں تو نہیں بہا تھا۔ ظاہر تھا کہ موجودہ صورت حال یا حالت کی طرف واپسی غیر حقیقت پسندانہ ہوتی کہ جیسے تین سال کے عرصہ میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی توقع کا یہ مطلب ہوتا کہ بلوچوں نے جو قربانیاں دیں، وہ کسی سبب کے بغیر دیں۔ سبب یا کاز کیا تھا؟ ایک عظیم تر اور آزاد بلوچستان اور پختونستان؟ اگر یہی کاز تھا تو وہ میری حکومت اور پاکستان کے عوام کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ ہم نے مجبوراً محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا تاکہ پاکستان کی مزید شکست و ریخت کو روکا جاسکے اور اس مقصد میں ہم کامیاب ہوگئے تھے۔ جیسا کہ اُس قسم کا مطالبہ میرے لیے اور پاکستانی عوام کے لیے بالکل ناقابل قبول تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی ناقابل عمل تھی کہ فریق مخالف پہلے کی صورت حال پر مراجعت کے لیے راضی ہوگا۔ نیشنلزم اور ذیلی نیشنلزم کے تقاضوں کو قومی اتحاد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا اور اُن کے درمیان مصالحت و مفاہمت پیدا کرنی تھی لیکن ایسا ذیلی قومی خواہشات کے معاملہ میں عزت و انصاف کے ساتھ کرنا تھا جن کا اظہار بلوچستان نے ایک بغاوت کی صورت میں کیا تھا۔ سادہ الفاظ میں اس کا یہ مطلب تھا کہ خودمختاری کی حد اور مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ اس خودمختاری میں اضافہ کا تعین میرا کام تھا اور اس کے لیے مجھے اسی قسم کی اتفاق رائے حاصل کرنا تھی جیسا کہ میں نے 1973ء میں حاصل کی تھی۔ درمیانی لوگوں کے ذریعہ بلوچ لیڈر کے ساتھ میرے مذاکرات کا یہی مقصد تھا۔ درحقیقت اس نازک موضوع پر صرف ایک درمیانی آدمی کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سینیٹ کو زیادہ اختیارات دینے کی گنجائش ہے۔ اس امر کی بھی گنجائش ہے کہ وفاقی فہرست میں سے ایک یا دو چیزیں صوبائی فہرست میں منتقل کردی جائیں۔ ہمیں اس بارے میں اپنے ذہن کھلے رکھنے چاہئیں کہ آیا کانکرینٹ (جو وفاق اور صوبوں دونوں کے لیے ہو) لسٹ کو برقرار رکھنا چاہیے یا اُسے ختم کر دینا چاہیے۔ خودمختاری کے بارے میں نیا سمجھوتہ جمہوری مذاکرات کے ذریعہ کیا جائے اور یہ مذاکرات ملک کے حقیقی لیڈر کریں۔

مارچ 1977ء کے انتخابات کے بعد میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اس مسئلے کو مذاکرات کی میز پر طے کروں گا۔ قومی سطح پر بلوچستان میں بغاوت ناکام ہوگئی تھی اور صوبہ سرحد میں تشدد اور اکا دکا گڑبڑ کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ معمول کے مطابق حالات کی بحالی ہوچکی تھی۔ میری خارجہ پالیسی کی وجہ سے اُس قسم کی خطرناک غیر ملکی مداخلت جیسی کہ افریقہ میں حال ہی میں دیکھی گئی تھی نہیں ہوئی تھی۔ ان مثبت کامیابیوں نے اگست 1976ء میں لاہور میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان معاہدہ کے مسودہ کی راہ ہموار کی تھی۔ اب دیرپا سیاسی توازن کے لیے ازسرنو مذاکرات شروع کرنے کے لیے راستہ صاف ہوگیا تھا جو

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ناراض صوبوں کے لیے قابل قبول ہو اور پاکستان کے متحدہ وفاق کے ڈھانچہ کے اندر ہو۔ مجھے بلوچ اور پختون لیڈروں کی سوچ کا ابھی اندازہ لگانا تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ باعزت سمجھوتہ کا اُن کا تصور کیا ہے۔ تاہم ڈراؤنا خواب تو ختم ہو چکا تھا۔ درحقیقت اگر حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں تو ہم کم از کم فائدہ کی پوزیشن میں ضرور تھے۔ اور میں یہ بات انتہائی انکساری کے ساتھ کہہ رہا ہوں جب بغاوت عروج پر تھی تو مجھے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں پاکستان، بھارت اور افغانستان کے درمیان سروتے میں نہ آجائے۔ یہ حقیقت کہ ایسا نہ ہوا میری انتہائی اہم کامیابی تھی۔ بغاوت علاقہ میں محدود رہی اور اس پر قابو پالیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے برعکس اس بغاوت نے بین الاقوامی حیثیت اختیار نہیں کی۔ غیر ملکی دروازے بند کردینے کے بعد اور راستہ صاف کردینے کے بعد وقت آگیا کہ بندوقوں کو نیچے رکھ دیا جائے اور مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ مذاکرات مارچ 1977ء کے انتخابات کے بعد شروع نہیں ہو سکے اس لیے کہ موسم بہار میں ایجی ٹیشن شروع ہو گیا، جیسے ہی میں نے ایجی ٹیشن کے حل کا بندوبست کیا ملک میں 5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

جولائی 1977ء کے فوجی انقلاب کے بعد جنرل ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کیا اور صدر داؤد سے ملاقات کی۔ کابل سے واپسی کے فوراً بعد انہوں نے نیپ کے لیڈروں کو حیدرآباد جیل سے رہا کر دیا۔ مستقبل قریب میں وقت بتائے گا کہ آیا ایسا غیر مشروط طور پر کیا گیا یا مسئلے کے حل سے قبل مفاہمت یا سمجھوتہ کی یقین دہانی پر کیا گیا۔ مارچ 1978ء میں صدر داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ دل خوش کن تقاریر ہوئیں۔ تاہم ایک تقریر میں صدر داؤد نے خاص طور پر کہا کہ سیاسی مسئلے ابھی حل ہونا باقی ہیں۔ کوئی مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا جب سردار داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اگر تیس سال کے تعطل اور ہیجان کے بعد، جس میں کبھی کبھی تو بہت زیادہ اضافہ بھی ہوا، میں جون 1976ء میں کابل میں کابل حکومت سے مشترکہ اعلامیہ جاری کرا سکا جو پُرامن بقائے باہمی کے پانچ اُصولوں پر مبنی سیاسی اختلافات کو طے کرنے کے بارے میں تھا تو پھر یہ ایک معمہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کیوں کابل یا اسلام آباد میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعہ اس کی تصدیق و توثیق نہیں کرا سکے۔ اگر کوئی زیادہ اہم خفیہ معاہدہ ان کے درمیان ہوا تھا تب بھی جون 1976ء کے کابل اعلامیہ کا ادعا پاکستان اور افغانستان کے عوام کے فائدہ کے لیے اور زیادہ ضروری تھا۔

شاید ایک نیا خفیہ معاہدہ ہوا تھا جب جنرل ضیاء الحق کابل گئے تھے، یا جب سردار داؤد مارچ 1978ء میں پاکستان آئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس قدر بڑی کامیابی ہو کہ مشترکہ اعلامیہ کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو۔ داؤد کے پاکستان کے دورہ کے تقریباً ایک ماہ بعد 27 اپریل 1978ء کو افغانستان

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

میں ایک انقلابی تبدیلی ہوئی۔ افغانستان کے نئے لیڈروں نے اعلان کیا ہے کہ پختون اور بلوچ مسئلہ باقی ہے اور یہ کہ وہ اس سیاسی مسئلہ کا حل پاکستان کے ساتھ پُرامن طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ دو ماہ میں یہ بات کہی گئی ہے۔ میں تنقید کرنا نہیں چاہتا لیکن ہماری جانب سے افغانستان میں تبدیلی کا ردِعمل تباہ کن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کی حکومت کی چولیں اس تبدیلی کے باعث ہل کر رہ گئی ہیں جیسے کہ اس پر کوئی ناگہانی آفت نازل ہوگئی ہو۔ اذیت دینے کے ساتھ ساتھ اہانت کرنے کی غرض سے حکومت کے پی این اے کے ساتھیوں نے افغانستان کے انقلاب کے بارے میں انتہائی تباہ کن اور غلط تصورات پر مبنی بیانات جاری کیے چونکہ پریس پر سخت ترین کنٹرول تھا اس لیے افغان ان اشتعال انگیز بیانات کے بارے میں یہی سمجھے کہ ان بیانات کا کوئی تعلق حکومت پاکستان سے نہیں ہے اُن پر بعد میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ بالکل غیر ضروری اعلانات کیے گئے کہ پی این اے کے لیڈروں کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کی جارہی ہیں جن میں افغانستان میں تبدیلی کے بارے میں غور وخوض ہوگا۔

یہ خیال کرنا تو نری حماقت بلکہ دیوانہ پن ہے کہ چونکہ جنرل ضیاء الحق نے بھارت کو ''ایک پیارا اور عظیم پڑوسی'' کہہ دیا ہے اس لیے بھارت کی موجودہ قیادت الگ کھڑی دیکھتی رہے گی اور دوسرے اس کے حصے بخرے کرتے رہیں گے۔ جنرل ضیاء الحق خواہ بھارت کو خوش کرنے کے لیے کچھ ہی کریں اور خواہ کشمیر کے بارے میں خفیہ شرائط کی بات کریں جن کا کوئی وجود نہیں ہے بھارت، پاکستان سے پورا پورا فائدہ حاصل کر کے رہے گا۔ 12 جون 1978ء کو بھارتی وزیراعظم نے امریکہ میں کہا کہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی خاطر بھارت چین کے خلاف اپنے سرحدی علاقہ کے دعوے کو ترک کر دے گا۔ صرف دو ماہ پیشتر بھارتی وزیراعظم نے پاکستانی صحافیوں سے کہا تھا کہ بھارت چین سے وہ علاقہ دوبارہ حاصل کرنے پر اصرار کرے گا جس کو وہ لداخ میں بھارتی علاقہ کہتے ہیں۔ اس غیر مفاہمانہ یا غیر مصالحانہ رویہ کا اظہار افغانستان میں انقلاب سے پہلے کیا گیا تھا۔ دو ماہ بعد یہ مخالف رویہ چین کو غیر جانب دار بنانے کی غرض سے اختیار کیا گیا ہے تاکہ پاکستان پر کئی جانب سے حملہ کی صورت میں چین غیر جانب دار ہو جائے۔ اسی بات کو ایک پختون لیڈر نے 1972ء میں ''پاکستان کی تین طرفہ تقسیم'' کہا تھا۔ پاکستان کا خاتمہ تو بھارت کا ایک مقدس اور غیر متزلزل مشن تھا۔ یہ خیال کرنا تو انتہائی حماقت ہوگی کہ کشمیر یا سلال بند یا تجارت کے بارے میں بھارت کو خوش کرنے سے بھارت باقی ماندہ پاکستان پر اپنی حریصانہ نگاہیں ڈالنا بند کر دے گا۔

اس کے برعکس مراعات تو بھارت کی بھوک یا طمع میں اور بھی اضافہ کرتی ہیں۔ مصالحت و مفاہمت اور اپنے حقوق و مفادات سے دست برداری تو بھارتی قیادت کو اور زیادہ یقین دلاتی ہے کہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پاکستان ایک خود دار قوم کی حیثیت سے باقی رہنے کا عزم کھو چکا ہے۔ بھارتی مداخلت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ شک صرف اس بارے میں ہے کہ مداخلت کرنے والی طاقتوں کے درمیان پاکستان کے چاروں صوبوں کی تقسیم کس طرح ہو۔ آج کل مرار جی ڈیسائی اور اٹل بہاری واجپائی کان کے کچے مارشل لاء حکمرانوں کے کانوں میں میٹھے اور سُریلے الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ صرف اُن کی چال ہے۔ واجپائی جن سنگھ کا لیڈر رہا ہے۔ خواہ وہ آج کل کچھ بھی کہے نہ تو اس کے اور نہ ہی جن سنگھ کے تعارف کی کوئی ضرورت ہے۔ جہاں تک مرار جی ڈیسائی کا تعلق ہے تحریکِ پاکستان کے معمر سیاست داں اس امر کی تصدیق کرنے کے لیے ابھی زندہ ہیں کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو چھوڑتے ہوئے کوئی دوسرا کانگریسی لیڈر پاکستان کا اس قدر مخالف نہیں تھا جس قدر کہ بھارت کے موجودہ وزیرِ اعظم تھے۔ نہرو اور اندرا گاندھی کی شہرت زیادہ وسیع القلب اور روادار ہونے کی تھی۔ اُن کو اس قدر متعصب نہیں خیال کیا جاتا تھا جس قدر پٹیل اور ڈیسائی کو متعصب سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں صدر رچرڈ نکسن نے اپنی حالیہ شائع شدہ یادداشتوں میں پاکستان کے بارے میں بھارتی لیڈروں کی دغابازی اور مکاری کے متعلق جو کچھ کہا ہے اُس کو یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں کہ:

> ''4 نومبر کی صبح کو میں نے اوول آفس میں بھارت کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ اُن کا واشنگٹن کا دورہ ایک نازک وقت میں ہوا تھا۔ آٹھ ماہ قبل مشرقی پاکستان میں صدر یحییٰ خاں کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی تھی۔ بھارتی حکام نے اطلاع دی تھی کہ تقریباً ایک کروڑ مہاجرین مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر بھارت میں داخل ہو گئے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یحییٰ خاں کو بالآخر مشرقی پاکستان کے آزادی کے مطالبہ کو ماننا پڑے گا اور ہم نے اُن پر زور دیا تھا کہ وہ زیادہ مصالحانہ اور اعتدال پسند رویہ اختیار کریں۔ ہمیں یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ بھارت کس حد تک اس موقع کو نہ صرف مشرقی پاکستان میں پاکستان کے کنٹرول کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرے گا بلکہ وہ مغربی پاکستان کو بھی کمزور کرنے کے لیے اس موقع کو استعمال کرے گا۔
>
> مسز گاندھی نے میری بے حد تعریف کی کہ میں ویت نام کی جنگ کو سمیٹ رہا ہوں اور چین کے معاملہ میں جرأت مند اقدام کر رہا ہوں۔ ہم نے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

> پاکستان کی مشکل صورت حال پر بات چیت کی اور میں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ امر انتہائی اہم ہے کہ بھارت کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو اِس صورت حال کو اور زیادہ خراب کر دے۔
>
> اُنہوں نے مجھے یقین دلایا کہ بھارت کا مقصد پاکستان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے کا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت، پاکستان کی تباہی یا اُسے مستقل طور پر مفلوج و ناکارہ کر دینے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ سب سے بڑھ کر بھارت استحکام کی بحالی چاہتا ہے۔ ہم ہر قیمت پر گڑبڑ اور افراتفری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔
>
> بعد میں مجھے علم ہوا کہ جس وقت مسز گاندھی نے یہ باتیں کہیں۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ اُن کے جنرل اور مشیر مشرقی پاکستان میں مداخلت کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور مغربی پاکستان پر حملہ کرنے کے ہنگامی بنیاد پر منصوبے تیار کر رہے ہیں۔
>
> اُس صبح کو ہماری جو گفتگو ہوئی اس سے میں اس حقیقت کے باعث پریشان ہوا حالانکہ مسز گاندھی نے امن کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن انہوں نے ہیجان و خلفشار کو بڑھنے سے روکنے کے لیے کوئی تجاویز پیش نہیں کیں۔ یحییٰ خاں نے اس بات سے اتفاق کر لیا تھا کہ وہ بھارتی سرحد سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے۔ اگر بھارت بھی ایسا کرے لیکن مسز گاندھی نے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔
>
> ایک ہی ماہ کے بعد روسی اسلحہ سے لیس ہو کر بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ مغربی پاکستان کی سرحد کے ساتھ بھی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لیکن یہ بتانا ناممکن تھا کہ آیا بھارت کا مقصد پاکستانی فوج کو اُسی مقام پر محدود رکھنا تھا جہاں وہ تھی یا یہ کارروائی پاکستان پر پورے حملہ کا پیش خیمہ تھی۔ اس قسم کے فوجی منصوبے ایک ماہ سے کم میں تیار نہیں کیے جاتے ہیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مسز گاندھی نے جان بوجھ کر اُس ملاقات میں مجھ سے دھوکہ بازی کی تھی۔''

صدر نکسن کا یہ تبصرہ اُن کی یادداشتوں کے صفحات 525 اور 526 پر درج ہے۔ اگر لبرل ذہن

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

رکھنے والی مسز گاندھی صدر نکسن جیسے زیرک اور تجربہ کار سیاست دان کو پاکستان کے بارے میں بھارت کے رویہ کے متعلق دھوکہ دے سکتی تھیں تو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ متعصب قسم کے جنتا پارٹی کے لیڈر کس طرح ناتجربہ کار مارشل لاء حکمرانوں کو پاکستان کے بارے میں اپنی ڈپلومیسی کے متعلق دھوکہ دے سکتے ہیں۔

چار معاملات ہیں جن کے ذکر کے ساتھ ہی میں اس خط کو ختم کرنا چاہوں گا:

-1 جب میں نے تمہاری والدہ کے ساتھ ستمبر 1951ء میں شادی کی تھی تو میں ہنی مون منانے کے لیے انہیں استنبول لے گیا تھا۔ استنبول ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پُل ہے۔ تاہم میں انہیں استنبول اس لیے لے گیا تھا کہ میں اُن کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسلامی تاریخ کے سنہرے اور سب سے زیادہ جرأت مند بابوں یا ادوار کے کاریڈوروں میں سے ہو کر گزروں۔ اسلام کی تاریخ جذبات میں تموج پیدا کرنے والی ہے لیکن جس قدر وہ ترکی میں متواتر حیثیت سے جذبات میں تموج پیدا کرتی ہے اس قدر کسی اور ملک میں نہیں کرتی۔

-2 جوانی کے زمانہ سے ہی میں برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ کرتا رہا ہوں۔ مجھے سامراجیت سے سخت نفرت ہے لیکن جب میں اُن ذلت آمیز یا تذلیل کن دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے اندر کوئی تلخی باقی نہیں ہے۔ اب وہ دور ایک بند باب کی طرح ہے۔ تم ماضی کی جدوجہد کی یاد میں تو زندگی نہیں گزار سکتی ہو، جب تم مکمل طور پر حال کی جدوجہد میں مصروف ہو۔

-3 15 جون 1978ء کو جنرل شوکت مجھے دیکھنے کے لیے آئے اس لیے کہ میں بیمار تھا۔ انہوں نے سول اور ملٹری ہاسپٹل راولپنڈی میں میرا آپریشن 1963ء میں کیا تھا جب میں وزیر خارجہ تھا۔ ہمیں یاد تھا کہ جب میں کلورو فارم کے اثر سے مغلوب ہوتا جا رہا تھا تو میں بار بار کہتا جا رہا تھا کہ میں اکبر بگٹی کو حکومت کے ہاتھوں موت کی سزا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اکبر بگٹی اور خیر بخش مری کے نام پکارتا رہا۔ تاریخی واقعات کا گھروندا کس قدر عجیب ہے؟ 1973ء میں پاکستان کے صدر کی حیثیت سے میری پاکستان کی خاطر ان ہی بلوچ لیڈروں سے محاذ آرائی ہوئی۔ اگر اتفاق سے تمہاری ملاقات ان لیڈروں سے ہو جائے تو اُن سے کہنا کہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ ایک بلوچ ایک بہادر باپ کا بیٹا اور ایک ایسی ماں کا بیٹا ہوتا ہے جس کو اپنے اُوپر فخر ہوتا ہے۔ بہادری اور فخر دونوں ہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے چہرے سے نمایاں ہوتے ہیں۔

-4 1957ء کے موسم سرما میں جب تم چار سال کی تھیں تو ہم ''المرتضیٰ'' کے بلند چبوترے پر بیٹھے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہوئے تھے۔ صبح کے وقت موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میرے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ ایک بیرل 22 اور دوسرا 480 کا تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک جنگلی طوطا مار گرایا۔ جب طوطا چبوترے کے قریب آ کر گرا تو تم نے چیخ ماری۔ تم نے اُسے اپنی موجودگی میں دفن کرایا۔ تم برابر چیختی رہیں۔ تم نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ ایک مردہ طوطے نے 1957ء کے موسم سرما میں لاڑکانہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کو رُلا دیا تھا۔ 21 سال بعد وہ چھوٹی سی لڑکی ایک نوجوان لڑکی بن گئی ہے جس کے اعصاب فولادی ہیں اور جو ظلم کی طویل ترین رات کی دہشت کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ حقیقتاً تم نے بلاشبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہادر سپاہیوں کا خون تمہاری رگوں میں موجزن ہے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ کمزوریوں سے پُر ہے۔ میں بارہ ماہ سے قید تنہائی میں ہوں اور تین ماہ سے موت کی کوٹھری میں ہوں اور تمام سہولتوں سے محروم ہوں۔ میں نے اس خط کا کافی حصہ ناقابل برداشت گرمی میں اپنی ران پر کاغذ کو رکھ کر لکھا ہے۔ میرے پاس حوالے دینے کا کوئی مواد یا لائبریری نہیں ہے۔ میں نے نیلا آسمان بھی شاذ و نادر ہی دیکھا ہے۔ حوالہ جات اُن چند کتابوں سے لیے گئے ہیں جن کو پڑھنے کی مجھے اجازت تھی اور اُن اخبارات و رسائل سے لیے گئے ہیں جو تم یا تمہاری والدہ اس دم گھوٹنے والی کوٹھڑی میں مجھ سے ہفتہ میں ایک بار ملاقات کرنے کے وقت ساتھ لے کر آتی ہو۔ میں اپنی خامیوں کے لیے بہانے نہیں تراش رہا ہوں۔ لیکن اس قسم کے جسمانی اور ذہنی حالات میں گرتی ہوئی یادداشت پر بھروسہ کرنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔

میں پچاس سال کا ہوں اور تمہاری عمر میری عمر سے نصف ہے۔ جس وقت تک تم میری عمر کو پہنچو گی تمہیں عوام کے لیے اس سے دوگنی کامیابی حاصل کرنی چاہیے جس قدر کہ میں نے اُن کے لیے حاصل کی ہے۔ میر غلام مرتضیٰ جو میرا بیٹا اور وارث ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہے اور نہ ہی شاہنواز اور صنم میرے ساتھ ہیں۔ میرے ورثہ کے حصہ کے طور پر اس پیغام میں اُن کو بھی شریک کیا جائے۔ میر سائیں رابرٹ کینیڈی کے بیٹے کا قریبی دوست ہے۔ (تلخیص)

ذوالفقار علی بھٹو
ڈسٹرکٹ جیل، راولپنڈی
21 جون 1978ء

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر کی اپنے پاپا سے آخری ملاقات

3اپریل 1979ء کو ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں سہالہ سے راولپنڈی جیل پہنچا دیا گیا۔ جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی۔ ایک مرتبہ جب ہم سہالہ کے قید خانہ سے روانہ ہوئیں اور دوسری مرتبہ جب ہم راولپنڈی جیل پہنچیں۔ ''آج تم دونوں اکٹھی کیوں آئی ہو؟'' میرے والد نے کال کوٹھڑی کے دوزخ سے آواز دی۔

میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

اس وقت میری والدہ جواب دینے کی سکت نہ رکھتی تھیں۔

''میرا خیال ہے ایسا ہی ہے،'' میں نے جواب دیا۔

وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو اشارہ کرتے ہیں جو پاس ہی کھڑا تھا۔

(یہ لوگ ہمیں پاپا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے۔)

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟ میرے والد پوچھتے ہیں۔''

''ہاں،'' جواب میں جیلر کہتا ہے۔ حکومت کا پیغام دیتے ہوئے شرم سار محسوس ہوتا ہے۔

''کیا تاریخ کا تعین ہو گیا ہے؟''

''کل صبح،'' جیل سپرنٹنڈنٹ کا جواب ہے۔

''کتنے بجے؟''

''جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے۔''

''یہ اطلاع تمہیں کب ملی؟''

''کل رات۔'' اُس نے رُکتے رُکتے جواب دیا۔

میرے والد اسے نظر بھر کے دیکھتے ہیں۔

''اپنے اہل وعیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے؟''

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''نصف گھنٹہ۔''

''جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹہ ملاقات کا حق ہے۔'' وہ کہتے ہیں۔

''صرف نصف گھنٹہ،'' سپرنٹنڈنٹ دہراتا ہے۔ ''یہ میرے احکامات ہیں۔''

''غسل اور شیو کرنے کے لیے انتظامات کرو۔'' میرے والد اُسے کہتے ہیں۔ ''دنیا خوبصورت ہے، اسے میں اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں۔''

''صرف نصف گھنٹہ'' اس شخص سے ملاقات کے لیے.....صرف نصف گھنٹہ جو مجھے زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ سینے میں درد سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ مجھے رونا نہیں چاہیے۔ مجھے اپنے ہوش بھی نہیں کھونے چاہئیں کیونکہ اس طرح میرے والد کی اذیت بڑھ جائے گی۔

وہ فرش پر پڑے گدے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کی کوٹھڑی میں اب صرف یہی فرنیچر باقی رہ گیا ہے۔ جیل حکام کرسی اور میز لے جا چکے ہیں۔ چارپائی بھی وہاں سے اُٹھائی جا چکی ہے۔ میگزین اور کتابیں جو میں پاپا کے لیے لاتی رہی تھی وہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''انہیں لے جاؤ، میں نہیں چاہتا یہ لوگ میری کسی چیز کو ہاتھ لگائیں۔''

وہ چند سگار جو اُن کے وکلاء وہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں آج شب کے لیے صرف ایک رکھ لیتا ہوں۔ شالیمار کولون کی شیشی بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھی مجھے دینا چاہتے ہیں لیکن میری والدہ انہیں کہتی ہیں ''اسے پہنے رکھیں۔'' وہ کہتے ہیں ''اچھا ابھی میں رکھ لیتا ہوں لیکن بعد میں بے نظیر کے حوالے کر دی جائے۔''

''میں نے ایک پیغام باہر کی دنیا تک پہنچا دیا ہے۔'' میں نے بہت آہستہ آہستہ انہیں بتایا (جیل کے حکام میری آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں۔)

میں تفصیلات بتاتی ہوں، وہ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ ''یہ سیاست کے اسرار و رموز میں ماہر ہو چکی ہے۔'' اُن کے چہرے کے تأثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موت کی کوٹھڑی میں روشنی مدھم سی ہے۔ میں انہیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قبل ہر ملاقات کوٹھڑی میں اُن کے پاس بیٹھ کر ہوتی رہی لیکن آج ایسا نہیں۔ کوٹھڑی کے باہر دروازے کی سلاخوں کے ساتھ میں اور میری والدہ سکڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ باتیں کھسر پھسر کے انداز میں کرتے ہیں۔ ''دوسرے بچوں کو میرا پیار دینا'' وہ میری ممی سے کہتے ہیں۔ میر، سنی اور شاہ کو بتانا میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی ہے اور میری خواہش ہے کہ کاش انہیں بھی الوداع کہہ سکتا۔'' میری والدہ سر ہلاتی ہیں، منہ سے کچھ نہیں بول سکتیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''تم دونوں نے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں۔'' وہ کہتے ہیں۔''وہ آج مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلے جاؤ جب تک آئین معطل ہے اور مارشل لاء نافذ ہے۔ اگر تمہیں ذہنی سکون چاہیے اور زندگی نئے سرے سے گزارنا چاہتی ہو تو یورپ چلی جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔'' (ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں) ''نہیں نہیں۔'' ممی کہتی ہیں۔''ہم نہیں جاسکتے۔ ہم کبھی نہیں جائیں گے۔ جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء نے انتخابات کا دوبارہ پروگرام بنایا ہے۔ اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت بھی کرے گا یا نہیں۔ ہم باہر چلی جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لیے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا۔''

''اور تم پنکی!'' میرے والد پوچھتے ہیں۔

''میں کبھی نہیں جاسکتی۔'' میرا جواب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں۔''میں بہت خوش ہوں۔ تم نہیں جانتی مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔''

''تم میری لعل ہو اور ہمیشہ ہی رہی ہو۔''

''وقت ختم ہو چکا۔'' سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔''وقت ختم ہو چکا۔'' میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں۔

''برائے مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو۔'' میں اسے کہتی ہوں۔''میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ میں دوبارہ التجا کرتی ہوں۔''میرے والد پاکستان کے منتخب وزیراعظم ہیں۔ میں اُن کی بیٹی ہوں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے ان سے مل لینے دو۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں۔ ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کی وجہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے لیکن وہ سیدھا اُٹھ بیٹھتے ہیں اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

''آج شب ملائم دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا۔'' چہرے پر ایک چمکتی روشنی لیے کہتے ہیں۔''میں اپنی والدہ اور والد کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تاکہ اس سرزمین کا، اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں۔''

''خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی۔ میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔''

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں''لیکن لاڑکانہ میں آج کل بہت گرمی ہے۔''

''میں وہاں ایک سائبان تعمیر کر دوں گی۔'' میں بمشکل کہہ سکی۔ جیل حکام آگے بڑھتے ہیں۔

''الوداع پاپا!'' میں والد کی طرف دیکھ کر پکار اُٹھتی ہوں اور میری ممی سلاخوں میں سے اُن کو چھو لیتی ہیں۔ ہم گرد آلود صحن سے گزرتے ہیں۔ میں مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے میں ضبط نہیں کر سکوں گی۔''ہم جب پھر ملیں گے، اس وقت تک خدا حافظ۔'' مجھے اُن کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تاہم میں چل پڑتی ہوں۔ مجھے چلنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا۔ میں پتھر بن چکی ہوں۔ جیل حکام ہمیں جیل وارڈ کے اندر واپس لے جاتے ہیں۔ صحن میں فوجیوں کے متعدد ٹینٹ ایستادہ ہیں۔ میں مدہوشی کے عالم میں چلی جا رہی ہوں۔ صرف اپنے سر کی موجودگی کا احساس ہے۔''سر بلند رہنا چاہیے۔ وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہیں۔''

مقفل دروازوں کے اندر کار ہماری منتظر ہے تاکہ باہر ہجوم ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میرا جسم اس قدر بوجھل ہو گیا ہے کہ کار کے اندر داخل ہونا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کار دروازوں کے بیچ میں سے تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم کے ایک سرے پر کھڑی اپنی دوست یاسمین پر اچانک میری نظر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں والد کے دینے کے لیے خوراک کا ٹفن کیریئر ہے۔

''یاسمین! وہ آج رات انہیں مار دیں گے۔'' میں کار کے شیشوں میں سے چلائی۔''کیا اس نے میری آواز سنی؟ کیا میں نے کوئی آواز نکالی بھی یا نہیں..... کیا کہہ سکتی ہوں۔''

صبح کے پانچ بج گئے، پھر چھ بجے..... ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کی آخری سانسوں کی یاد دلاتا۔''اے خدا! کوئی معجزہ رُونما ہو جائے۔'' میری ماں اور میں نے دعا مانگی۔''آج کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہیے۔'' میری بلّی چن چن جسے میں اپنے ساتھ قید خانے میں لے آئی تھی وہ بھی تناؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بلونگڑوں کو کہیں چھپا دیا تھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم ناقابل یقین اُمید کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ مزید برآں پھانسی دیئے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتہ قبل دن اور تاریخ کا تعین اعلانیہ کر دیا جائے لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پی پی پی کے رہنماؤں نے بھی یہ پیغام ارسال کیا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ امارات اور دوسرے ملکوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کر دے گا لیکن ضیاء کا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھٹو کی زندگی کی آخری رات

ذوالفقار علی بھٹو شہید کو 3 اور 4 اپریل کی درمیانی شب 2 بجے تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ دو بجے پھانسی دینا جیل قوانین کے منافی ہے اور عام طور پر موت کی سزا پانے والوں کو صبح طلوع ہونے سے کچھ وقت پہلے پھانسی دی جاتی ہے لیکن جنرل ضیاء اور اُن کے حواریوں نے یہی بہتر جانا کہ بھٹو کو رات کے اندھیرے میں پھانسی دی جائے تاکہ راتوں رات اُن کی میت کو لاڑکانہ پہنچا دیا جائے اور عوام تک اس پھانسی کی خبر پہنچنے سے پہلے انہیں دفن بھی کر دیا جائے۔ بھٹو کو رات کے اندھیرے میں موت کے گھاٹ اُتارا گیا اور اس سے قبل سینٹرل جیل راولپنڈی کو اس طرح سیل کر دیا گیا تھا کہ نہ کوئی چیز جیل کے اندر جاسکتی تھی اور نہ جیل سے باہر لائی جاسکتی تھی۔ جیل کے تمام ٹیلی فون کنکشن کاٹ دیئے گئے تاکہ جیل کے اندر کسی قسم کے رابطہ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اس وحشت ناک ماحول میں بھٹو پر پھانسی سے پہلے اور پھانسی کے وقت کیا گزری، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اکثر لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ پھانسی سے قبل بھٹو پر تشدد کیا گیا اور اسی تشدد سے اُن کی موت واقع ہوگئی تاہم اس بات کی تصدیق یا تردید تو صرف وہ چند افراد ہی کر سکتے ہیں جو پھانسی کی رات جناب بھٹو کے اردگرد موجود تھے اور ظاہر ہے یہ وہ لوگ تھے جو کسی بھی صورت میں بھٹو کے حامی نہیں تھے۔ اُن افراد میں مارشل لاء انتظامیہ کی طرف سے مقررہ کردہ سپیشل سکیورٹی سپرنٹنڈنٹ کرنل رفیع الدین بھی شامل تھے جن کے متعلق یہ اطلاع بھی بعض ذرائع ابلاغ تک پہنچی کہ انہوں نے بھٹو پر تشدد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ کرنل رفیع اپنے چند ساتھیوں سمیت بھٹو کے پاس آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک دستاویز تھی جس پر انہوں نے بھٹو صاحب کو دستخط کرنے کے لیے کہا۔ بھٹو نے مبینہ طور پر اس دستاویز پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت بھٹو کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ صحت متاثر ہو چکی تھی بھٹو اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ کرنل کے بار بار اصرار کے باوجود جب بھٹو نے انکار جاری رکھا تو کرنل نے انہیں اُٹھنے کا حکم دیا۔ بھٹو نے یہ حکم اَن سنا کر دیا جس پر کرنل نے زبردستی انہیں اُٹھا لیا اور زور سے دھکا دیا۔ بھٹو دیوار سے جا ٹکرائے۔ اس کے ساتھ ہی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ریکارڈ قانون سے بے اعتنائی اور جھوٹے وعدوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے مستقل خدشات کی بدولت جب بھی پھانسی کی حتمی تاریخ کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور لیبیا کے وزیراعظم نے فوراً بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ ''کیا انہوں نے بی بی سی پر میرا پیغام سن لیا تھا؟ کیا ابھی بھی اُن کے پاس پاکستان پہنچنے کا وقت تھا؟''

چینیوں کا ایک وفد اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد ہی نے پاکستان چین دوستی کا آغاز کیا تھا۔ کیا وہ ضیاء کو اپنے فیصلے سے منحرف کرا سکیں گے؟

میری والدہ اور میں سہالہ کی شدید گرمی میں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھی تھیں۔ ضیاء نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ وہ رحم کی اپیل اس وقت ہی سنے گا، اگر یہ میرے والد یا ہماری طرف سے کی گئی۔ میرے والد نے ایسا کرنے کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

موت کی جانب گنتی کے یہ لمحات کیسے گزرتے ہیں؟ میری والدہ اور میں گم سم بیٹھی تھیں۔ بعض اوقات ہم چلاتی بھی تھیں۔ جب ہم میں بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تو ہم بستر کے تکیوں پر گر گئیں۔ ''وہ اُن کی زندگی ختم کر دیں گے،'' میں متواتر سوچتی رہی۔ وہ اُن کی زندگی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُن کے اپنے احساسات اس بھرپور تنہائی میں کیسے ہوں گے جبکہ اُن کے پاس اس وقت کوئی بھی نہیں۔ انہوں نے اپنے پاس کوئی کتاب بھی نہیں رکھی۔ انہوں نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ صرف ایک سگار اُن کے پاس تھا۔ میرا گلا گھٹن سے جڑ گیا اور میں اسے پھاڑ کر کھول دینا چاہتی تھی لیکن میں ان پہریداروں کو جو ہماری کھڑکی کے باہر ہر وقت ہنستے اور باتیں کرتے رہتے تھے، اپنی چیخوں سے استہزاء کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ ''ممی! میں برداشت نہیں کر سکتی، بالکل نہیں کر سکتی۔'' آخر میں ڈیڑھ بجے کے قریب بالکل ٹوٹ گئی۔ وہ میرے لیے سکون آور گولیاں لائیں۔ ''سونے کی کوشش کرو۔'' انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں اپنے بستر پر اچانک اُٹھ بیٹھی..... والد کے گلے میں پھندا میں نے اپنے گلے کے اردگرد محسوس کیا۔

آسمانوں سے اس شب برف کے آنسو برسے۔ لاڑکانہ میں ہماری خاندانی زمینوں پر اولے پڑے۔ گڑھی خدا بخش میں ہمارے آبائی قبرستان میں فوجی دستوں کی ہلچل سے لوگ جاگ اُٹھے۔ جب میری والدہ اور میں اپنے قید خانے میں رات کے وقت کرب کی گھڑیاں گزار رہی تھیں، میرے والد کی میت گڑھی خدا بخش میں دفنانے کے لیے بذریعہ طیارہ لے جائی جا رہی تھی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کرنل نے اُن پر لاتوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اسی مار پیٹ میں بھٹو کے ہاتھ سے سونے کی انگوٹھی بھی نکل کر گر گئی اور چھوٹی میز پر پانی کا رکھا ہوا گلاس بھی ٹوٹ گیا۔ اس تشدد کے باوجود بھٹو نے تحریر پر دستخط کرنے سے انکار جاری رکھا تو کرنل تھک کر بھٹو کو زخمی حالت میں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ اُن کی پسلیوں میں شدید چوٹیں آئیں۔

بھٹو کی زندگی کی آخری رات اُن کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی رہی ہیں۔ تاہم آخری رات بھٹو کے پاس موجود انسپکٹر جنرل جیل پنجاب چودھری نذیر اختر، جیل سپرنٹنڈنٹ چودھری یار محمد، سپیشل سکیورٹی سپرنٹنڈنٹ کرنل رفیع الدین، جیل کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر اصغر علی شاہ، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر مجید قریشی، مجسٹریٹ بشیر احمد خان اور جلاد تارا مسیح کے مختلف انٹرویوز جو بھٹو کی پھانسی کے کچھ عرصہ بعد مختلف اخبارات و جرائد اور کتابوں میں شائع ہوئے، اُن کے مطابق بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو سے آخری ملاقات کے بعد بھٹو ذہنی طور پر پھانسی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے بتایا کہ پھانسی کی رات جب ایک بجے کا ظم بلوچ اور مجید قریشی نے بھٹو کو گہری نیند میں سوئے ہوئے پا کر اور یہ سوچ کر شاید وہ زندہ نہیں رہے تھے، پریشانی کے عالم میں مجھے آ کر بھٹو کے متعلق یہ اطلاع دی کہ انہیں نہ معلوم کیا ہو گیا ہے تو میں نے اپنا میڈیکل بکس اُٹھایا اور بھاگم بھاگ بھٹو کی کال کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ میں نے کال کوٹھڑی میں جا کر دیکھا، سابق وزیراعظم بلاشبہ بے حس پڑے تھے، وہ انتہائی گہری اور پُرسکون نیند سو رہے تھے۔ میں نے اسٹیتھو اسکوپ اُن کے سینے پر رکھی اور اُن کو زندہ سلامت محسوس کر کے مجھے اندر ہی اندر بے پناہ خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے انہیں اُوپر تلے دو تین آوازیں دیں، وہ بیدار تو نہیں ہوئے البتہ اس دوران انہوں نے نیند میں خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ اس دوران سپرنٹنڈنٹ جیل اور بعض دیگر حکام بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بھٹو کو خراٹے لیتے دیکھ کر وہ لوگ اطمینان سے واپس ہو گئے۔ جبکہ مجید قریشی کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ بھٹو صاحب کو نیند سے بیدار کر کے آخری رسومات کے لیے تیار کریں، ایک گھنٹہ بعد انہیں تختہ دار پر کھینچا جانے والا تھا۔ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ وہ 5 اپریل کا طلوع آفتاب اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکیں گے۔ موت کا تصور، بہت جی دار لوگوں پر خوف اور لرزہ طاری کر دیتا ہے اور پھانسی کے منتظر اکثر لوگ اپنی بہت سی راتیں جاگ کر گزارتے ہیں۔ وہ سونا چاہتے ہیں مگر اُن کے اعصاب پر موت کا خوف کچھ اس طرح طاری ہوتا ہے کہ انہیں کوشش کے باوجود نیند نہیں آتی۔ ایک یہ شخص تھا، بظاہر انتہائی کمزور اور ناتواں شخص، کہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ میں اس کی موت کا چرچا تھا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

گھر گھر اس کی متوقع پھانسی کا ذکر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی شام زندگی سے بہت زیادہ قریب ہو چکا ہے مگر موت سے صرف ایک گھنٹہ پہلے وہ انتہائی پُرسکون نیند سویا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اصغر علی شاہ کے مطابق، انہوں نے جب بھٹو کو پھانسی سے ایک گھنٹہ پہلے سکون اور اطمینان کی نیند سوتے ہوئے دیکھا تو انہیں گمان گزرا کہ جیسے بھٹو نے اپنی متوقع پھانسی پر یقین نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے بتایا کہ جب مجید قریشی بھٹو کو نیند سے بیدار کرنے میں ناکام رہا تو اس نے نبض دیکھنے کے بہانے بھٹو کی کلائی پکڑ کر انہیں جھٹکا دیا بھٹو نے نیم غنودہ کیفیت میں پوچھا ''کون ہے؟'' میں نے بتایا کہ میں ڈاکٹر اصغر ہوں اور مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے، بھٹو نے کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں ہوا ڈاکٹر! میں بالکل تندرست ہوں، جاؤ مجھے آرام کرنے دو۔'' اس موقع پر مجید قریشی نے کہا ''سر! آپ کا آخری وقت قریب آ چکا ہے۔'' بھٹو مجید قریشی کی اس بات پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ''سر! قریشی ٹھیک کہتا ہے، آپ اُٹھ کر غسل کر لیں ایک بج چکا ہے، آپ کو دو بجے پھانسی دے دی جائے گی۔''

مجید قریشی نے کہا ''سر! گرم پانی کا انتظام موجود ہے اور پھانسی کے تاریخی مرحلے کی طرف بڑھنے سے پہلے آپ کا غسل کرنا ضروری ہے۔'' بھٹو نے جواب دیا، ''میں پاک صاف ہوں، مجھے غسل کی ضرورت نہیں ہے البتہ اس وقت مجھے کافی کی طلب ہو رہی ہے'' اس دوران سکیورٹی فوج کے بعض افسران سمیت جیل کے تمام اعلیٰ افسران بھٹو کی کوٹھڑی میں پہنچ گئے۔ بھٹو نے اُن سب کے چہروں کو دیکھا۔

بشیر احمد خان مجسٹریٹ نے اُن سے کہا ''سر آپ نے کوئی وصیت لکھی ہو تو میں اس پر تصدیق ڈال دوں۔'' بھٹو مسکرائے اور بولے ''کیا بھٹو کے قلم سے لکھی گئی وصیت کو کسی چوہے افسر کی تصدیق کی ضرورت ہے۔'' سکیورٹی کے انچارج افسر بولے، ''اب وصیت لکھنے کا وقت گزر چکا ہے، یار محمد بلیک وارنٹ کی عبارت پڑھ کر سناؤ''۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے بلیک وارنٹ پڑھ کر سنایا اور بھٹو سے پوچھا۔ ''سر! آپ نے یہ سب سن لیا ہے۔''

بھٹو نے یار محمد کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

''مسٹر مجید قریشی میں نے تمہیں کافی کے لیے کہا تھا۔''

سکیورٹی سے تعلق رکھنے والے ایک اعلیٰ افسر نے اپنی کلائی گھڑی پر سے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب شاید بھٹو صاحب کی اس خواہش کو پورا کرنے کا وقت بھی باقی نہیں رہا ہے۔''

بھٹو بولے ''تم سب جلاد ہو، مجھے پھانسی دینے کے لیے باؤلے ہو رہے ہو۔ نہ وصیت لکھنے دیتے ہو اور نہ ہی ایک کپ کافی کا دے رہے ہو، جو جی میں آتا ہے کرو میں تعاون نہیں کرتا۔'' یہ کہہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کر بھٹو دوبارہ لیٹ گئے۔

یار محمد نے کہا۔ ''سر! آپ کے لیے اسٹریچر منگوایا جائے یا آپ پھانسی گھاٹ تک چل کر جانا پسند کریں گے۔''

بھٹو نے کوئی جواب نہیں دیا، انہوں نے آنکھیں موند لیں اور کروٹ بدل کر یہ ظاہر کیا کہ انہیں کسی کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ چودھری نذیر اختر نے بھٹو کو مخاطب کر کے کہا۔ ''سر! ہم حکم کے بندے ہیں، ہماری مجبوریوں کا خیال کریں۔'' بھٹو نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے، ''تم لوگ یہ تو کر سکتے ہو کہ ٹیلی فون پر میری بیوی سے میری گفتگو کرا دو۔''

چودھری نذیر اختر نے کرنل رفیع کی طرف دیکھا۔ کرنل رفیع نے برہم ہو کر کہا ''چودھری صاحب! آپ جانتے ہیں کہ اس وقت ہمارے پاس ٹیلی فون کا رابطہ نہیں ہے، پلیز اسٹریچر منگواؤ جلدی کرو۔''

کرنل رفیع کی اس بات پر بھٹو نے کہا ''اوہ! آئی سی۔'' کرنل رفیع کی بات کوٹھڑی سے باہر کوریڈور میں کھڑے سپاہیوں نے سن لی تھی۔ جیل پولیس کے چند سپاہی اسٹریچر لے کر کوٹھڑی میں آ گئے۔ دو سپاہیوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل کے اشارے پر بھٹو کو اُٹھا کر اسٹریچر پر بٹھا دیا اور ایک تیسرے سپاہی نے اُن کے بازو آگے کر کے ہتھکڑی لگا دی۔ اس وقت بھٹو اسٹریچر پر اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ بھٹو نے کہا ''میں خود چل کر سوئے دار چلوں گا۔'' انہوں نے کسی کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اُٹھ کر اپنی کال کوٹھڑی میں کوریڈور میں چلے آئے، سیل کا گیٹ عبور کرتے وقت اُن کا سر آہنی گیٹ سے ٹکرا گیا اور وہ گرتے گرتے بچے۔ انہوں نے ابھی چند قدم ہی اُٹھائے ہوں گے کہ انہیں ایک ٹھوکر لگ گئی۔ یار محمد نے کہا ''سر! بہتر ہے، اسٹریچر پر بیٹھ جایئے پھانسی گھاٹ خاصا دور ہے۔'' بھٹو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیل کے دو سپاہیوں نے اسٹریچر اُن کے آگے پھیلا دیا، وہ اسٹریچر میں ایک مرتبہ پھر بیٹھ گئے۔ چار سپاہیوں نے اسٹریچر اُٹھایا اور یہ قافلہ کال کوٹھڑی سے پھانسی گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک روز پہلے بارش کی وجہ سے راستہ خاصا خراب تھا، سب لوگ آگے پیچھے مختلف ٹولیوں میں بٹ کر پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھ رہے تھے، جن سپاہیوں نے اسٹریچر اُٹھا رکھا تھا، وہ چاروں آبدیدہ تھے۔ اسٹریچر کو پیچھے سے جن سپاہیوں نے اُٹھایا ہوا تھا اُن میں سے ایک تو باقاعدہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ بھٹو نے چہرہ گھما کر دیکھے بغیر کہا ''تم کیوں روتے ہو جوان، پھانسی تو مجھے دی جا رہی ہے۔''

جیل کے اس سپاہی کی سسکیاں پھر بھی جاری رہیں، حتیٰ کہ پھانسی گھاٹ آ گیا اور پھانسی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

گھاٹ کے چبوترے سے کچھ فاصلے پر اسٹریچر رکھا جا چکا ہے تو مجید قریشی نے اسٹریچر پر بیٹھے ملک کے سابق وزیراعظم کے کان میں سرگوشی کی ''سر تاریخ آپ کی طرف دیکھ رہی ہے۔''

بھٹو نے آنکھ اُٹھا کر مجید قریشی کی طرف دیکھا اور بولے ''تاریخ تم سب کو بھی دیکھ رہی ہے'' اور وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے انگریزی زبان میں کچھ کہا۔ جیل کے بعض افسران کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کے لیے یہ کہا تھا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے جب کہ بعض افسران کہتے ہیں انہوں نے اپنے ملک کے لیے یہ کہا تھا کہ ملک کا لیڈر اس سے چھینا جا رہا ہے۔ اس دوران اُن کی ہتھکڑی کھول کر اُن کے ہاتھوں کو پیچھے لے جا کر دوبارہ ہتھکڑی لگا دی گئی۔ ان سے پوچھا گیا کہ ''وہ خود پھانسی کے چبوترے پر چڑھ سکیں گے۔'' انہوں نے جواب دیئے بغیر چبوترے کی طرف قدم بڑھا دیئے اور خود کلامی کے سے انداز میں بولے:

''یہ مجھے تکلیف دیتا ہے۔''

اُن کا اشارہ غالباً ہاتھوں کے باندھے جانے کی طرف تھا۔ جب وہ پھانسی کے چبوترے کی طرف بڑھ رہے تھے بظاہر کسی کو بھی یہ یقین نہیں تھا کہ وہ آٹھوں زینے چڑھ سکیں گے کیونکہ اُن کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں، وہ انتہائی کمزور اور لاغر دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کی ٹانگیں اس طرح لگتی تھیں جیسے کسی بچے کی نحیف ٹانگیں ہوں۔ یہ ٹانگیں عام آدمی کے بازوؤں سے مشابہ تھیں۔ جب انہیں 70 کلفٹن سے گرفتار کر کے کوٹ لکھپت جیل میں بند کیا گیا تھا اس وقت اُن کا وزن ایک سو ساٹھ پونڈ تھا اور آج جب وہ تختہ دار کی طرف قدم اُٹھا رہے تھے، وہ صرف 80 پونڈ کے رہ گئے تھے۔ پھانسی کے چبوترے پر کھڑے ہو کر ملک کے سابق وزیراعظم نے گیس لیمپوں کی روشنی میں اور چاندنی میں دکھائی دینے والے آس پاس کے چہروں پر نظر ڈالی۔ بہت سے شناسا چہروں میں چند چہرے بالکل اجنبی تھے۔ انہوں نے گردوپیش پر نظر ڈالی اور بولے ''وہ دوسرے کدھر ہیں۔'' شاید انہوں نے پوچھا تھا کہ نواب محمد احمد خان کے مقدمہ قتل میں سزا پانے والے دوسرے لوگ کہاں ہیں۔ بہت سے سننے والوں کو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ انہوں نے کیا پوچھا تھا۔ جواب کسی طرف سے نہیں دیا گیا۔ بھٹو نے اپنے شناسا چہروں کی طرف دیکھا اور آٹھویں چبوترے پر کھڑے ہو کر اپنا دایاں پاؤں اُوپر اٹھایا اور زور سے چبوترے پر دے مارا۔

تارا مسیح نے اُن کے چہرے پر نقاب چڑھائی تو انہوں نے اس پر احتجاج کیا اور کہا ''اُتار دو، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' تارا مسیح نے نقاب چڑھانے کے بعد اُن کے گلے میں رسی ڈال کر گرہ لگا دی، ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے کہا ''سر! اپنا سانس اُوپر کھینچ لیں۔'' جب ڈاکٹر اُن سے یہ کہہ رہا تھا،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھٹو کچھ کہہ رہے تھے، شاید انہوں نے زندگی کے آخری لمحات میں خدا کو یاد کیا تھا۔ ابھی پھانسی کا لیور نہیں کھینچا گیا تھا کہ انہوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ''فنش اٹ۔'' تاہم بی بی سی پر بھٹو کی پھانسی کی خبر نشر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ پھانسی چڑھتے وقت بھٹو کے آخری الفاظ تھے:

''اے خدا میری مدد فرما..... میں بے گناہ ہوں۔''

یہ آخری الفاظ تھے جو انہوں نے کہے۔ اس وقت دو بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے، سپرنٹنڈنٹ جیل کے اشارے پر پھانسی کا لیور گرا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کا سب سے بڑا لیڈر گیارہ فٹ گہرے گڑھے میں معلق ہو گیا۔

پھانسی کے بعد لاش کو عام طور پر آدھ گھنٹہ سے پون گھنٹہ تک لٹکتے رہنے دیا جاتا ہے، مگر اس پھانسی کے بعد بعض افسروں کو اس قدر بے چینی تھی کہ ڈاکٹر کو صرف چند منٹ بعد پھانسی گھاٹ کے اندر جا کر چیک کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے پھانسی گھاٹ کے اندر ملک کے سابق وزیراعظم کو لٹکتے دیکھ کر اُن کی نبض دیکھی، انہیں لمحہ بھر کو یوں لگا، جیسے وہ ابھی زندہ ہوں اور پھر اگلے لمحے انہیں یوں محسوس ہوا جیسے انہوں نے بھٹو کی روح کو اپنی آنکھوں کے سامنے اُن کے قفس عنصری سے نکل کر خلا میں تیرتے ہوئے دیکھا ہو۔ ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے بتایا کہ پھانسی گھاٹ میں بھٹو کی لاش لٹکتے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئے، حالانکہ اس وقت تک پھانسی گھاٹ میں اُن کے علاوہ جیل کے چند افسر بھی آ چکے تھے۔ ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے اسٹیتھو اسکوپ سے سابق وزیراعظم کے سینے میں حرارت کا معائنہ کیا، حرکت قلب بند ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے باہر نکل کر سابق وزیراعظم کی موت کی تصدیق کے لیے بعض کاغذات پر دستخط کیے۔ بشیر احمد خان مجسٹریٹ نے اُن کاغذات پر تصدیق ڈالی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل یار محمد نے بلیک وارنٹ پر لکھا ''مجرم کو پھانسی پر لٹکا کر مار دیا گیا ہے'' اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیئے۔ دستخطوں کی اس کارروائی میں دس پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد جیل کے دو افسر، جلاد تارا مسیح کے بھانجے سمیت پھانسی گھاٹ کے اندر بھٹو کی لاش کو اُتارنے کے لیے چلے گئے۔ لاش کے گلے سے پھندا اُتار کر لاش کو اسٹریچر پر ڈال کر پھانسی گھاٹ سے باہر نکالا گیا۔ مجید قریشی نے بتایا کہ جب وہ پھانسی گھاٹ کے اندر پہنچا اور اس نے صادق مسیح کی مدد سے لاش کو اسٹریچر پر ڈالا تو اسے ایک دم یہ خیال آیا کہ پھانسی پر لٹکنے سے پہلے بھٹو صاحب نے ایک طلائی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ مجید قریشی نے صادق مسیح سے انگوٹھی کے بارے میں استفسار کیا۔ صادق مسیح انگوٹھی کو ابھی تک اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے تھا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں اپنی ہتھیلی کھول دی، طلائی انگوٹھی فرش پر گر گئی۔ مجید قریشی نے یہ انگوٹھی اُٹھا لی اور اسے امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کر لیا، بعد میں مجید قریشی نے سہالہ کیمپ جیل میں جا کر یہ انگوٹھی مس بے نظیر بھٹو کے سپرد کر دی۔ یہ بھٹو مرحوم کی شادی کی انگوٹھی تھی، بیگم نصرت بھٹو کی طرف سے بھٹو مرحوم کے لیے پیار کا سب سے پہلا تحفہ۔ جب یہ انگوٹھی مس بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ تک پہنچائی تو اس انگوٹھی کو دیکھ کر بیگم نصرت بھٹو رو پڑیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا پھوٹ نکلا، وہ کچھ لمحے اُونچی اُونچی بے اختیار سسکیاں لیتی رہیں۔ شاید انہیں اپنے محبوب شوہر کی رفاقتیں، محبتیں اور اُن کے عروج و زوال کے گزرے ہوئے لمحے یاد آ گئے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ مس بے نظیر بھٹو بھی ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔ یہ وہ دن تھا جب بھٹو کی لاش کو گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں سپرد خاک کیا جا رہا تھا۔

بھٹو کی لاش کو پھانسی گھاٹ میں سے نکال کر کچھ فاصلے پر ایک کونے میں غسل کے لیے لے جایا گیا، غسل کا انتظام پہلے سے کیا جا چکا تھا، غسل کے لیے گرم پانی موجود تھا۔ مولوی محمد حیات نامی ایک شخص کو پولیس ایک روز پہلے سے غسل کے لیے پکڑ لائی تھی۔ مولوی محمد حیات نے بھٹو کی میت کو غسل دیا۔ اس وقت بھٹو جیل کے لباس میں نہیں تھے انہوں نے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ بقول مولوی حیات محمد ''میں نے سینکڑوں مردوں کو نہلایا اور غسل دیا مگر جس قدر عقیدت کے ساتھ اس نے بھٹو کی میت کو غسل دیا وہ شاید ہی اتنی عقیدت سے کسی دوسرے کو غسل دے سکے۔ بھٹو کی میت انتہائی ہلکی پھلکی تھی، بالکل کسی بچے کی طرح۔ یہ غسل دو گیس لیمپوں کی روشنی میں دیا گیا تھا۔ غسل کے بعد اس نے بھٹو مرحوم کی میت کو چارپائی پر ڈالا اور جیل حکام کی طرف سے مہیا کیا گیا کفن اوڑھا دیا۔ بھٹو کا چہرہ انتہائی معصوم اور پُروقار تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی معصوم بچہ ہو، جیسے کسی فرشتے کا چہرہ ہو۔ چہرے سے روشنی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ جس وقت بھٹو کو غسل دیا گیا جیل کے احاطے میں بہت سے لوگ کھڑے تھے مگر ہر سو سکوت طاری تھا، سناٹا اور خاموشی تھی جیسے سارا ماحول سوگوار ہو گیا ہو، کسی مدھر اور پُرکیف نغمے کی طرح۔ مولوی حیات محمد نے بتایا کہ بھٹو کی میت اس قدر ہلکی تھی کہ وہ آسانی کے ساتھ اکیلا اس میت کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سمجھتا ہے کہ قدرت نے اتنے بڑے آدمی کو بہت بڑی سعادت اور سربلندی دی ہے، لوگ اسے تاریخی شخصیت سمجھتے ہیں۔

مولوی حیات محمد نے بتایا کہ غسل سے پہلے اور بعد میں ایک فوٹو گرافر نے بھٹو کی میت کی تصویریں بنائی تھیں۔ وہ لمحے انتہائی ستم ظریف تھے کہ پاکستان کا ایک ''بادشاہ'' اگلے جہاں جا رہا تھا مگر اس کی میت کو غسل دیئے جانے کے وقت جیل میں کوئی بھی فاتحہ پڑھنے والا موجود نہیں تھا۔ شاید وہ اکیلا شخص تھا جس نے جیل میں بھٹو کی میت پر فاتحہ پڑھی تھی۔ مولوی حیات محمد نے بتایا کہ جیل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شاہ نواز بھٹو کی پُراسرار موت

شاہ نواز بھٹو 1979ء سے 1984ء تک ضیاء الحق کے خلاف منصوبے بناتے بناتے تھک گئے تھے کیونکہ 84-1983ء میں ضیاء الحق کے قریبی رفقاء نے شاہ نواز اور مرتضیٰ دونوں کو پیغام دیا تھا کہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کا سلسلہ ختم کر دیں اور اگر ایسا نہ کیا گیا اور ضیاء الحق کو قتل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کا سلسلہ برقرار رہا تو اسی قسم کی کارروائی بھٹو خاندان کے افراد کے خلاف بھی کی جا سکتی ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز کے درمیان ضیاء الحق کی طرف سے بھجوائی جانے والی اس دھمکی کے حوالے سے متعدد مرتبہ گفتگو ہوئی اور آخر کار دونوں میں یہ طے پایا کہ وہ فی الحال ضیاء الحق کے خلاف موت کا کوئی دستہ پاکستان نہیں بھجوائیں گے۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز کے اس فیصلے سے ضیاء الحق کو جنوری 1985ء میں آگاہ کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی بھی یہی خواہش تھی کہ فی الحال ضیاء الحق کو قتل کرنے کا منصوبہ ختم کر دیا جائے کیونکہ مارشل لاء حکومت نے ماضی کی طرح ایک مرتبہ پھر انتخابات کرانے کے لیے ایک نئی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو 25 فروری 1985ء کو ہونے والے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار تھیں لیکن ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کی اکثریت نے غیر جماعتی انتخابات کو خلاف جمہوریت قرار دے کر ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرائیں۔ ایم آر ڈی میں شامل زیادہ تر جماعتوں کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد ہونے والے انتخابات میں ان کے اُمیدوار کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے کے لیے غیر جماعتی انتخابات کی مخالفت شروع کر دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان دنوں لندن میں تھیں، جب 19 جنوری 1985ء کو ایم آر ڈی کے اجلاس کے لیے ایبٹ آباد کا انتخاب کیا گیا۔ ضیاء الحق نے ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کے اندر اپنے ایجنٹ داخل کر رکھے تھے، جنہیں یہ مشن سونپا گیا تھا کہ وہ ہر صورت میں غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کرائیں۔ نتیجتاً وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، یعنی ایم آر ڈی کی مرکزی کمیٹی نے عام انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ کرانے والوں نے دلیل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

والوں نے اگلے روز اسے رخصت کرتے وقت 30 روپے معاوضہ دینا چاہا تھا مگر اس نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔ جیل والوں نے سمجھا کہ میں پیسے کم ہونے کی وجہ سے نہیں لے رہا، انہوں نے مجھے پچاس روپے دینے کی کوشش کی تو میں نے کہا:

''بھائی لوگو! میں نے جس شخص کی میت کو غسل دیا وہ ہمارا بادشاہ رہ چکا ہے اور میرے لیے یہی سعادت کافی ہے کہ میں نے اپنے بادشاہ کی میت کو غسل دیا ہے۔''

مولوی حیات محمد بھٹو کی میت کو غسل دے کر کفن اوڑھا چکے تو میت پر مختلف خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ یہ خوشبوئیں پھانسی کی نگرانی کرنے والے فوجی ہی لائے تھے۔ بھٹو کی میت کو تابوت میں رکھ کر راولپنڈی سنٹرل جیل کے مین گیٹ کے بجائے عقبی دیوار توڑ کر باہر نکالا گیا اور ایک ویگن میں رکھ کر ایئرپورٹ تک لے جایا گیا۔ جیل کے مین گیٹ کی طرف سے تابوت کو محض اس لیے نہیں نکالا گیا کہ اس طرف سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جیل کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو کی میت کو جس خصوصی طیارے کے ذریعے اسلام آباد سے سکھر لے جایا جا رہا تھا، اس کے پائلٹ کو اس بات کا علم تک نہیں تھا کہ وہ کس مشن پر جا رہا ہے۔ پرواز کے دوران اسے سیکنڈ پائلٹ نے جب یہ بتایا کہ طیارے میں بھٹو کی میت کو لے جایا جا رہا ہے تو وہ اس قدر آزردہ خاطر ہوا کہ طیارے پر کنٹرول نہیں رکھ سکا اور اسے اپنے حواس پر قابو پانے کے لیے طیارے کو راستے میں کچھ دیر کے لیے سرگودھا ایئرپورٹ پر اُتارنا پڑا۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ طیارے میں کوئی خرابی ہو گئی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا طیارے میں کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔ طیارے کا پائلٹ سابق وزیراعظم کی پھانسی اور اُن کی میت کے طیارے میں موجود ہونے کی خبر پر حواس باختہ ہو گیا تھا اور شاید یہ بہت حد تک ایک فطری ردِعمل بھی تھا۔

اس طیارے کی اسلام آباد سے پرواز کے ساتھ، ایک عظیم سیاست دان اور کروڑوں عوام کے محبوب ترین قائد کے عروج و زوال کی کہانی بظاہر مکمل ہو گئی تھی مگر یہ سفر ابھی باقی تھا۔ بھٹو کے عروج اور اقتدار کا سفر ابھی باقی تھا۔ بھٹو نے ایک زمانے میں مس بے نظیر بھٹو کو کہا تھا۔ ''میں قبر میں لیٹ کر اس ملک پر حکومت کروں گا۔'' اور اس وقت کو واپس لانے کے لیے سابق وزیراعظم نے اپنی نوجوان بیٹی کو اپنی وارث قرار دیا تھا۔ اسے تلقین کی گئی تھی کہ وہ اپنے پاپا کی کھوئی ہوئی کرسی حاصل کیے بغیر اپنے لیے شہنائیوں کی بزم نہیں سجائے گی۔ سعادت مند بیٹی نے اپنے عظیم باپ کے اس حکم کو دل و جان سے قبول کر لیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پیش کی کہ ضیاء الحق بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے کبھی بھی یہ نہیں پسند کریں گے کہ ایم آر ڈی میں شامل جماعتیں انتخابی عمل سے باہر رہ جائیں، لیکن اس قسم کی سوچ رکھنے والوں کی خوش فہمی نے پی پی پی کو پارلیمانی سیاست سے آؤٹ کر دیا۔ انتخابات کے بعد 5 مارچ کو ناصر بلوچ اور 26 مارچ 1985ء کو ایازسموں کو پھانسی دے دی گئی۔ ان دونوں پر الذوالفقار کی مدد سے ملک میں دہشت گردی کی وارداتیں کرنے کا الزام تھا۔ شاہ نواز بھٹو جو زیرِ زمین سرگرمیوں اور مافیا کے ساتھ کام کرتے کرتے تھک چکے تھے، ناصر بلوچ اور ایازسموں کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر Active ہو گئے اور انہوں نے اپنی والدہ کو 28 مارچ 1985ء کو فون کر کے کہا کہ وہ بے گناہوں کے قتل پر مزید خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کریں گے۔ ''میں ضیاء الحق سے بدلہ لوں گا،'' شاہ نواز نے اپنی افغان بیوی ریحانہ کو کہا جن کے ساتھ اُن کی زندگی اب اس قدر خوشگوار نہ رہی تھی جس قدر لطف کے لمحات وہ 83-1981ء میں گزار چکے تھے۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ تھی کہ شاہ نواز کو ریحانہ کے بارے میں شک ہو گیا تھا کہ وہ پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ہاتھوں استعمال ہونا شروع ہو گئی ہے۔ شاہ نواز اور ریحانہ کا 85-1984ء کے دوران متعدد مرتبہ جھگڑا ہوا اور ایک مرتبہ تو شاہ نواز نے ریحانہ کو قتل کرنے کی ٹھان لی لیکن اپنی تین سالہ بچی ستی کی وجہ سے اُن کے ہاتھ رُک گئے۔ شاہ نواز بنیادی طور پر جاسوس طبیعت کے حامل نوجوان تھے۔ دہشت گردی کی وارداتیں کرنے اور انہیں ناکام بنانے کے سلسلے میں اُن کا ذہن کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ ایک مبینہ رپورٹ کے مطابق انٹرنیشنل مافیا کے ساتھ روابط ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے پاس ایسا زہر رکھتے تھے جو چند سیکنڈوں کے اندر انسان کو زندگی کے بوجھ سے آزاد کر سکتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو جب پتہ چلا کہ شاہ نواز ذہنی طور پر بہت الجھا ہوا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی ہے تو وہ جولائی 1985ء میں فرانس کے شہر کینز (Canes) گئیں جہاں مرتضیٰ بھی موجود تھے۔ بے نظیر کی چھوٹی بہن صنم بھٹو بھی فرانس پہنچ گئیں اور 17 جولائی 1985ء کو برسوں بعد خاندان کے تمام افراد نے مل کر کھانا کھایا اور خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ 17 جولائی 1985ء کی رات ضیاء الحق کو فرانس کے پاکستانی سفارت خانے میں متعین ایک انٹیلی جنس آفیسر کے ذریعے کینز (Canes) میں بھٹو خاندان کے تمام افراد کے جمع ہونے کی اطلاع ملی۔ اس بات کا تا حال پتہ نہیں چل سکا کہ ضیاء الحق نے شاہ نواز کے بارے میں آنے والی ٹاپ سیکرٹ رپورٹ کے بارے میں کیا فیصلہ کیا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگلے روز شاہ نواز اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت کا فوری ردِّعمل یہ تھا کہ شاہ نواز کو ضیاء الحق نے قتل کرایا ہے۔ لیکن کسی کے پاس اس کا ثبوت موجود نہ تھا۔ اس کی بنیادی وجہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

یہ تھی کہ شاہ نواز مرحوم جس رات فوت ہوئے اس شام اُن کی اہلیہ ریحانہ گھر میں موجود تھیں۔ چونکہ شاہ نواز اور ریحانہ کے تعلقات مثالی نہیں رہے تھے، اس لیے جب شاہ نواز کے کمرے سے اُن کے کراہنے کی آواز آئی تو ریحانہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ریحانہ کی اس بے حسی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاہ نواز ڈرامہ کر رہے ہیں۔ اس وقت جب کہ شاہ نواز کے جسم سے جان نکل رہی تھی اُن کی اہلیہ انتہائی سکون سے دوسرے کمرے میں آرام فرما رہی تھیں۔ فرانس کی پولیس نے اسی لیے ریحانہ کو گرفتار بھی کیا اور اُن پر مقدمہ بھی چلا کیونکہ پولیس کے لیے یہ حیرت ناک بات تھی کہ کسی شخص کی جان نکل رہی ہو اور اُس کی اہلیہ اُس کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کرے۔ شاہ نواز 18 جولائی 1985ء کو پُراسرار ماحول میں فوت ہوئے اور فرانس کے جاسوسی ادارے تمام وسائل ہونے کے باوجود اس خفیہ ہاتھ کو بے نقاب نہ کر سکے جو شاہ نواز کی موت کا باعث بنا۔ ریحانہ کا دعویٰ تھا کہ شاہ نواز نے خودکشی کی جبکہ مرتضیٰ اور بے نظیر اس واہیات بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مرتضیٰ بھٹو، جنہوں نے الذوالفقار کے نام سے ایک انٹیلی جنس ونگ بھی قائم کر رکھا تھا، نے کئی سال تک یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ اُن کے بھائی کو کس نے قتل کیا لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان تمام کوششوں کے دوران مرتضیٰ کو صرف اتنا ہی پتہ چل سکا کہ شاہ نواز کی وفات سے چند گھنٹے قبل ایک مرسیڈیز گاڑی اُن کے فلیٹ کے سامنے آ کر رُکی تھی، جس میں سوار افراد جتنی تیزی سے شاہ نواز کے کمرے میں گئے وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ واپس بھی چلے گئے اور جاتی دفعہ انہوں نے کوئی ایسا ثبوت باقی نہ چھوڑا جس سے پتہ چلایا جا سکتا کہ شاہ نواز کی موت کی وجہ کیا تھی؟ ضیاء الحق اور دیگر جرنیلوں کو شاہ نواز کی وفات کی خبر 18 جولائی 1985ء کو پہنچی۔ شاہ نواز نے 17 جولائی 1985ء کو بے نظیر بھٹو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے روز انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلائے گا لیکن شاہ نواز اور بے نظیر کی اکٹھے مل بیٹھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ''مجھے پتہ نہیں کہ ہمارے خاندان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' بے نظیر بھٹو نے فرانس سے 19 جولائی 1985ء کو کراچی میں اپنی کزن فخری بیگم سے فون پر بات چیت کرتے ہوئے کہا۔ بے نظیر بھٹو کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ صدمے سے نڈھال ہیں۔ شاہ نواز کے انتقال کی خبر 19 جولائی 1985ء کو پوری دنیا میں پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق لاڑکانہ پہنچ رہے تھے جہاں بھٹو خاندان کے سربراہ میر نبی بخش بھٹو تعزیت کے لیے آنے والوں کے ساتھ بیٹھے آنسو بہا رہے تھے جبکہ خواتین کو حوصلہ دینے کے لیے شاہ نواز کی سوتیلی ماں شیریں امیر بیگم نوڈیرو میں موجود تھیں۔ محمد خاں جونیجو نے، جو غیر جماعتی انتخابات کے بعد وزیرِاعظم بن چکے تھے، فوری طور پر بیگم نصرت بھٹو کے نام ایک تعزیتی پیغام بھجوایا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جب کہ ضیاء الحق بھی اس معاملے میں اُن سے پیچھے نہ رہے اور انہوں نے بھی بھٹو خاندان سے شاہ نواز کی ناگہانی وفات پر انتہائی دلی افسوس کا اظہار کیا۔ شاہ نواز اپنے بہن بھائیوں میں سب سے کم عمری میں فوت ہوئے۔ اُن کی تاریخ پیدائش یکم نومبر 1957ء تھی۔

فرانسیسی پولیس 18 جولائی سے 18 اگست تک شاہ نواز کے قتل کا راز تلاش کرنے کے لیے کوشاں رہی لیکن پوسٹ مارٹم اور ابتدائی تفتیش کے دوران پتہ نہ چل سکا کہ شاہ نواز کی موت خودکشی کے باعث واقع ہوئی یا انہیں قتل کیا گیا۔ 20 جولائی 1985ء کو بیگم نصرت بھٹو، مرتضیٰ، صنم اور بے نظیر نے فیصلہ کیا کہ شاہ نواز کو اُن کے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں سپرد خاک کیا جائے گا جب کہ اُن کے جسد خاکی کو پاکستان لے کر بے نظیر جائیں گی۔ مرتضیٰ چاہتے تھے کہ وہ اپنے بھائی کی میت کو کندھا دینے کے لیے خود پاکستان جائیں لیکن بیگم نصرت بھٹو نے انہیں اس بات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ پولیس اور فوج مرتضیٰ کو ائیر پورٹ پر ہی گرفتار کر لے گی اور نتیجتاً مرتضیٰ کو پھانسی کی سزا بھی دی جا سکتی تھی کیونکہ اُن کے خلاف دہشت گردی کروانے کے الزام میں درجنوں مقدمات درج کیے جا چکے تھے۔ فرانسیسی حکام نے شاہ نواز کی لاش بھٹو خاندان کے حوالے 6 اگست 1985ء کو ہی کر دی تھی لیکن پاکستانی سفارت خانے نے متعلقہ کاغذات کی تیاری میں کافی وقت ضائع کر دیا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ ضیاء الحق نہیں چاہتے تھے کہ بھٹو خاندان کے افراد شاہ نواز کی لاش لے کر پاکستان آئیں کیونکہ پی آئی اے کے طیارے کے اغوا ہونے کے بعد عوام میں الذوالفقار کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی اور بے نظیر بھٹو کے دوبارہ وطن پہنچنے کے بعد پی پی پی کی مقبولیت کا گراف ایک مرتبہ پھر اُوپر جا سکتا تھا۔ مرتضیٰ نے فرانس سے مخدوم خلیق الزماں کو پیغام بھجوایا کہ وہ شاہ نواز کی تدفین کے لیے انتظامات کریں۔ مخدوم خلیق الزماں نے بے نظیر بھٹو کے کزن مشتاق بھٹو کے ساتھ مل کر تجہیز و تدفین کے انتظامات شروع ہی کیے تھے کہ حکومت نے مخدوم خلیق الزماں کو گرفتار کر لیا۔ بے نظیر بھٹو 21 اگست 1985ء کو اپنے بھائی کی لاش لے کر کراچی ائیر پورٹ پر اُتریں۔ مولانا احترام الحق تھانوی نے شاہ نواز بھٹو کی نماز جنازہ پڑھائی۔ 23 اگست 1985ء کو شاہ نواز کے سوئم میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ بے نظیر ناصر بلوچ اور ایاز سموں کے گھر بھی جانا چاہتی تھیں لیکن فوجی حکام نے انہیں 27 اگست 1985ء کو 3 ماہ کے لیے 70 کلفٹن پر نظر بند کر دیا۔ حالانکہ پاکستان نے امریکہ اور مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کے سفارت کاروں کو یقین دلایا تھا کہ بے نظیر بھٹو کو شاہ نواز کی لاش لانے پر گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو کی گرفتاری پر سب سے پہلے امریکہ نے ردّعمل کا مظاہرہ کیا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جبکہ یکم ستمبر 1985ء کو امریکی سفیر ڈین ہمٹن نے سندھ کے گورنر جنرل جہانداد خاں سے ملاقات کی اور انہیں امریکی حکومت کے جذبات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی نظر بندی سے امریکہ کو سخت تشویش ہوئی ہے۔ اگر امریکی سفیر نے عام حالات میں اس طرح کے ردّعمل کا مظاہرہ کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ضیاء الحق بے نظیر کی نظر بندی فوراً ہی ختم کر دیتے لیکن انہوں نے افغانستان کے مخصوص حالات کے باعث امریکی سفیر کے مؤقف کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف قرار دیتے ہوئے ڈین ہمٹن پر واضح کیا کہ وہ واشنگٹن حکام کے کہنے پر نہ تو کسی کو گرفتار کریں گے اور نہ ہی کسی مجرم کی رہائی عمل میں آئے گی۔ لیکن ضیاء الحق اپنے اس مؤقف پر زیادہ دیر تک ڈٹے نہ رہ سکے اور انہیں بین الاقوامی دباؤ پر بے نظیر کی نظر بندی کو ختم کرنا پڑا، جنہیں 3 نومبر 1985ء کو کڑی نگرانی میں فرانس روانہ کر دیا گیا۔ بے نظیر نے 6 نومبر 1985ء کو فرانس کی عدالت میں شاہ نواز کے مقدمہ قتل کے حوالے سے اپنا بیان ریکارڈ کرایا، جس کے ایک ہفتے بعد ریحانہ کو رہا کر دیا گیا اور ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ 30 دسمبر 1985ء سے قبل مارشل لاء اُٹھائیں گے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور اُن کی والدہ نے ضیاء الحق کے اس اعلان کے بعد پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کر لیا جب کہ مرتضیٰ نے کہا کہ میں اپنے والد اور بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد ہی وطن آؤں گا اور ظاہر ہے کہ وہ ضیاء الحق کو اپنے والد اور بھائی کا قاتل سمجھتے تھے جو ایک خوفناک سازش کا شکار ہو کر 17 اگست 1988ء کو ایک طیارے کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ بھٹو خاندان کے لیے ضیاء الحق کی موت خوشی و مسرت کا باعث اگر نہ بھی تھی تو کم از کم یہ سانحہ اُن کے ذہنی سکون کا باعث ضرور بنا لیکن یہ بہت ہی کم افراد کو معلوم تھا کہ ضیاء الحق اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے اور اُن کے قتل کی سازش کو بے نقاب کرنے والے خفیہ ہاتھ مسلسل سرگرم رہے اور 20 ستمبر 1996ء کو یعنی شاہ نواز کی وفات کے 11 برس بعد جب مرتضیٰ پولیس مقابلے میں ہلاک کیے گئے تو ملک کے کسی نہ کسی کونے میں وہ لوگ بھی اپنے ذہنوں سے ایک بوجھ اُترا ہوا محسوس کر رہے تھے جنہیں شک تھا کہ ضیاء الحق کی ہلاکت میں الذوالفقار کا ہاتھ ہے۔ خود بے نظیر بھٹو کو اُن کے اپنے ہی ساتھی سردار فاروق احمد لغاری نے 4 نومبر 1996ء کی رات اقتدار سے محروم کر دیا۔ بے نظیر کا دیگر جرائم کے علاوہ ایک جرم یہ بھی تھا کہ انہوں نے انتہائی خاموشی کے ساتھ ایف آئی اے کی ایک ٹیم فرانس روانہ کی تھی تاکہ شاہ نواز کے اصل قاتلوں کا پتہ چلایا جا سکے۔ قبل اس کے کہ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی شاہ نواز کے قاتلوں تک پہنچ پاتیں، خفیہ ہاتھ ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا اور بھٹو خاندان کے سب سے اہم فرد مرتضیٰ کو جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا گیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو نے اپنی کتاب ''دختر مشرق'' میں اپنے بھائی شاہ نواز کی پُراسرار موت کا احوال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ہم ساری رات گپ شپ کریں گے تم ضرور آؤ، پنکی!''

''اچھا! میں بھی چلوں گی،'' میں اپنے بھائی کو انکار نہ کر سکی۔

''بہت اچھا! لیکن کل کا پروگرام نہ بھول جانا،'' اس نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ جب ہم نے خریداری کے لیے جانا تھا جس میں میری والدہ کی طرف سے میری سالگرہ کا تحفہ بھی شامل تھا۔ ''میں لوئی ویٹان کی مارکیٹ کا ماہر ہوں۔ کل ہم جب بھی بیدار ہوئے میں تمہیں خریداری کے لیے نیس لے جاؤں گا۔''

تجاویز، بہت سی عمدہ تجاویز۔ شاہ اور ریحانہ اپنی پکنک کی ٹوکری لیے اپنے فلیٹ کی طرف چل دیئے۔ صنم اور ناصر کو آنٹی بہجت اور انکل کریم نے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ میر اور فوزیہ نے میری والدہ، میری کزن کو اور مجھے ہمارے فلیٹ میں چھوڑا اور خود فتحی کو شاہ کے فلیٹ میں سلانے کے لیے چل دیئے۔ ''شاہ اور میں آدھ گھنٹے میں واپس آ کر تمہیں لے چلیں گے،'' میر نے جاتے جاتے کہا۔

وہ واپس اکیلا ہی آیا۔

''خوش مزاج شاہ جسے ہم نے ساحل پر چھوڑا تھا، وہ شدید غصے میں تھا جب ہم اُن کے فلیٹ پر پہنچے۔'' میں نے اُسے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میر نے کہا، لیکن شاہ کے جواب دینے سے قبل ہی ریحانہ چیخ پڑی۔ ''نکل جاؤ باہر نکل جاؤ! یہ میرا فلیٹ ہے۔'' وہ چلاتی رہی۔ وہ جنونی ہو چکی تھی۔ ''مت جاؤ،'' گوگی نے مجھے کہا لیکن میں دونوں کے درمیان پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ پُرسکون ہو جائے اگر فوزیہ اور میں اُن کا فلیٹ چھوڑ دیں۔''

''تو فوزیہ کہاں ہے؟'' والدہ نے پوچھا۔

''وہ نیچے کار میں ہے اور بہت گھبرائی ہوئی ہے،'' میر نے کہا۔ ''وہ سیدھا ابھی جنیوا جانا چاہتی ہے۔ اس وقت نصف شب ہے۔ میں نے اُسے بتایا اور علاوہ ازیں میری ہمشیرہ ابھی ابھی پہنچی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ میں اپنے اہل خاندان سے کبھی کبھار ہی ملتا رہا ہوں اور میں تم سب لوگوں کے پاس ٹھہروں گا۔ لیکن ہمیں اپنی تمام شام برباد نہیں کرنا چاہیے۔ چلیں ہم اپنی تجویز پر عمل کریں۔''

''تم سب جاؤ،'' میں نے صنم، ناصر اور میر کو بتایا۔ ''میں طویل دن کے بعد تھک چکی ہوں۔''

''مجھے پڑھ کر سنائیں، آنٹی! مجھے پڑھ کر سنائیں،'' فتحی نے اگلے روز میرا ناطقہ بند کر دیا۔ صنم،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ناصر اور میر صبح چھ بجے تک واپس نہیں آئے تھے اور ہم سب دیر سے سوئے تھے۔ میں ابھی تک اپنے شب خوابی کے لباس میں گھوم رہی تھی جب ایک بجے دوپہر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔

''آنٹی کو اب تیار ہو کر بازار جانا ہے،'' میں نے فتحی کو کہا یہ سوچ کر کہ شاہ مجھے نیس لے جانے کے لیے آ پہنچا ہے۔

اس کے بجائے صنم بیڈ روم میں دوڑتی ہوئی آئی۔ ''جلدی کرو، ہمیں بعجلت جانا ہے،'' اس نے اپنی بچی کو مجھے پکڑاتے ہوئے کہا جب کہ میں ابھی پوری طرح تیار بھی نہیں ہوئی تھی۔

''کیا معاملہ ہے؟'' میں نے اُسے پوچھا۔

''ریحانہ کہتی ہے گوگی نے کچھ کھا لیا ہے،'' صنم نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے جلدی میں کہا۔

میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں نے سنبھلنے کے لیے گہرا سانس لیا۔

''کیا وہ بیمار ہے؟ کیا یہ نازک معاملہ ہے؟'' میں نے کہا جیسے ہی وہ ہال سے باہر نکلی۔

''ہم نہیں جانتے، یہ ہم دیکھیں گے،'' اس نے جواب دیا اور چلی گئی۔

میں وہاں فتحی اور ننھی بچی کے ساتھ اکیلی کھڑی تھی۔

''پولیس، پولیس کو اطلاع دو'' میں نے گود میں بے بی کو سہلاتے ہوئے فون پر ہنگامی حالت کا نمبر تلاش کرنا شروع کیا۔ پھر میں نے وہ نمبر ملایا، اور فرانسیسی زبان میں ریکارڈ کیا ہوا پیغام موصول کیا۔ میں نے ٹیلی فون کی کتاب اُٹھائی اور ہسپتالوں کے نمبر دیکھنا شروع کیے۔ اتنے میں میری والدہ اور صنم واپس بھاگتے ہوئے آئے۔ میر اور ناصر پہلے ہی ریحانہ کے ساتھ شاہ کے فلیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ گلی میں ٹیکسی نہ ملنے کی وجہ سے میری والدہ اور صنم اسے حاصل کرنے کے لیے وہاں آئے تھے۔

''ممی! آپ فرانسیسی زبان مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ اگر پولیس نہیں مل رہی کم از کم ہسپتال تو ملا دیں،'' میں نے انہیں جلدی میں کہا۔

''ہم سیدھا وہاں کیوں نہ چلے جائیں ہو سکتا ہے وہ ٹھیک ہی ہو،'' انہوں نے کہا۔

''نہیں ممی، احتیاط بہتر ہوتی ہے ٹونی کو یاد کریں،'' میں نے انہیں یاد دہانی کراتے ہوئے کہا کہ اس لڑکی نے گولیوں کی زیادہ خوراک کھا لی تھی اور ہسپتال جانے میں دیر ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکی تھی۔ مجھے اپنا تجربہ بھی یاد ہے جب 70 کلفٹن کو پولیس نے محصور کیا ہوا تھا۔ وہ وقت یہ جاننے کا نہیں تھا کہ پولیس کیوں آئی تھی۔ پہلے تمام کاغذات جلا ڈالو اور پھر پوچھو۔''

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

میری والدہ نے ٹیلی فون کی کتاب اُٹھائی، انہوں نے ایک ہسپتال کا نمبر ملایا۔ انہوں نے ایک دوسرے ہسپتال کا نمبر دیا۔ ''اس ہسپتال کو ملاؤ کسی اور کو ملواؤ،'' انہوں نے جواب دیا۔ وہ تیسرے ہسپتال کو فون کر رہی تھیں کہ میرا اندر آ گیا۔

وہ ٹوٹا ہوا اور پٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ خاموشی سے اُس نے کہا اور میں نے اُس کے ہونٹ ہلتے دیکھے۔ ''وہ مر چکا ہے۔''

''نہیں،'' میں چلائی۔ ''نہیں۔''

میری والدہ کے ہاتھ سے ٹیلی فون گر گیا۔

''یہ سچ ہے، ممی!'' میر نے کرب کے ساتھ کہا۔ ''میں نے مردہ اشخاص دیکھے ہیں۔ شاہ کا جسم ٹھنڈا ہے۔''

ممی نے رونا شروع دیا۔

''ایمبولنس بلاؤ،'' میں نے کہا۔ ''خدا کے لیے ہسپتال ٹیلی فون کرو۔ ہوسکتا ہے وہ ابھی زندہ ہو، اسے دوبارہ ہوش میں لایا جاسکتا ہے۔'' مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی میں اپنے بازوؤں میں تھامے بے بی کا کیا کروں۔ فتحی میری ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی اور مجھے تک رہی تھی۔

میری والدہ نے ٹیلی فون کو فرش سے اُٹھایا۔ تیسرا ہسپتال ابھی لائن پر تھا۔

''ہمیں بتائیں کہاں جانا ہے؟'' آپریٹر، جس نے ہماری چیخیں سن لی تھیں، نے کہا۔ ہم دروازے سے باہر کو بھاگے۔

شاہ نواز رہائشی کمرے میں کافی کے میز کے ساتھ قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے کل شب والی سفید پتلون ابھی تک پہنی ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ باہر کو پھیلا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت بھورے رنگ کا ہاتھ۔ وہ سوئے ہوئے ایڈونس کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

''گوگی،'' میں چلائی اور اُسے جگانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر میں نے اُس کی ناک دیکھی۔ وہ چاک کی طرح سفید تھی اور اُس کی سرخ ناک سے بالکل مختلف۔

''اسے آکسیجن دو،'' میں ایمبولینس کے عملے پر چلائی جو اُس کی نبض دیکھ رہے تھے۔ ''اس کے دل کی مالش کرو۔''

''وہ مر چکا ہے،'' عملہ میں سے ایک نے خاموشی سے کہا۔

''پنکی! وہ بالکل ٹھنڈا ہے،'' میر نے کہا۔ ''وہ گھنٹوں سے ٹھنڈا ہے۔''

میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کافی کی میز ٹیڑھی تھی۔ ایک بھورے رنگ کا سیال مادہ چھوٹی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

میز پر طشتری میں پڑا تھا۔ تکیہ کاؤچ سے آدھا اُترا ہوا تھا اور پھولوں کا گل دان گرا ہوا تھا۔ میری آنکھیں اس کی ڈیسک کی طرف اُٹھیں۔ چمڑے کی فائل غائب تھی۔ میں نے چبوترے کی طرف دیکھا۔ اُس کے کاغذات وہاں پڑے تھے۔ فائل کا فولڈر کھلا ہوا تھا۔

کوئی خطرناک قسم کی غلطی نظر آ رہی تھی۔ اس کا جسم ٹھنڈا تھا۔ خدا جانتا ہے کب سے؟ شاہ وہاں پڑا مر رہا تھا۔ لیکن کوئی اس پر بیدار نہیں ہوا اور کسی نے اس کے کاغذات کی تلاشی میں کافی وقت صرف کیا تھا۔

میں نے ریحانہ کو دیکھنے کے لیے نظر اُٹھائی۔ وہ مطلقاً ایسی عورت نہیں لگ رہی تھی جس کا شوہر فوت ہو چکا ہو اور جس نے امداد حاصل کرنے کی تگ و دو کی ہو۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کی سفید سوتی جیکٹ پر کوئی بل نہیں تھا۔ بال بنے ہوئے تھے۔ کوئی ایک بال بھی بکھرا نہیں تھا۔ اس نے بننے سنورنے میں کتنے گھنٹے لگائے ہوں گے جب کہ میرا بھائی فرش پر مردہ پڑا تھا؟ اس نے میری طرف نظر اُٹھائی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

اس کے ہونٹ ہلے۔ میں بالکل نہ سن سکی کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

''زہر،'' اُس کی بہن نے بتایا وہ کہہ رہی تھی۔ ''اُس نے زہر کھا لیا تھا۔''

مجھے اس کا یقین نہیں آیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی یقین نہ کیا۔ شاہ زہر کیوں کھائے گا؟ وہ کل رات جتنا خوش و خرم تھا پہلے کبھی نہیں تھا۔ وہ اپنے مستقبل کی تجاویز پر عمل کرنے میں پُر جوش تھا۔ ماہ اگست میں افغانستان واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا اس سب کا یہ نتیجہ تھا۔ کیا ضیاء کو شاہ کی تجاویز کا پتہ چل چکا تھا اور اس نے پہلے سے اس کا توڑ کر لیا تھا؟ یا کیا سی آئی اے نے اپنے پسندیدہ آمر کو خوش کرنے کے لیے اسے مار دیا تھا؟

''خدا کے لیے شاہ کے جسم کو ڈھانپ تو دو،'' صنم نے کہا۔ کوئی سفید پلاسٹک کا ایک ٹکڑا لے آیا۔

''آنٹی، آنٹی! کیا معاملہ ہے؟'' ننھی فتحی میری قمیض کا کنارہ کھینچتے ہوئے پوچھتی رہی۔

''کچھ نہیں، پیاری بیٹی!'' میں غائبانہ طور پر تین سالہ بچی کو مطمئن کرتی رہی۔ سسی بھی بہت پریشان اور مخبوط الحواس لگتی تھی۔ کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتی اور اپنے باپ کے جسم کے ساتھ جا کر لگ جاتی۔ ''بچوں کو کمرے سے باہر لے جاؤ،'' میری والدہ نے کہا۔ میں انہیں سسی کے سونے کے کمرے میں لے گئی اور انہیں ایک کتاب دے دی۔

جب پولیس شاہ کی نعش کو لینے آئی تو میر نے مجھے باورچی خانہ میں بھیج دیا۔ ''تم یہ منظر نہیں دیکھ سکو گی،'' اُس نے کہا۔ میں نے چولہے پر فرائی پین میں ابھی تک پکے ہوئے انڈے اور آدھے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کٹے ہوئے ٹماٹر پر نظر دوڑائی۔ یہ سب کس کے لیے؟ میز پر دودھ کی بوتل بھی پڑی تھی۔ دن بہت گرم ہونے کی وجہ سے دودھ دہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اسے فریج سے باہر کیوں دھرا رہنے دیا گیا؟ ''وہ شاہ کو لے گئے ہیں،'' میر نے باورچی خانے میں آ کر بتایا۔ پولیس نے کہا ''اسے دل کا دورہ پڑا معلوم ہوتا ہے۔''

وہ اپنے چہرے سے آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے مڑا۔ جب اُس نے ٹشو کا کاغذ ردی کی ٹوکری میں ڈالا تو اُس کی نگاہ ایک چمکتی ہوئی چیز پر پڑی۔ یہ زہر کی خالی شیشی تھی۔

فرانسیسی حکام نے کئی ہفتوں تک شاہ کی میت ہمارے حوالے نہ کی۔ انتظار کرب انگیز تھا کیونکہ ہم سب والدہ کے فلیٹ میں جمع ہو گئے تھے۔ بطور مسلمان ہم اپنے مردوں کو 24 گھنٹے کے اندر اندر دفن کر دیتے ہیں مگر شاہ کی میت پر ٹیسٹ کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم کیا کریں۔ ہم رو لیتے، بیٹھے رہتے یا آسمان کی طرف گھورتے رہتے۔ کسی کو کھانے، پینے یا کچھ کرنے کی آرزو نہیں تھی۔ ہمارے پاس صنم کی بے بی، میر کی بیٹی تھی اور اکثر سسّی کو بھی فوزیہ اس وقت چھوڑ جاتی جب ریحانہ کو تفتیش کے سلسلہ میں پولیس اسٹیشن جانا پڑتا۔ ''ہمیں جھولوں تک لے جاؤ،'' ننھی بچیاں مجھ سے التجا کرتیں اور میں انہیں نزدیکی پارک میں جھولوں تک لے جاتی۔ بعض اوقات میر بھی میرے ساتھ شامل ہو جاتا۔ جب لڑکیاں کھیل رہی ہوتیں میر اور میں ایک بنچ پر بیٹھ جاتے اور سمندر کو خاموشی سے تکتے رہتے۔

میرا دل سسّی کے لیے بہت دُکھتا۔ وہ اپنے باپ کی بہت چہیتی بیٹی تھی۔ شاہ صبح سویرے اُسے جگاتا، اُس کا ناشتہ تیار کرتا اور رفع حاجت بھی کراتا۔ تقریباً تین سالہ سسّی جانتی تھی کہ اس کے پاپا زندہ نہیں رہے۔ جب میر فتحی کو لینے آتا تو وہ بھی پکارتی۔ ''میرا پاپا، میرا پاپا؟'' جب کار ''لانپولے'' کے ساحل سمندر کے پاس سے گزرتی جہاں ہم سب نے باربی۔ کیو کھایا تھا تو سسّی چلاتی۔ ''پاپا شاہ، پاپا شاہ۔'' پولیس والے قالین کا وہ حصہ کاٹ کر لے گئے تھے جہاں شاہ کا جسم پایا گیا تھا۔ جب ریحانہ نے وہاں نیا قالین بچھا لیا تو سسّی اُس جگہ کی طرف اشارہ کرتی جہاں اُس نے اپنے والد کو آخری وقت دیکھا تھا۔ ''پاپا شاہ، پاپا شاہ،'' وہ پکارتی رہتی۔ وہ ہم سے چمٹ جاتی جب بھی ہم اُسے فوزیہ کے پاس واپس چھوڑنے جاتے۔ وہ اُس گھر میں جانا نہ چاہتی اور اپنے بازو مضبوطی سے ہماری گردنوں کے گرد لپیٹ لیتی۔ ''جاؤ ننھی بے بی،'' میں آہستہ سے اُس کے کان میں کہتی جب کہ فوزیہ اُسے اپنی طرف کھینچتی۔ لیکن سسّی اور زیادہ سختی سے چمٹ جاتی۔ ہمیں اُس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے لیے اُس کے ہاتھوں کو کھولنا پڑتا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شاہ کی میت کے حصول کے لیے اس طرح بیٹھے رہنا کافی وحشت ناک تھا۔ ہر چیز مجھے اس کی یاد دلاتی تھی۔ مجھے ہر جگہ شاہ نظر آتا، کارلٹن ہوٹل میں بیٹھا ہوا، کرائے سیٹ میں چلتا ہوا۔ اس کے کھو جانے کا غم اور بھی بڑھ جاتا جب پاکستانی اخبارات میں مستقلاً اس کی ملامت اور مذمت میں خبریں چھاپی جاتیں۔ حکومت کے جی حضوری اخبارات لکھتے کہ شاہ مایوسی کا شکار تھا، جوئے باز تھا اور خودکشی پر آمادہ شخص تھا۔ جس رات وہ مرا وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا، اُن کا دعویٰ تھا۔ لیبارٹری کی رپورٹیں اُن کے دعویٰ کی نفی کرتی تھیں لیکن ایسی رپورٹیں پاکستانی پریس میں کوئی جگہ نہ پاتیں۔ اب جب کہ شاہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اس کے دشمن بہرطور اس کے وقار اور عزت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور میرے بھائی کی میت کے حصول میں تاخیر ہمارے کرب کو مزید بڑھاتی جاتی۔

''میں شاہ کی میت کو دفنانے کے لیے پاکستان لے جا رہی ہوں،'' میں نے ایک سہ پہر اہل خاندان کو بتایا۔

میری والدہ تقریباً پاگل ہو گئیں۔ ''اوہ پنکی! تم واپس نہیں جاؤ گی،'' وہ چلائیں۔ ''میں اپنے بیٹے کو گنوا بیٹھی ہوں میں اب اپنی بیٹی کو گنوانا نہیں چاہتی۔''

''شاہ نے سب کچھ میرے لیے کیا۔ مگر اپنے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے کبھی نہیں کہا تھا۔'' ''وہ لاڑکانہ واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ اکثر پوچھتا کہ پاپا کو کہاں دفن کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کی تصویر اُتار لے۔ میں اسے گھر لے جاؤں گی۔''

''میر! اسے بتاؤ یہ گھر واپس نہیں جائے گی،'' میری والدہ میرے بھائی سے التجا کرتی ہیں۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔

''اگر تم واپس جاتی ہو تو میں بھی جاؤں گا،'' اُس نے مجھے کہا اور مجھے ڈرا کر نہ جانے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ہم سب جانتے تھے کہ ضیاء یقیناً اُسے قتل کر دے گا۔

''تم مت جاؤ، میں جاؤں گی،'' آنٹی بہجت نے کہا۔

''میں جاؤں گی،'' صنم نے کہا۔

''میں جاؤں گا،'' ناصر نے کہا۔

''ٹھیک ہے ہم سب اکٹھے جائیں گے،'' میں نے کہا۔ میں نہیں چاہتی کہ شاہ کو خاموشی سے خفیہ طور پر دفنا دیا جائے۔ میں چاہتی ہوں اس کی عزت اور وقار کے شایان شان اسے دفن کیا جائے۔''

جب بے نظیر اپنے بھائی کی لاش لے کر لاڑکانہ پہنچیں تو پانچ لاکھ افراد نے تجہیز و تکفین کی رسومات میں شرکت کی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو کی شادی

بھٹو شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتے رہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی پیاری بیٹی کی شادی کر سکیں مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ بھٹو شہید نے سرحد اور پنجاب کے سیاسی خاندان کے نوجوان سے بے نظیر بھٹو کی شادی کے بارے میں سوچا تھا مگر اُن کے اقتدار کے خاتمے کی وجہ سے یہ سوچ پروان نہ چڑھ سکی اور اُن کی شہادت کے بعد یہ ذمہ داری بیگم نصرت بھٹو کے کندھوں پر آن پڑی۔ نواب شاہ سندھ کے معروف سیاست دان حاکم علی زرداری کے فرزند آصف علی زرداری کے مقدر کا ستارہ چمک اُٹھا اور اُن کی منگنی بے نظیر بھٹو سے ہو گئی۔ 1988ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی نمبر ون قائد بن چکی تھیں اور انہیں پاکستان کی وزیراعظم کے طور پر دیکھا جا رہا تھا۔

بھٹو کی شہادت کے غم کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کی شادی بھٹو خاندان کی پہلی خوشی تھی جسے عوامی سطح پر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ 18 دسمبر 1987ء میں منعقد ہونے والی پاکستان کی تاریخ میں یہ ایک منفرد عوامی تقریب تھی۔ شادی کی اس تقریب میں پارٹی کے کارکنوں کو شرکت کی اجازت تھی۔ شادی کی رسم کو دیکھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ کراچی کی ککری گراؤنڈ میں موجود تھے۔ پورے پاکستان سے سیاست دان، قومی اور عالمی صحافی، انڈین فلم سٹار اور سول سوسائٹی کے نمائندے تقریب میں شرکت کے لیے پہنچے۔ دنیا کے ملکوں کے سفارتی نمائندے بھی تقریب میں موجود تھے۔

بے نظیر بھٹو سفید اور سنہری شلوار قمیض میں ملبوس سب کی توجہ کا مرکز تھیں اور اُن کے شوہر آصف زرداری سفید شلوار قمیض زیب تن اور سر پر روایتی پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ بے نظیر بھٹو کے لیے شادی کی یہ تقریب ایک سیاسی جلسہ ہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ اس جلسے میں اُن کے ساتھ اُن کا شوہر بھی بیٹھا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو مہمانوں کے ساتھ خوش و خرم بیٹھی تھیں۔ ماں اپنی بڑی بیٹی کی شادی کا خوشگوار فرض پورا ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ککری گراؤنڈ کے قرب و جوار میں غریب عوام رقص کر رہے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تھے، لڈیاں اور بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ یہ اُن کے لیے انتہائی خوشی کا دن تھا۔ اُن کی مقبول سیاسی رہنما کی شادی ہو رہی تھی۔ پورا علاقہ روشنیوں کا شہر بنا ہوا تھا۔ ہر گلی کوچے میں جیو بھٹو کے ترانے بج رہے تھے۔ ککری گراؤنڈ کے اردگرد کی تمام عمارتوں پر چراغاں کیا گیا تھا۔ مختلف رنگ کے قمقمے رنگوں کا نور بکھیر رہے تھے۔ یہ ایک دنگ کرنے والا سماں تھا۔ عوام نے ایسی شادی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ککری گراؤنڈ دلہن سے بڑھ کر دلہن لگ رہی تھی۔ عوام درختوں، دیواروں اور چھتوں پر چڑھ کر دلہا دلہن کو ایک نظر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ککری گراؤنڈ میں داخلے کے لیے ایک وی آئی پی گیٹ بنایا گیا تھا۔ سیکورٹی کے مسلح اہلکار عوام کو الگ تھلگ رکھنے کی جستجو کر رہے تھے۔ اس کے باوجود کئی وی آئی پی مہمان عوام کے دھکوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ لٹھ بردار کارکن موجود تھے جو عوام کو اپنی حدود میں رکھنے میں مصروف رہے۔ عابدہ خانم، محمد علی شہکی اور شوکت علی نے موقع کے مطابق شادی کے گیت گا کر سماں باندھ دیا۔ پورے لیاری میں بے مثال آتش بازی کی گئی۔ آسمان مختلف رنگ کی روشنیوں سے جگمگا اُٹھا۔ آتش بازی کے ماہرین لاہور سے بلائے گئے تھے۔ اچانک دلہن سٹیج سے اُٹھی اور تالیوں کی گونج میں تقریب کے ہزاروں شرکاء سے خطاب کیا اور برق رفتاری کے ساتھ تقریب سے باہر چلی گئیں۔ دلہا اور دلہن 70 کلفٹن کی جانب روانہ ہو گئے۔

زرداری ہاؤس کراچی میں ولیمے کی تقریب بھی پُروقار تھی۔ خوبصورت شامیانے لگائے گئے تھے۔ دلہا، دلہن اور وی آئی پی مہمانوں کے لیے تین سٹیج بنائے گئے تھے۔ بے نظیر نے انڈین لہنگا زیب تن کر رکھا تھا جس پر گلابی اور سنہری کام کیا گیا تھا۔ دوپٹہ ایک کندھے پر لٹک رہا تھا۔ شامیانوں کے نیچے زمین پر خوبصورت قالین بچھائے گئے تھے۔ مہندی کی تقریب بھی شاندار اور یادگار تھی۔ 70 کلفٹن کے ساتھ سڑکوں پر مہندی کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں بھٹو اور زرداری خاندان کے افراد شریک ہوئے۔ آصف زرداری روایتی انداز میں داخل ہوئے۔ مردوں نے سفید لباس اور اجرک کی چادریں زیب تن کر رکھی تھیں۔ بے نظیر کی سہیلیوں اور کزن نے تقریب کو یادگار بنا دیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور صنم بھٹو اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکیں۔ یہ خوشی اور غم کے ملے جلے آنسو تھے۔ اس تقریب میں بھٹو شہید اور شاہ نواز بھٹو شہید اور مرتضیٰ بھٹو موجود نہیں تھے۔ بے نظیر بھٹو کے عزیز و اقارب، دوستوں، سفیروں، صحافیوں، کارکنوں اور سیاسی رہنماؤں نے انہیں اس قدر شادی کے گفٹ دیئے کہ سیاسی تاریخ میں شاید ہی کسی اور سیاست دان کے لیے اس قدر محبت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم

بے نظیر بھٹو کا سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اُن کی زندگی کی خواہش تھی کہ وہ کسی معیاری اخبار کی ایڈیٹر بن جائیں یا کسی یورپی ملک کی ترجیحی طور پر برطانیہ میں پاکستان کی سفیر تعینات ہو جائیں۔ 1977ء میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ بے نظیر بھٹو کو سیاسی میدان میں اُترنا پڑا۔ وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پاکستان واپس آ گئیں تا کہ اپنے بابا ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قتل کے مقدمے کی پیروی کر سکیں۔ وہ بھٹو شہید کے وکلاء کی معاونت کرتیں۔ جب لاہور ہائی کورٹ کے بنچ نے بھٹو شہید کو موت کی سزا سنا دی تو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو یقین ہو گیا کہ سپریم کورٹ بھی لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھے گی تو اُنہوں نے مارشل لاء کے خاتمے، جمہوریت کی بحالی اور بھٹو کی رہائی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ بیگم نصرت بھٹو چونکہ صحت کی خرابی کی بنا پر سرگرم کردار ادا کرنے سے قاصر تھیں لہٰذا نوجوان بے نظیر بھٹو نے تحریک کی قیادت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ پی پی پی کے کارکنوں کو نیا حوصلہ ملا اور اُنہوں نے ''بھٹو کی تصویر بے نظیر'' کے پُر جوش نعرے لگا کر بے نظیر بھٹو کا سیاست میں خیر مقدم کیا۔ بے نظیر بھٹو نے جرأت اور بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو للکارا۔ پی پی پی کے سینئر لیڈر اگر مصلحت کا شکار نہ ہوتے اور اپنے قائد سے بے وفائی نہ کرتے تو بے نظیر بھٹو ایک مؤثر و فعال تحریک چلانے میں کامیاب ہو جاتیں۔ پی پی پی کے کارکنوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر قربانیاں دیں۔ اُنہوں نے اپنے ننگے جسموں پر کوڑے کھائے، جیل کی صعوبتیں اور قلعوں کے تشدد برداشت کیے۔ ہزاروں کارکن جلا وطن ہوئے۔ درجنوں پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔ پنجاب کے آٹھ جیالے کارکنوں نے خود کو نذر آتش کر لیا۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ انتہائی طاقت ور ہے اس کے مقابلے میں سیاسی جماعتیں کمزور ہیں۔ سپریم کورٹ کے بنچ کے سات ججوں میں سے چار نے لاہور ہائی کورٹ کی سزائے موت کو بحال رکھا جبکہ تین ججوں نے بھٹو کو بری کرنے کا فیصلہ سنایا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے 3 اپریل کو بھٹو شہید سے موت کی کوٹھڑی میں آخری ملاقات کی۔ سنگ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نچھاور کی گئی ہو۔

بے نظیر کی شادی کی تقریب ایک منفرد تاریخی واقعہ تھا جسے نسل در نسل یاد رکھا جائے گا۔ بے نظیر کی 1986ء میں لندن سے لاہور آمد اور 2007ء میں دبئی سے کراچی آمد کی بھی مثال دی جایا کرے گی۔ وہ 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ سے جس شان و شوکت کے ساتھ اس دنیا سے رُخصت ہوئیں اسے دلیری کی علامت کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ بے نظیر زندہ بھی بے نظیر تھیں اور شہید ہو کر بھی بے نظیر ہیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

دل حکام نے ایک بیٹی کو اپنے باپ سے آخری بار گلے ملنے کی اجازت نہ دی اور کوٹھڑی کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ وقت کے یزید نے بھٹو کی بیگم اور بیٹی کو آخری دیدار کا موقع بھی نہ دیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند رکھا گیا اور بھٹو کو فوج کے پہرے میں گڑھی خدا بخش (لاڑکانہ) میں دفن کر دیا گیا۔

اس المناک شہادت کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے پاکستان میں رہ کر پی پی پی کی قیادت کرنے اور سیاسی جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مارشل لاء کے خاتمے کے لیے سیاسی جماعتوں کا اتحاد ایم آر ڈی وجود میں آیا۔ جنرل ضیاء الحق اور اُن کے رفقاء بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے عزم اور بہادری سے دنگ رہ گئے۔ ایم آر ڈی کی تحریک منظم اور فعال ہو رہی تھی کہ پی آئی اے کا ایک طیارہ ہائی جیک کر کے کابل لے جایا گیا جس کی ذمہ داری الذوالفقار کی تنظیم نے قبول کر لی۔ الذوالفقار مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو کی سربراہی میں مصروف عمل تھی۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے اس تنظیم سے مکمل طور پر قطع تعلقی کا اعلان کر رکھا تھا۔ پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کے بعد جنرل ضیاء الحق نے پی پی پی اور ایم آر ڈی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو عتاب کا نشانہ بنایا۔ بے نظیر بھٹو کو سکھر جیل میں قید رکھا گیا جبکہ بیگم نصرت بھٹو کبھی کراچی اور کبھی لاہور میں نظر بند رہیں۔ عالمی دباؤ کے پیش نظر جنرل ضیاء الحق نے بے نظیر بھٹو کو کان کے علاج کے لیے بیرون ملک جانے کی اجازت دے دی اور وہ کافی عرصہ جلاوطن رہیں مگر اُنہوں نے بھرپور سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

1985ء میں شاہ نواز بھٹو فرانس میں پُراسرار طور پر وفات پا گئے۔ بے نظیر بھٹو اپنے نوجوان بھائی کی لاش لے کر پاکستان پہنچیں تو پانچ لاکھ افراد اُن کے سوگ میں شریک ہونے کے لیے موجود تھے۔ شاہ نواز کے جنازے میں شریک لاکھوں افراد نے غم زدہ بہن کو حوصلہ دیا۔ بے نظیر کو دھمکیاں دی گئی تھیں کہ اگر وہ اپنے بھائی شاہ نواز کی لاش کے ہمراہ پاکستان واپس آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ بے نظیر ایک بہادر باپ کی بیٹی تھیں انہوں نے دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے نوجوان بھائی کی آخری رُسومات میں شرکت کی۔

بے نظیر بھٹو نے 1986ء میں اپنی جلاوطنی ختم کر کے پاکستان واپس آنے کا اعلان کیا وہ 10 اپریل 1986ء کو لاہور ایئرپورٹ پر اُتریں تو عوام کا سمندر اُن کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ افراد نے بے نظیر بھٹو کا پُرجوش اور ولولہ انگیز استقبال کیا۔ پاکستان

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کے عوام نے بے نظیر بھٹو کو پہلی خاتون وزیراعظم کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ بے نظیر بھٹو کی چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر میں خوشبو کی طرح پذیرائی حاصل ہوئی اور انہیں ''چاروں صوبوں کی زنجیر'' تسلیم کر لیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اندرونی اور بیرونی دباؤ کے پیش نظر اگست 1988ء میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ مگر انتخابات سے پہلے اُن کا طیارہ فضا میں کریش ہو گیا اور ضیاء الحق اپنے رفقاء کے ہمراہ جاں بحق ہو گئے۔

ضیاء الحق کی باقیات ہر قیمت پر بے نظیر بھٹو کا راستہ روکنا چاہتی تھیں۔ وہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی وزیراعظم کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا اسٹیبلشمنٹ اور آئی ایس آئی نے پی پی پی کے مقابلے میں آئی جے آئی تشکیل دے دی۔ آئی ایس آئی کے سابق ڈی جی جنرل (ر) حمید گل نے آئی جے آئی بنانے کا کھلا اعتراف کیا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ نے پوری کوشش کی کہ بے نظیر بھٹو اس قدر نشستیں حاصل نہ کر سکیں کہ وہ حکومت بنانے کے قابل ہو جائیں۔ اسٹیبلشمنٹ کی سازشوں اور دھاندلی کے باوجود پاکستان کے عوام نے پی پی پی کے اُمیدواروں کے حق میں فیصلہ دے دیا اور پی پی پی نے اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لی۔ پاکستان کے بیوروکریٹ صدر غلام اسحاق خان اور فوجی افسروں نے پوری کوشش کی کہ میاں نواز شریف مرکز میں حکومت بنانے کے قابل ہو جائیں۔ بے نظیر بھٹو کے مقدر میں پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہونا لکھا تھا۔ بھٹو کی شہادت، بے نظیر بھٹو کی بصیرت، جدوجہد اور پارٹی کارکنوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور بے نظیر بھٹو نے 2 دسمبر 1988ء کو پاکستان کی پہلی منتخب خاتون وزیراعظم کی حیثیت میں حلف اُٹھایا۔ ایک مذہبی ریاست جس میں مردوں کی مکمل بالادستی ہے، وہاں ایک لبرل خاتون کا وزیراعظم منتخب ہونا سیاسی معجزہ تھا۔

یہ دسمبر کی ایک ٹھنڈی دوپہر تھی جب پاکستان میں ایک تاریخ وجود میں آ رہی تھی۔ ایک نوجوان خاتون جس نے ابھی اپنی عمر کے تین عشروں سے کچھ ہی زائد برس گزارے تھے، تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مسلمان مملکت کی وزارت عظمیٰ کا حلف اُٹھانے جا رہی تھی۔ اسے ملک کے تیرہ کروڑ عوام کی اکثریت نے ووٹ کے ذریعے منتخب کیا تھا۔ اُسے قائدانہ کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کی مذہب، نسلی منافرت، صوبائیت اور جنس کی بنیاد پر کی جانے والی تمام سازشیں بُری طرح ناکام ہو گئیں۔ ہم عصر اسلامی دنیا کی تاریخ میں یہ کبھی نہیں سُنا گیا کہ ایک خاتون کو ملک کی قیادت کے لیے چُنا گیا ہو۔ وہ پہلی مثال تھیں اور اُن کا دوسرا امتیاز یہ تھا کہ وہ پوری دُنیا میں سب سے کم عمر سربراہ مملکت منتخب ہوئی تھیں۔ مسلسل گیارہ سال تک ایک فوجی آمر کے ہاتھوں وہ بدترین ظلم اور زیادتی کا نشانہ بنی رہیں لیکن فوجی حکمران کی جانب سے اُن کے ارادے کو بدلنے کی ناکام کوششوں کے باوجود

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اُنہوں نے ہار نہیں مانی اور اس کے خلاف دیوانہ وار جدوجہد جاری رکھی اور آخری مرحلے پر اُنہوں نے فتح حاصل کی۔ یہ حقیقت افسانے سے زیادہ حیران کن تھی۔

یہ 2 دسمبر 1988ء کو نامزد وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو کی حلف برداری کی تقریب کا موقع تھا۔ پوری دنیا کی توجہ پاکستان کے خوبصورت دارالحکومت اسلام آباد پر مرکوز تھی۔ اس تقریب کے انعقاد کے لیے ایوان صدر کا انتخاب کیا گیا تھا حالانکہ یہ عمارت تقریباً چھ برس قبل تعمیر کی گئی تھی مگر یہ پہلا موقع تھا کہ کسی وزیراعظم کی تقریب حلف برداری یہاں منعقد ہو رہی تھی۔

سرسبز 'شکر پڑیاں' کی پہاڑیوں کے دامن میں اس خوبصورت وسیع و عریض عمارت کے باہر ہزاروں لوگ جمع تھے جن میں طلبا، خواتین، کسان اور کارکن، شارع دستور کے ساتھ ساتھ قطاروں میں کھڑے تھے۔ شارع دستور ایوانِ صدر کو جانے والا مرکزی راستہ ہے۔ اُن میں سے بہت سے لوگوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے سہ رنگے جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے۔ بعض لوگ خیر سگالی کے بینر لہراتے ہوئے اپنی نوجوان قائد کا استقبال کر رہے تھے جو اُن کے لیے جمہوریت کی علامت بن کر نمودار ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے فضا ''جیئے بھٹو'' کے پُرجوش نعروں سے گونج رہی تھی۔

ایوانِ صدر میں ماحول انتہائی شاندار تھا۔ استقبالیہ ہال کو زردی مائل بھورے پردوں اور فرنیچر سے مزین کیا گیا تھا۔ یہاں سے دارالحکومت کی سب سے خوبصورت شاہراہ خیابان قائداعظم کا نظارہ کیا جاسکتا تھا جس پر دیودار کے درخت سایہ فگن تھے۔ ہال میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات جمع تھیں جن میں سیاسی جماعتوں کے بہت سے قائدین، ممبران اسمبلی، سفارت کار، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان، اعلیٰ سرکاری اور فوجی افسران شامل تھے۔ تقریباً ہر شخص جس کا پاکستانی معاشرے میں کوئی مقام تھا، یہاں موجود تھا۔ صدارتی ڈائس کے دائیں طرف، چیف آرمی سٹاف، نیول چیف، فضائیہ کے سربراہ تشریف فرما تھے۔ سامنے والی قطار میں نامزد وزیراعظم کی والدہ بیگم نصرت بھٹو، شوہر آصف علی زرداری اور اُن کی ہمشیرہ صنم بھٹو تشریف فرما تھے۔ تقریباً سات سو مہمانوں میں بہت سے مصاحبین اور منظورِ نظر شخصیات، محترمہ بےنظیر بھٹو اور صدر غلام اسحاق خان، کی ہال میں تشریف آوری کا انتظار کر رہی تھیں۔

ایک ڈرامائی عجلت میں ہال، قومی ترانے کی دھیمی موسیقی سے گونج اُٹھا اور یک بارگی تمام مہمان، آنے والے معززین کی تعظیم میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے سبز رنگ کے لباس پر سفید رنگ کا دوپٹہ زیب تن کر رکھا تھا۔ اُن کے ہمراہ صدرِ گرامی، رنگین یونیفارم سے آراستہ ایوانِ صدر کے محافظوں کے جلو میں سرخ قالین پر نپے تلے قدموں سے ہال میں داخل ہوئے۔ جگمگاتے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کرسٹل کے فانوسوں سے منعکس ہوتی ہوئی روشنیوں کے سیلاب میں اُن کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ پُروقار دکھائی دے رہی تھیں۔

اُنہوں نے ڈائس پر اپنی نشست سنبھالی۔ کابینہ کے سیکرٹری نے ایک قاری کو تلاوت قرآن پاک کے لیے دعوت دی۔ اس موقع پر جو آیات تلاوت کی گئیں اُن میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی کہ وہ ایسے مرد، عورتوں کو انعام سے نوازے جو اچھے اعمال کرتے ہیں اور اس یقین کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) یقیناً ایسے لوگوں کو جزا دے گا (دنیا اور آخرت میں) جو نامساعد حالات میں ہمت اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔

کابینہ کے سیکرٹری نے پھر صدر گرامی سے درخواست کی کہ وہ محترمہ بےنظیر بھٹو سے اُن کے فرائض منصبی اور متعلقہ رازداری کا حلف لیں۔ غلام اسحاق خاں نے اُردو میں حلف کا متن پڑھا جسے حرف بہ حرف محترمہ بےنظیر بھٹو نے دُہرایا۔ متن مکمل ہونے پر اُنہوں نے حلف نامے پر اپنے دستخط کر دیئے۔

ہال دیر تک تالیوں کی آواز سے گونجتا رہا۔ مہمانانِ گرامی میں سے بہت سے ایسے تھے جو محترمہ بےنظیر بھٹو کی ظلم اور آمریت کے خلاف تمام تر جدوجہد میں متواتر شریک رہے اور اُنہوں نے اس موقع کی برسوں تمنا کی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمڈ آئے تھے۔ حاضرین، پہلی مسلمان خاتون وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو کو مبارک باد دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اُن کی والدہ تقریب کو سکتے کے عالم میں دیکھ رہی تھی کہ خدا جانے یہ خواب تھا یا حقیقت، تاریخ میں نیا باب رقم ہو گیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو کی قومی خدمات

- بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد کی گئی۔
- پاکستان کے چاروں صوبوں میں علماء کے کنونشن منعقد کیے گئے۔
- اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی گئی۔
- ایک جید عالم دین مولانا سراج دین پوری کو وزیراعظم کا مشیر مقرر کیا گیا، تاکہ وہ دینی اُمور میں وزیراعظم کو مشورہ دے سکیں۔
- لاہور سے حج پرواز شروع کی گئی۔
- توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے چین نے تین سو میگا واٹ کا ایک ایٹمی بجلی گھر پاکستان کو دینے کا معاہدہ کیا۔ یہ ایٹمی ری ایکٹر سابقہ حکومت گیارہ سال میں حاصل نہ کر سکی۔
- چین نے پاکستان کو 5 کروڑ ڈالر کا بلاسود قرضہ دینے کا اعلان کیا۔
- روس نے مزید سٹیل ملز لگانے کے لیے مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔
- پاکستان دولت مشترکہ میں دوبارہ شامل ہو گیا۔
- سارک ممالک کی ایک کامیاب کانفرنس پاکستان میں منعقد ہوئی۔
- اپنے ہمسایہ ملک بھارت کے ساتھ برابری کی سطح پر تعلقات کو خوشگوار بنایا گیا اور دونوں ممالک نے ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔
- آئی ایم ایف نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی درخواست پر معاہدے کی شرائط نرم کر دیں۔
- روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور مسئلہ افغانستان کو حل کرنے کے لیے مثبت اقدامات اُٹھائے گئے۔
- کنسورشیم نے پاکستان کی امداد میں اضافہ کر دیا۔
- جمہوری ممالک کی ایسوسی ایشن بنانے کا تصور پیش کیا گیا۔ روس سے سٹیل انڈسٹری کی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کا معاہدہ کیا۔
- روس نے کراچی سٹیل ملز کی توسیع کے لیے ایک ارب ڈالر کی امداد کی منظوری دے دی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

- دنیا کی کئی معروف بین الاقوامی تنظیموں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو اُن کی جمہوری جدوجہد اور پاکستان میں انسانی حقوق کی بحالی کی بنا پر خصوصی ایوارڈ دیئے۔
- دنیا کی تمام مظلوم تحریکوں اور جدوجہد آزادی کی بھرپور حمایت کی گئی۔
- کشمیر کے مسئلہ پر اسلامی ممالک کی متفقہ حمایت حاصل کی گئی۔
- پاکستان کا وقار عالمی برادری میں بلند کیا گیا۔
- پاکستان ہر قسم کے گولہ بارود کی تیاری میں خود کفیل ہو گیا۔
- دو امریکی فریگیٹ پاک بحریہ کے حوالے کیے گئے۔
- پاکستان نے ملک کے اندر طیارے بنانے شروع کر دیئے۔
- حملہ آور طیاروں کا کھوج لگانے کے لیے جدید ترین ریڈار نے کام شروع کر دیا۔
- پاکستان نے امریکہ سے 60 ایف سولہ طیارے انتہائی موزوں قیمت پر حاصل کیے۔
- ارض مقدس سیاچن کے دفاع کو مستحکم بنایا گیا اور محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم پاکستان نے سیاچن گلیشیئر کا دورہ کیا۔
- پاکستان کی تاریخ کی اہم ترین دفاعی مشقیں ''ضرب مومن'' کے نام سے جمہوری دور میں منعقد ہوئیں۔
- پریس سنسر شپ کے کالے قوانین ختم کر دیئے گئے۔
- نیوز پرنٹ کا کوٹہ سسٹم ختم کر دیا گیا۔ کوٹہ سسٹم کو حکومتیں اخبارات پر سیاسی دباؤ اور بلیک میل کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔
- ٹی وی اور ریڈیو کے سلسلے میں بلیک لسٹ کو ختم کر دیا گیا اور تمام ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کو بلا تفریق و بلا امتیاز ٹی وی اور ریڈیو پر پروگرام پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ٹی وی پر اپوزیشن کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے موقع فراہم کیا گیا۔ اب پاکستان کے عوام اپوزیشن کے لیڈروں کو بھی ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں۔
- نیشنل پریس ٹرسٹ کو کارکن صحافیوں کے مفادات کا تحفظ دے کر نجی شعبہ میں دے دیا گیا اور اخبارات پر حکومت کا کنٹرول ختم کر دیا گیا۔
- صحافیوں پر بیرونی دورہ کے لیے این او سی حاصل کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی۔
- ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے برطرف ملازمین کو بحال کر دیا گیا۔
- آزاد صحافت کی پالیسی اپناتے ہوئے اخبارات کو بلا امتیاز اشتہارات کا اجراء کیا گیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

- پیپلز نیٹ ورک پروگرام کے تحت نئے ٹی وی چینل کا آغاز۔
- ہیروئن کے کاروبار اور منشیات کے خاتمے کے لیے الگ وزارت قائم کی گئی۔
- منشیات کے سمگلنگ میں ملوث سرکردہ سمگلروں کو گرفتار کیا گیا۔
- ہیروئن کے لیے استعمال ہونے والی پوست کی فصلیں تباہ کر دی گئیں۔
- ہیروئن کے عادی افراد کے لیے کلینک قائم کیے گئے تا کہ ان کو اس مرض سے نجات مل سکے۔
- ہیروئن کی بارہ لیبارٹریاں تلف کی گئیں۔
- منشیات کی سمگلنگ میں بے مثال کمی واقع ہوئی۔
- ایک سال میں دس آئل فیلڈ دریافت کیے گئے۔
- تیل اور گیس کی پیداوار میں 22 فیصد کا اضافہ ہوا۔
- ایک سال کے اندر لاکھوں شہریوں کو سوئی گیس مہیا کی گئی۔
- تیل کی پیداوار 58 ہزار بیرل یومیہ ہوگئی۔ تیل صاف کرنے کے لیے ریفائنری لگائی گئی۔
- تیل کی ٹرانسپورٹ کو آسان بنانے کے لیے 850 میل لمبی پائپ لائن بچھائی گئی۔
- 4 ارب 77 کروڑ روپے کے تین بڑے صنعتی منصوبوں کی منظوری دی گئی۔ پہلے منصوبے میں پیٹرو کیمیکل کا منصوبہ شامل ہے جس پر 3 ارب 88 کروڑ روپے کی لاگت آئی۔ دوسرا منصوبہ ٹویوٹا کرولا کار کا منصوبہ ہے جس پر 58 کروڑ روپے کی لاگت آئی۔ اس میں دس ہزار گاڑیاں سالانہ تیار ہوں گی۔ جن میں 6 ہزار ہائی لکس گاڑیاں شامل ہیں اور دو ہزار جیپیں بھی شامل ہیں۔ تیسرے منصوبے میں صوبہ سرحد میں کمرشل ایکسپلوسیوز کا قیام شامل ہے جو کہ سالانہ 60 لاکھ ایکسپلوسیوز تیار کرے گا۔ اس منصوبے پر 4 کروڑ روپے لاگت آئی۔
- پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار غیر ترقیاتی اخراجات میں 300 کروڑ روپے کی کمی کی گئی۔
- سٹاک ایکسچینج کی قیمت میں اضافہ ہوا۔
- جمہوریت کی بحالی کے بعد بیرونی امداد میں 22 فیصد اضافہ ہوا۔
- کرپشن کو ختم کرنے کے لیے سونے کی درآمد پر پابندی ختم کر دی گئی۔
- بہتر منصوبہ بندی کی وجہ سے افراط زر میں کمی واقع ہوئی۔
- پاکستان میں سرمایہ کاری کے لیے غیر ضروری پابندیاں ختم کی گئیں، درآمدی اور برآمدی پالیسی میں توازن پیدا کیا گیا۔ صنعت کاروں اور تاجروں کو سہولتیں مہیا کی گئیں۔
- انوسٹمنٹ بورڈ تشکیل دیا گیا جس کی چیئرمین وزیر اعظم پاکستان تھیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

- عوامی حکومت کی منصفانہ اور قومی پالیسیوں کی وجہ سے افراط زر کی شرح میں نمایاں کمی ہوئی جو 9 فیصد سے 5 فیصد ہوگئی۔
- وسائل کی کمی کے باوجود مواصلات کے شعبے میں تسلی بخش ترقی ہوئی، جس کا اندازہ محکمہ کی ایک سالہ کارکردگی سے لگایا جاسکتا ہے۔

نئی ٹیلی فون ایکسچینج لائن	64400
نئے ٹیلی فون کنکشن	99391
جتنے نئے شہروں کو پورے ملک سے ملایا گیا	14

- کئی دیگر شہروں کا ملک کے دیگر شہروں سے رابطے کے لیے ٹیلیفون کے ڈائریکٹ ڈائلنگ سسٹم کا قیام۔
- پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک سال کے اندر چار ہزار دیہات کو بجلی فراہم کی گئی اور صدیوں کے تاریک دیہات روشنی سے منور ہوئے۔
- پانچ لاکھ نوے ہزار بجلی کے کنکشن دیئے گئے۔ ایک سال میں کبھی اتنی تعداد میں کنکشن نہیں دیئے گئے۔
- رشوت کے خاتمے کے لیے اور صارفین کی سہولت کے لیے دیہات میں 45 دن اور شہروں میں 35 دن کے اندر بجلی کے کنکشن دینے کی مدت مقرر کی گئی۔ اب جو شخص بجلی کا کنکشن حاصل کرنے کی درخواست دے گا اسے ہر صورت میں 35 دن کے اندر بجلی مل جائے گی۔
- بجلی کا کمپیوٹر سسٹم رائج کیا گیا تا کہ چوری اور رشوت خوری کے تمام دروازے بند کیے جاسکیں۔
- نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔
- ایک ہزار میگا واٹ پر مشتمل غازی گھریالہ پراجیکٹ اور نیلم جہلم پراجیکٹ کا آغاز کیا۔
- بجلی کی چوری کم کرنے کے لیے بہتر منصوبہ بندی کی گئی۔
- دور دراز کے علاقوں میں بارش کے پانی کو کنٹرول کرنے کے لیے سکیم منظور کی گئی تا کہ پانی سے فصلوں کے نقصان کو بچایا جائے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔
- سیم اور تھور پر قابو پانے کے لیے منصوبہ بندی کی گئی۔
- جمہوری حکومت کے بروقت اقدامات کی وجہ سے تین سال کے اندر لوڈ شیڈنگ مکمل طور پر ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔
- کراچی اور پشاور کو ملانے کے لیے مائیکرو ویو چینل کی تکمیل کی گئی۔ دو ہزار چار سو ستائیس افراد

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مرتضیٰ بھٹو کا قتل

مرتضیٰ بھٹو طے شدہ پروگرام کے تحت 29 ستمبر 1996ء کو سرجانی ٹاؤن کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد اپنے سیکورٹی گارڈز کے ہمراہ 70 کلفٹن روانہ ہوئے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے ایک قریبی عزیز عاشق جتوئی اس نیلے رنگ کی پجارو کو چلا رہے تھے جس میں مرتضیٰ سوار تھے۔ اُن کے عقب میں دو ملازم یار محمد اور اصغر علی بیٹھے تھے۔ مرتضیٰ کے باڈی گارڈ اُن کے آگے اور پیچھے گاڑیوں میں موجود تھے۔ مرتضیٰ اور اُن کے ساتھی رات پونے 9 بجے کے قریب جونہی 70 کلفٹن کی طرف مڑے، اچانک اُن کی نظر پولیس کی بھاری جمعیت پر پڑی جو جدید اسلحہ ہاتھوں میں لیے شاہراہ ایران پر موجود تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے پولیس کی ایک سیکورٹی پلان کے تحت تعیناتی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے کیونکہ کراچی پولیس کے جوان تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ اگرچہ مرتضیٰ کے ساتھ سرجانی ٹاؤن سے درجنوں گاڑیاں روانہ ہوئی تھیں، تاہم عاشق جتوئی اور مرتضیٰ کے باڈی گارڈز نے اس قدر تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا کہ زیادہ تر گاڑیاں پیچھے رہ گئیں وگرنہ عام حالات میں مرتضیٰ درجن بھر گاڑیوں کے ہمراہ ضرور شاہراہ ایران پر پہنچتے اور ممکن ہے کہ اس قدر زیادہ گاڑیوں کو دیکھ کر پولیس اپنا پلان بدل دیتی۔ مرتضیٰ جونہی پولیس کے ناکے کے قریب پہنچے، ایک پولیس ملازم نے ٹارچ کی روشنی کے ذریعے انہیں رُکنے کا اشارہ کیا جب کہ اے ایس پی رائے طاہر اور اے ایس پی شاہد حیات نے مرتضیٰ کی گاڑی کو رُکنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ دیا۔ اے ایس پی شاہد حیات میر مرتضیٰ بھٹو اور اُن کے باڈی گارڈز کی گاڑیاں رُکتے ہی تیزی کے ساتھ اُن کی طرف گئے اور انہیں اس بات پر قائل کرنے لگے کہ وہ اپنے باڈی گارڈز کو پولیس کے حوالے کر کے خود 70 کلفٹن چلے جائیں۔ پولیس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کبھی بھی اپنے ساتھیوں کو سیکورٹی حکام کے حوالے نہیں کریں گے۔ یہ تو ممکن تھا کہ مرتضیٰ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے اور بدلے میں اپنے باڈی گارڈز کو رہا کروا لیتے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود کو بچانے کے لیے اپنے ساتھیوں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر گھر چلے جاتے۔ ایس ایس پی پولیس واجد درانی اس

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کو روزگار کے مواقع فراہم ہوئے۔ بہتر کارکردگی کی بنیاد پر منافع کی شرح میں 1274 ملین روپے کا اضافہ ہوا۔

- 445 ڈاک خانے کھولے گئے۔
- پورٹ قاسم میں توسیع کی گئی۔
- پاکستان سٹیل ملز کافی عرصہ سے نقصان میں جارہی تھی حالانکہ سٹیل ملز قومی معیشت میں ریڑھ کی حیثیت رکھتی ہے۔ 1989ء میں بہتر منصوبہ بندی کی بنا پر سٹیل ملز کو منافع بخش بنا دیا گیا۔
- بلوچستان ٹیکسٹائل ملز 1983ء میں بند ہوگئی تھی۔ 150 کروڑ کی اس مل کو 13 کروڑ میں فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا اس طرح پانچ ہزار افراد کے بے روزگار ہونے کا اندیشہ تھا۔ عوامی حکومت نے اسے دوبارہ چالو کر دیا۔
- ہیوی مکینیکل کمپلیکس نقصان سے منافع کی جانب گامزن ہوا۔
- سوزوکی موٹر سائیکل دوبارہ تیار ہونے شروع ہوگئے۔
- پیپلز پروگرام کے تحت محنت کش لوگوں میں سائیکلیں تقسیم کی گئیں۔
- بیوہ عورتوں میں سلائی مشینیں تقسیم کی گئیں۔
- ملک کے ہر شہر اور گاؤں میں اہم نوعیت کی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔
- کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کے لیے پیپلز پروگرام سے فنڈ مہیا کیے گئے۔
- بیوہ عورتوں اور یتیم افراد کو وظیفے دیئے گئے۔
- پاکستان میں پہلی بار نوجوانوں کی الگ وزارت قائم کی گئی تاکہ نوجوانوں کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ دی جاسکے۔
- خواندگی کے 60 ہزار نئے مرکز قائم کیے گئے۔
- بے روزگار نوجوانوں کے لیے غیر ممالک میں روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی گئی۔
- پچاس ہزار نوجوانوں کو سکولوں میں بطور استاد روزگار دینے کی منصوبہ بندی۔
- یوتھ قرض کی سکیم کو بہتر اور آسان بنایا گیا۔
- فیڈرل یوتھ کونسل کا قیام۔
- نوجوانوں کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے منصوبہ بندی۔
- پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خواتین کی الگ وزارت قائم کی گئی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

- خواتین کو باعزت روزگار فراہم کرنے اور ملکی معیشت میں مناسب مقام دینے کے لیے فرسٹ ویمن بنک قائم کیا گیا۔
- قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں عورتوں کو زیادہ نشستیں دینے کا اعلان کیا گیا۔
- وفاقی کابینہ میں پہلی دفعہ خواتین کو زیادہ نمائندگی دی گئی۔
- اسلام آباد میں عورتوں کو ٹریننگ دینے کے لیے کمپیوٹر سینٹر کھولا گیا۔
- عورتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔
- سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کا کوٹہ مقرر کیا گیا۔
- بیوہ سرکاری ملازمین کی رہائش کے لیے اسلام آباد میں نصرت ہاؤس کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔
- بوڑھے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف نوعیت کی سکیمیں جاری کی گئیں۔
- مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے سوشل ویلفیئر پراجیکٹ قائم کیا گیا۔
- ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی اُٹھائی گئی تا کہ مزدور اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔
- مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔
- مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے وظائف مختص کیے گئے۔
- مزدوروں کا کارخانوں کی آمدنی میں حصہ مقرر کیا گیا۔
- مزدوروں کو انتظامیہ میں شریک کیا گیا۔
- اسلام آباد اور دوسرے بڑے شہروں میں لیبر کالونیاں تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔
- مزدوروں کو پنشن کا تحفظ دیا گیا۔
- ہزاروں برطرف محنت کشوں کو اپنی ملازمت پر بحال کیا گیا۔
- حکومتی اراضی بے گھر افراد میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔
- ملک بھر میں کچی آبادیوں کو پختہ بنانے کے لیے وزارتی کمیٹی تشکیل دی گئی۔
- امریکہ کی جانب سے ہاؤسنگ کے لیے 465 ملین ڈالر کی امداد کا اعلان۔
- بے گھر افراد کے لیے قومی اسمبلی کے ہر حلقہ میں پندرہ سو مکانات کی تعمیر کا اعلان۔
- اسلام آباد اور کراچی میں سرکاری ملازمین کے لیے ہزاروں مکانات تعمیر کیے گئے۔
- ایف سی سی کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے منصوبہ بندی کی گئی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

رات مرتضیٰ آپریشن کی خود نگرانی کر رہے تھے جب کہ ڈی آئی جی شعیب سڈل کے علم میں وہ سارا منصوبہ تھا جس پر عمل درآمد کے لیے پولیس بلٹ پروف جیکٹس پہن کر موقع پر موجود تھی۔ مرتضیٰ کے تصور میں بھی نہ تھا کہ اُن کے اپنے شہر میں اُن کے اپنے گھر کے قریب پولیس اُن پر فائرنگ کرے گی اور پولیس کی فائرنگ کا جواز بھی نہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ مرتضیٰ کے پولیس کے اعلیٰ حکام کے ساتھ مذاکرات کا کوئی نتیجہ نکلتا، اچانک گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو اچانک ہونے والی فائرنگ سے گھبرا گئے کیونکہ گولیوں کی بوچھاڑ کا رُخ اُن کی نیلی پجارو کی طرف تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز جدید اسلحہ سے لیس تھے لیکن پولیس کے کمانڈوز نے انہیں اسلحہ استعمال کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی گاڑی میں موجود عاشق جتوئی سب سے پہلے گولی کا نشانہ بنے جس کے اگلے ہی لمحے میر مرتضیٰ بھٹو بھی زخمی ہو گئے۔ گاڑی میں موجود اُن کا ذاتی ملازم اصغر علی فائرنگ سے ڈر کر پجارو کے فرش پر لیٹ گیا جس کے باعث وہ اندھا دھند ہونے والی فائرنگ سے محفوظ رہا۔ چند منٹ بعد فائرنگ میں وقفہ آیا تو اصغر علی نے میر مرتضیٰ کو مخاطب کیا جن کی نحیف آواز یہ سمجھ لینے کے لیے کافی تھی کہ وہ زخمی ہیں۔ اصغر نے گاڑی میں سے ہاتھ باہر نکالا اور پولیس کو فائرنگ بند کرنے کو کہا۔ مرتضیٰ کو گولی لگ چکی تھی لیکن وہ ابھی تک زندہ تھے۔ اصغر علی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے پولیس کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ خدا کے لیے فائرنگ بند کرو، میر مرتضیٰ کو گولی لگ چکی ہے۔ پولیس تو شاید سمجھ رہی تھی کہ مرتضیٰ ہلاک ہو گئے ہوں گے۔ اصغر علی کی اطلاع نے پولیس کو بدحواس کر دیا جس نے دوبارہ اندھا دھند فائرنگ کر کے مرتضیٰ کو شدید زخمی کر دیا۔ دوسری مرتبہ ہونے والی فائرنگ کے باعث ایک گولی مرتضیٰ کی گردن میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر گاڑی سے باہر گر پڑے۔ اگر پولیس مقابلے میں مرتضیٰ کو قتل کرنا مقصود نہ ہوتا تو اوّل تو اُن کی گاڑی پر فائرنگ ہی نہ کی جاتی۔ دوم اگر اُن کی گاڑی پر فائرنگ کر ہی دی گئی تھی تو مرتضیٰ کو ایمرجنسی بنیادوں پر طبی امداد دینے کا بندوبست کیا جاتا۔ شاہراہ ایران پر پولیس اور مرتضیٰ کے باڈی گارڈز کے درمیان ہونے والے اس پولیس مقابلے کے 20 منٹ بعد تک مرتضیٰ کو ہسپتال منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ مرتضیٰ اپنے گھر کے قریب زخمی حالت میں پڑے تھے، اُن کی اہلیہ اور بچے 70 کلفٹن میں فائرنگ کی آواز سن کر گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ کراچی میں اچانک فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جانا اُن کے لیے اب کوئی نئی بات نہ رہی تھی۔ تاہم غنویٰ بھٹو کے ملازم نے اتنا ضرور کیا کہ انہوں نے نزدیکی پولیس سٹیشن کو اپنی رہائش گاہ کے قریب ہونے والی فائرنگ کی اطلاع دی۔ مرتضیٰ کے زخمی ہونے کی اطلاع سب سے پہلے ایک نامعلوم فرد نے غنویٰ کو دی جس نے 70 کلفٹن فون کر کے کہا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کہ مرتضیٰ کو پولیس نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا ہے۔ اب غنویٰ اور اُن کی صاحبزادی کو پتہ چلا کہ جس فائرنگ کی آواز پر انہوں نے توجہ نہ دی تھی وہ دراصل اُن کے اپنے ہی گھر کو تباہ کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ مرتضیٰ کو زخمی حالت میں مڈ ایسٹ نامی ایسے ہسپتال میں لے جایا گیا جہاں علاج کی مناسب سہولتیں موجود نہ تھیں اور یہ نہیں ہوسکتا کہ پولیس کو اس کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ہو۔ مرتضیٰ کو زخمی حالت میں کیا سیدھا ہسپتال لے جایا گیا تھا یا اس سے قبل انہیں کسی اور جگہ لے جایا گیا، اس سوال کا جواب مرتضیٰ کی موت کے بھی بعد نہ مل سکا۔ مرتضیٰ کو لگنے والی گولیوں میں سے ایک گولی انہیں چند فٹ کے فاصلے سے ماری گئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ آخر وہ کون تھا جس نے مرتضیٰ کو طبی امداد دینے کے بجائے مزید زخمی کیا؟ ان تمام سوالات کے جوابات 24 گھنٹوں کے اندر مرتضیٰ کو گرفتار کرنے کے لیے تعینات کیے جانے والے اہلکاروں کو گرفتار کر کے اس طرح حاصل کیے جا سکتے تھے جس طرح پولیس عموماً ملزموں سے اقرار جرم کرایا کرتی ہے۔ لیکن مرتضیٰ کو ہلاک کرنے والے پولیس ملازمین کے خلاف شروع میں تو کوئی کارروائی ہی نہ کی گئی اور جب پولیس مقابلے میں حصہ لینے والے چند ملازمین کو معطل کیا بھی گیا تو اُن کے ساتھ تھانے میں اس طرح کا سلوک نہ کیا گیا جس قسم کا سلوک ملزموں کے ساتھ ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد وہ دوبارہ ملازمت پر بحال کر دیے گئے۔

20 ستمبر 1996ء کی رات جب مرتضیٰ مڈ ایسٹ ہسپتال میں آخری سانسیں لے رہے تھے اُن کی اہلیہ غنویٰ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ مرتضیٰ کی والدہ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے جب کہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس میں تسلی دی جا رہی تھی کہ مرتضیٰ زیادہ زخمی نہیں ہیں۔ صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری کو مرتضیٰ کے زخمی ہونے کی اطلاع حساس اداروں نے دی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری اسی روز سعودی عرب سے پاکستان آئے تھے اور اُن کے بے نظیر بھٹو کے ساتھ تعلقات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ 20 ستمبر 1996ء کی صبح سعودی عرب سے واپس آنے کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری کا بے نظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہ ہوا لیکن جب انہیں مرتضیٰ کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے وزیراعظم ہاؤس فون کر کے بے نظیر سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن بے نظیر نے لغاری کا فون نہ سنا اور وہ زار و قطار روتی ہوئی ائیر پورٹ روانہ ہوگئیں جہاں ایک خصوصی طیارہ انہیں کراچی لے جانے کے لیے تیار تھا۔ ایوان صدر کے عملے نے جب لغاری کو مطلع کیا کہ بے نظیر بھٹو کراچی جانے کے لیے ائیر پورٹ روانہ ہوگئی ہیں تو وہ بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ ائیر پورٹ روانہ ہو گئے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری سے بے نظیر بھٹو ناراض ضرور تھیں لیکن انہیں 20 ستمبر 1996ء کی اس رات تک قطعاً اندازہ نہ تھا کہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مرتضیٰ کے قتل میں اُن کے اپنے نامزد کردہ صدر مملکت کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے ائیر پورٹ پر بے نظیر کے ساتھ اظہار افسوس کیا۔ 20 ستمبر 1996ء کی رات بے نظیر ہی بولے جا رہی تھیں لیکن مرتضیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ بے نظیر چاہتی تھیں کہ مرتضیٰ اور اُن کے درمیان کوئی موجود نہ ہو، اور وہ اب ایسی دنیا میں جا چکے تھے جہاں سے اُن کی واپسی ممکن نہ تھی۔ بے نظیر بھٹو کا اس رات رو رو کر برا حال ہو گیا۔ اُن کے سامنے 18 جولائی 1985ء کی وہ رات گھوم گئی جب وہ شاہ نواز کے ہلاک ہونے کی خبر سن کر بے چین ہو گئی تھیں اور پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کی لاش لے کر پاکستان آئیں۔ بے نظیر بھٹو نے ایک مرتبہ پھر وہی دُکھ اُٹھایا تھا۔ انہیں پھر اپنے بھائی کی لاش کی تدفین کرنا تھی۔ 1985ء میں جب اُن کے چھوٹے بھائی فوت ہوئے تھے تو انہیں اس حد تک آزادی ضرور حاصل تھی کہ وہ شاہ نواز کی میت کی جس طرح اور جس انداز میں چاہیں تدفین کرتیں، لیکن 20 ستمبر 1996ء کی رات جب اُن کے سامنے مرتضیٰ کی لاش پڑی تھی تو وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ انہیں مرتضیٰ کی آخری رُسومات کی ادائیگی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس مرتبہ وہ اپنے بھائی کے قتل کا الزام کسی ڈکٹیٹر پر نہیں لگا سکتی تھیں بلکہ اُن کے بھائی کو اُن کے ہی دور حکومت میں قتل کیا گیا تھا۔ مرتضیٰ کے مرنے سے قبل مڈ ایسٹ ہسپتال کے باہر الذوالفقار کے سینکڑوں کارکن حکومت کے خلاف نعرے بازی میں مصروف تھے۔ بے نظیر بھٹو یہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ آخر کار اُن کی واضح ہدایات کے باوجود پولیس نے مرتضیٰ کی گاڑی پر فائرنگ کیوں کی؟ یہ وقت ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کا نہیں تھا بلکہ اس وقت حالات کا تقاضا یہی تھا کہ بے نظیر بھٹو اور غنویٰ ایک دوسرے کے گلے لپٹ کر خوب روتیں کیونکہ مرتضیٰ اور بے نظیر کے دشمن مشترک تھے۔ بے نظیر بھٹو 20 ستمبر 1996ء کو رات بھر روتی رہیں اور اگلے روز انہوں نے بھٹو خاندان کے آبائی قبرستان میں مرتضیٰ کو شاہ نواز کے پہلو میں سپرد خاک کرنے کے تمام انتظامات اپنی نگرانی میں مکمل کرائے۔ بے نظیر بھٹو سہ پہر ساڑھے تین بجے کراچی سے لاڑکانہ آئیں۔ اس سے ایک گھنٹہ قبل بیگم نصرت بھٹو، غنویٰ بھٹو، فاطمہ اور ذوالفقار جونیئر کو ایک خصوصی ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاڑکانہ پہنچا دیا گیا تھا جب کہ مرتضیٰ کا تابوت لیے ایک اور ہیلی کاپٹر 2 بج کر 50 منٹ پر پولیس ٹریننگ سکول لاڑکانہ کے ہیلی پیڈ پر اُترا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی تدفین کے موقع پر ایک لاکھ کے قریب افراد موجود تھے۔ بے نظیر بھٹو کو جس بات کا خدشہ تھا آخر وہی بات ہو کر رہی۔ مرتضیٰ کے حامیوں نے مرتضیٰ کی رسم قل کے موقع پر کیے جانے والے انتظامات درہم برہم کر دیے اور بے نظیر اپنے شوہر کے ہمراہ ''المرتضیٰ'' (بھٹو خاندان کی آبائی حویلی) میں داخل نہ ہوسکیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جس پر رسم قل وزیراعظم ہاؤس نوڈیرو میں ادا کی گئی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے 22 ستمبر 1996ء کو نوڈیرو میں بےنظیر بھٹو سے اظہار تعزیت کیا۔ اسی روز صنم بھٹو خاموشی سے بےنظیر اور زرداری کو یہ کہہ کر گڑھی خدا بخش قبرستان چلی گئیں کہ وہ بیگم بھٹو کو وہاں لے کر پہنچ رہی ہیں۔ اس طرح مرتضیٰ کی ہلاکت کے بعد بھٹو خاندان کے افراد سب کے ہمراہ گڑھی خدا بخش قبرستان میں اکٹھے ہوئے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری جب بےنظیر بھٹو کو ملے تو اس وقت وہ سیاہ رنگ کا ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں جب کہ رو رو کر اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بےنظیر بھٹو کے انکشافات

جس بات پر مجھے بہت زیادہ فخر ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسے معاشرے میں خواتین کے حقوق کے فروغ کے کام کو مکمل کیا جہاں کافی عرصہ سے انہیں نظر انداز کیا جا رہا تھا اور جہاں کھلے عام ان سے برا سلوک کیا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی کابینہ میں متعدد خواتین کو شامل کیا اور ترقی نسواں کی وزارت قائم کی۔ ہم نے یونیورسٹیوں میں خواتین کی تعلیم کے پروگرام شروع کیے۔ اس امر کو یقینی بنایا کہ جیل میں قید خواتین بہتر طریقہ سے قانونی مشورہ اور نمائندگی کی سہولت حاصل کر سکیں۔

ہم نے صرف خواتین کو قرضہ دینے کے لیے ویمن ڈویلپمنٹ بینک قائم کیا۔ علاوہ ازیں خواتین کو عام بینکوں سے قرضہ لینے کی سہولت بھی حاصل تھی۔ ہم نے خاندانی منصوبہ بندی، غذائیت کے متعلق مشاورت، چائلڈ کیئر اور برتھ کنٹرول کے لیے ادارے تشکیل دیئے۔ بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے کھیلوں کے مقابلے میں خواتین کی شرکت کو قانونی شکل دی اور اس عمل کی حوصلہ افزائی کی جس پر ضیاء نے فوج آمریت میں پابندی عائد کی تھی۔

یہ ایک ایسے معاشرے میں ٹھوس آغاز تھا جہاں ایک مشکل دہائی میں اسلام کو معاشرے میں خواتین کی حیثیت کو دبانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ہم نے تمام سیاسی اور انتظامی رکاوٹوں کے باوجود یہ اُمور سرانجام دیئے۔ جب میں پہلی دفعہ وزیراعظم کے دفتر میں گئی تو وہاں اپنی سیکرٹری کے علاوہ اور کوئی سٹاف موجود نہیں تھا۔ مجھے فوری طور پر ایک ٹیم کو لندن بھیجنا پڑا تا کہ وہ یہ معلومات حاصل کر سکیں کہ برطانوی وزیراعظم کا دفتر کس طرح کام کرتا ہے اس طرح میرے دفتر کو مکمل انداز میں کام کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔ علاوہ ازیں کئی روز تک مجھے فائلیں نہ بھیجی گئیں۔ کیبنٹ سیکرٹری کو ہدایت دی گئی تھی کہ فائلیں ایوان صدر بھیجی جائیں۔

میری حکومت کے پہلے دور میں سب سے اہم مسئلہ ہمسایہ ملک افغانستان کی صورت حال تھی۔ 1979ء میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر قبضہ کیا تو پاکستان نے مجاہدین کی مدد کرنے کے لیے امریکہ کی شراکت داری میں کام کیا۔ امریکہ کے لیے اس کی حیثیت سرد جنگ کی حکمت عملی کے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

فعل جیسی تھی۔ اسی سوچ نے اسے مداخلت کی تحریک دی۔ امریکہ کوافغانستان میں سوویت یونین کو اس کے وسائل اور منشاء سے محروم کرنے کا راستہ نظر آیا۔ اس نے سوویت یونین کے غلط حملہ اور قبضہ سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ افغانوں، پاکستان کی آئی ایس آئی اور فوج کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ افغانستان میں روس کے خلاف خونی اور بالآخر مکمل جنگ کی جس کا نتیجہ 1990ء میں براہ راست سقوطِ روس کی صورت میں نکلا۔

افغانستان میں پاکستان کے مفاد کی نوعیت پیچیدہ اور کثیر الجہتی تھی۔ افغانستان کا پاکستان کے ساتھ دیرینہ تنازعہ تھا جو ''ڈیورنڈ لائن'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں 1947ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو پشتونوں کے اہم عناصر نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی۔

اہم افغان شخصیات کے بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ افغانوں کے دلوں میں پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات اور بداعتمادی کے احساسات تھے۔ افغانستان کے صدر داؤد نے 1970ء میں پاکستان کے قبائلی علاقے میں بغاوت کی حمایت کی تھی جس کا جواب ہم نے ڈیورنڈ لائن کے پار جوابی بغاوت کی صورت میں دیا، دونوں ممالک کے درمیان سرحد حالت التواء میں تھی۔ فروری 1989ء میں جنیوا مذاکرات کی شرائط کے تحت افغانستان سے روسی افواج کے فوری انخلاء کے ساتھ پاکستان نے عبوری افغان حکومت کی تشکیل میں مدد دی۔ جرنیلوں نے سفارشات پیش کیں کہ ہم افغان لیڈر سیاف کو صدر بنانے میں اور حکمت یار کو وزیراعظم کے عہدے پر برقرار رہنے دیتے ہیں۔ میں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ میں نے فوج سے کہا آپ کے خیالات اور میری حکومت کی سوچ میں سمجھوتہ ہونا چاہیے۔ میں صدر کے طور پر ایک اعتدال پسند کی حمایت کرنا چاہتی ہوں، آپ اپنی پسند کے کسی شخص کو وزیراعظم بنا سکتے ہیں۔ ہماری کوششوں کے ساتھ افغان گروپوں نے صدر مجددی اور وزیراعظم سیاف کو افغان عبوری حکومت کے رہنماؤں کے طور پر قبول کرلیا۔

یہ کوئی آسان راستہ نہیں تھا۔ ایوان صدر میں ہمارے طویل اجلاس ہوئے جہاں ہم پیپلز اسمبلی کے لیے افغان گروپوں میں اتفاق رائے پیدا کرنے کی سخت کوشش کرتے رہے۔ جب کبھی اذان کی آواز آتی تمام آدمی چلے جاتے اور میں اکیلی رہ جاتی، انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک عورت اُن کے ساتھ نماز میں شریک ہو، مجھے یہ صورت حال بہت عجیب محسوس ہوتی کیونکہ کعبہ شریف میں تمام مرد اور عورتیں اکٹھے نماز پڑھتے ہیں اسی طرح مدینۃ النبی ﷺ میں بھی اکٹھے نماز ادا کی جاتی ہے۔

سعودی انٹیلی جنس چیف شہزادہ ترکی بن فیصل اور ایرانی وزیر خارجہ اکثر دورے کرتے۔ ہر دفعہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جب میں نے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی مجھے میری انٹیلی جنس ایجنسیوں نے مطلع کیا کہ یا تو سعودی اتفاق رائے نہیں چاہتے کیونکہ شیعہ فرقہ کو غیر متناسب حصہ دیا جارہا تھا یا ایرانی نہیں چاہتے کیونکہ سنیوں کو غیر متناسب حصہ دیا جارہا تھا۔ روم میں جلاوطن افغان صدر مجھے اور میرے ساتھیوں کو قدرتی غیر جانب دار شخصیت دکھائی دیئے لیکن ایرانی بادشاہ اُن کو نہیں چاہتے تھے۔ میں نے افغان گروپوں کے ساتھ بحث وتمحیص کے عمل کے لیے بہت زیادہ وقت دیا۔ مجھے اکثر محسوس ہوا کہ وہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکاروں سے بریفنگ پوائنٹ لیتے تھے اسی لیے وہ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ انٹیلی جنس سروس نے اصرار کیا کہ وہ افغانوں کو قائل نہیں کرسکی اس لیے ہمیں خاموشی سے اشاروں کو سمجھ کر کھیل کھیلنا ہوگا۔ مجھے افغانوں کی حالت زار دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ وہ طاقت ور غیر ملکی قوتوں میں کچلے گئے تھے اور اگر وہ اپنے سرپرستوں کی پالیسی سے انحراف کرتے تو اُن کا انجام تباہی ہوتا۔

پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء مولانا مودودی کے بہت قریب تھے جو جماعت اسلامی کے مذہبی رہنما تھے اور اسلامی برادری میں اُن کی قائدانہ حیثیت تھی۔ جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا جنرل ضیاء نے جماعت اسلامی سے رُجوع کیا اور اس کے ذریعے اسلامی برادری سے مدد کے لیے رابطہ کیا۔ انہوں نے مولانا مودودی کے پیغام کو فوج کے نصاب میں متعارف کرایا اور فوج اور تعلیمی اداروں کو اعتدال پسندوں سے پاک کیا۔ جلد ہی آئی جے آئی کو فنڈز دیئے تاکہ وہ ہیڈ کوارٹرز بنائیں، نام نہاد تھنک ٹینکس کی تشکیل کریں اور فوجی حکومت کو مشورہ دیں کہ مہاجرین کیمپوں کے بچوں کو متاثر کرنے کے لیے انتہا پسند مدرسے قائم کرنے کے لیے فنڈز کو کیسے استعمال کیا جائے۔ اسلامی دُنیا میں فنڈز جمع کرنے کے لیے سرگرمیاں شروع کی گئیں۔ جہاں فرض شناس غریب اور ضرورت مند لوگوں کے لیے تعلیم، صحت اور خوراک کے لیے چندہ دیتے۔ یہ رقم اُن سیاسی مدرسوں میں گئی جن کا دعویٰ تھا کہ وہ مہاجر کیمپوں کے یتیم بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور اُن کی پرورش کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ ادارے نفرت اور دہشت گردی کی تبلیغ کر رہے تھے۔

انٹرنیشنل فنڈز پاکستان میں آئے، تاہم اُن کا رُخ آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف موڑ دیا گیا۔ ضیاء نے اس نقطۂ نظر پر اصرار کیا کہ سی آئی اے اور دوسری تنظیموں اور ملکوں کی طرف سے دیئے جانے والے فنڈز کا معاملہ اُن کی فوجی حکومت پر چھوڑ دیا جائے جو مجاہدین کے معاملات کو منضبط کرے۔ امریکہ نے اُن پر مہربانی کی۔ اس سے پاکستان کی فوج کو یہ موقع مل گیا کہ وہ نظریاتی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اعتبار سے انتہائی سخت، مذہبی بنیاد پرستوں اور خون کے پیاسے گروپ پر نوازشات کرے۔ اُن کی تربیت کرے انہیں فنڈز اور اسلحہ فراہم کرے۔

یہ ایسا فیصلہ تھا جس کا قلیل المدت المقاصد کے لیے دفاع کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے طویل المدت نتائج دُنیا پر منڈلاتے رہیں گے۔

جب میں نے جون 1989ء میں امریکہ کا دورہ کیا تو وائٹ ہاؤس میں صدر بش اور مسٹر بش کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا شاندار سٹیٹ ڈنر عوام کی زبردست توجہ کا مرکز بنا۔ کانگریس کے مشترکہ سیشن میں میرا زبردست استقبال میرے لیے اور میرے ملک کے لیے زبردست موقع تھا۔ لیکن اس دورے کے دوران ایک اور واقعہ پیش آیا جو میرے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ جب میں نے صدر بش کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں الگ ملاقات کی تو میں نے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ میں نے کہا کہ افغانستان میں سوویت یونین کے ساتھ مؤثر طریقہ سے مقابلہ کرنا ہمارا مشترکہ جذبہ تھا، ہمارے ملکوں نے مجاہدین میں سے سب سے زیادہ جنونی عناصر کو طاقت دینے کا سٹریٹجک فیصلہ کیا جو بعد میں قابو سے باہر ہو سکتا ہے۔ میں نے صدر بش سے افسردگی سے کہا ''جناب صدر! میں خوفزدہ ہوں کہ ہم نے فرینکسٹائن کی عفریت تخلیق کر دی ہے جو مستقبل میں واپس آ کر ہمیں خوفزدہ کر سکتی ہے۔''

یہ المناک تھا کہ میں نے مستقبل کے واقعات کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ امریکی روسیوں کو شکست دینے کا قلیل المدت مقصد حاصل کر کے افغانستان چھوڑ گئے۔ جمہوریت کو موقع ملنا چاہیے تھا تاہم اس مقصد کے لیے اور جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے بین الاقوامی امداد کی ضرورت تھی تاکہ اسے فوج کی طرف سے عدم استحکام کرنے کی کوششوں سے تحفظ دیا جا سکتا۔ لیکن اس مقصد کے لیے بین الاقوامی امداد حاصل نہیں تھی۔ روسیوں کے جانے کے بعد دیوار برلن کے انہدام کے ساتھ یورپ میں ڈرامائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ دُنیا کی توجہ اب اور طرف مبذول ہو چکی تھی۔

اگرچہ بہت کم لوگوں کو اس وقت اس حقیقت کا ادراک تھا۔ افغانستان میں سوویت تسلط کا خاتمہ ایک نئی جنگ کا آغاز تھا۔ انتہا پسند مذہب کا نام لے کر مغرب سے مقابلہ کرنے کے لیے پُرعزم ہو گئے۔ اُن کے نزدیک اعتدال پسند پی پی پی اور میں اُن کی اس فتح کے خوابوں کے راستہ میں خطرات کی حیثیت رکھتے تھے جس کی بنیاد اسلامی دُنیا کے عوام کے مذہبی جذبات کے استحصال کرنے پر تھی۔

سوویت یونین کو طاقت کے ذریعے باہر نکالنے کے تجربہ اور اس کے نتیجے میں عالمی طاقت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی حقیقت نے انتہا پسندوں پر نشہ طاری کر دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ مغرب سے بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مغربی انٹیلی جنس کی اہم شخصیات میری نسبت جنرل ضیاء سے معاملات طے کرنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی تھیں۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھی، جسے سوشلسٹ اور پاکستان کے جوہری پروگرام کا بانی تصور کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں میرے بھائیوں نے سوویت قبضہ کے دوران افغانستان میں ''الذوالفقار'' کی تشکیل کی تھی۔

ایک مغرب نواز جنرل نے مجھے کہا کہ آپ کی فوج نے روسیوں کو شکست دی ہے اور آپ کی طرف سے ایک کال پر ہم امریکہ کو شکست دے سکتے ہیں۔ میں نے اس ششدر کر دینے والے بیان کا اپنے ایک سفیر سے ذکر کیا وہ فوراً چلے گئے اور میری گفتگو امریکی سفیر تک پہنچا دی جس نے اُن سے کہا یہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص الکوحل پیتا ہے۔

میری حکومت کے پہلے ہفتے میں جب میں لاہور اُتری، پھولوں کے گملے سے ایک بم برآمد ہوا۔ اس نے اُس وقت چلنا تھا جب میں نے اُس کے پاس سے گزرنا تھا۔ عوام کو میرے خلاف کرنے کے لیے افواہیں پھیلا کر لوگوں کو سڑکوں پر لانے کی بار بار کوشش کی گئی۔ ان میں ایک احمقانہ مثال اُن کا یہ الزام تھا کہ ایسے ملک کی وزیراعظم نے پیرس سے مہنگے دوپٹے خریدے ہیں جس کے عوام غریب ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نے دوپٹے کراچی کے ایک بازار سے خریدے اور میں پاکستان کے عوام کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس طرح کی احمقانہ افواہوں کو مسترد کر دیا اور میرا ساتھ دیا جس نے پاکستانی معاشرے میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔

میرے انتخاب کے ایک ماہ کے اندر آئی ایس آئی کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز اور اُن کے ڈپٹی نے میرے ارکان اسمبلی سے رابطے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ ان اراکین پارلیمنٹ کو مجھے چھوڑنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اُن کا پسندیدہ انداز یہ تھا کوئی اسے نہیں چاہتا، امریکی اسے نہیں چاہتے، فوج اسے نہیں چاہتی اور جوں ہی وہ حکومت سے باہر ہوتی ہے اس کا شوہر بھی اسے اچانک چھوڑ دے گا۔

افغانستان میں جہاد کی کامیابی کے ساتھ اُن کا منصوبہ تھا کہ مغرب کی طاقت اور اقدار کا مقابلہ کیا جائے۔ کیونکہ حکومت کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں تھی اس لیے وہ یہ کام آزادانہ طریقہ سے سرانجام نہیں دے سکے۔ آئی ایس آئی نے ڈکٹیٹر ضیاء کے ''سیاسی فرزند'' نواز شریف کو وزیراعظم بنانے کا عہد کیا۔ نواز، جو پہلے ہی وزیراعلیٰ پنجاب کے عہدے پر فائز تھے، نے اعلان کیا کہ وہ وزیراعظم کے احکام کی مزاحمت کریں گے تاکہ عملی طور پر پورے ملک کے بجائے میں صرف اسلام

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آباد کی وزیراعظم بننے تک ہی محدود رہوں۔

آئی ایس آئی کے سربراہ نے میری سیاسی بنیاد کا مقابلہ کرنے کے لیے انٹیلی جنس کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے مجھے تجویز پیش کی کہ میں تسلسل برقرار رکھنے کے لیے ایک نئی انٹیلی جنس کور کی تشکیل کروں۔ مجھے کہا گیا کہ تمام سینئر سرکاری افسروں کی ترقیوں کی پہلے آئی ایس آئی کے ذریعے چھان بین کی جائے۔ میں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور اسے کہا جنرل ضیاء نے سوویت یونین اور بھارت کے ساتھ دو محاذ جنگ کا سامنا کیا لیکن انہیں گاؤں کی سطح پر بھی الگ فوجی کور کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور میں بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ آئی ایس آئی کے سربراہ نے اصرار کیا۔ اُن کا مؤقف تھا کہ آئی ایس آئی کی توسیع کے بغیر اور ان ہی افسروں کے تسلسل کے بغیر ملک کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے لیے سیکیورٹی کنٹرول برقرار رکھنا مشکل ہے۔ مجھے کہا جا رہا تھا کہ میں ''ریاست کے اندر ریاست'' بنانے کے لیے حکم دوں اور اس عمل کو قانونی جواز بھی مہیا کروں جو پاکستان میں انتخابات سمیت زندگی کے ہر پہلو میں جوڑ توڑ کرنے کا باعث ہوتا۔ میں نے انکار کر دیا تاہم میری حکومت برطرف کیے جانے کے بعد عبوری وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی (جسے آئی ایس آئی لائی) نے ان کی سکیم پر عمل کیا۔ جرنیلوں کی سیاسی مخالفت کے باوجود مجھے فوج کی طرف سے زبردست حمایت ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ 23 مارچ 1989ء کو جب جنرل بیگ اور میں اپنی پہلی مارچ پاسٹ پریڈ میں گئے تو فوجیوں کے خاندان گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے میری کار کے گرد اکٹھے ہو گئے اور کار کی رفتار کم کرنے کے لیے مجبور کیا۔ جنرل بیگ، جو عوام کی محبت کے اظہار کے طریقوں سے ناآشنا تھے، نے پریشانی سے پوچھا ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے ملٹری سیکرٹری نے جواب دیا۔ فوجیوں کے خاندان وزیراعظم کو دیکھ کر خوش ہیں۔ بیگ خوش نہ تھے۔ فوج اور جرنیلوں میں دو دہائیوں کے تصادم کے باوجود میں ہزاروں اور سینکڑوں میں یہ امتیاز کر لیتی ہوں کہ چند مٹھی بھر افسروں کے برخلاف عزت اور وقار سے ملک کی خدمت کروں۔ جنہوں نے میری مخالفت کی اُن افسروں پر افغان جہاد کے اثرات تھے۔

میں نے خاتون کو وزیراعظم بنانے کے نکتہ پر او آئی سی میں پاکستان کی رُکنیت معطل کرنے کی کوشش کامیابی سے ناکام بنائی۔ مختلف اسلامی ممالک کے علماء میرے انتخاب کے متعلق جھگڑے پر اُتر آئے۔ وہ مختلف فتوے اور حکم دینے لگے۔ بدقسمتی سے ایک سعودی عالم دین شیخ باز جو نابینا تھے لیکن ممتاز حیثیت رکھتے تھے، میرے متعلق فتویٰ دیا کہ مسلمان ملک کی سربراہی کرنا عورت کے لیے غیر اسلامی فعل ہے، تاہم میں خوش قسمت ہوں کہ چین، شام، مصر، عراق جہاں زیادہ سیکولر حکومتیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہیں اُن کے علماء نے اس صورت حال سے مجھے نجات دلائی۔

اگرچہ 1989ء میں اُسامہ بن لادن نے القاعدہ کی تشکیل نہیں کی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام اُس وقت سنا جب اس نے میری پہلی حکومت کو برطرف کرنے کے لیے عدم اعتماد کی تحریک کے بل کے لیے فنڈز دیئے۔ وہ فروری 1989ء میں سوویت یونین کی فوجوں کے انخلاء کے بعد سعودی عرب واپس آ گئے تھے لیکن جب میں نے مئی میں آئی ایس آئی پر اپنا دعویٰ منوا لیا تو انہیں واپس بلا لیا گیا۔ بن لادن کو آئی ایس آئی نے کہا کہ وہ جمہوری حکومت کو گرانے اور مذہبی حکومت قائم کرنے کے لیے مدد دیں۔ بن لادن نے 10 ملین ڈالر کی بڑی رقم تحریک عدم اعتماد کے لیے دی تاکہ اس رقم سے میری حمایت کرنے والے اراکین پارلیمنٹ کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

افغانستان کی جنگ ختم ہونے کے بعد بن لادن کی پاکستانی سیاست میں اچانک مداخلت کو ایک ابتدائی علامت کے طور پر پڑھ لیا جانا چاہیے تھا۔ بن لادن کے ذہن میں اسلامی ریاستوں میں خلافت کا بگڑا ہوا تصور تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ میں مذہبی انتہا پسندوں کے کنٹرول کے تحت پھیل رہا تھا۔ کسی بھی صورت میں مجاہدین جو کسی وقت امریکہ اور مغرب کے قریبی دوست تھے اپنے پرانے سرپرستوں کے خلاف ہو رہے تھے۔ انہوں نے کسی حد تک یہ سوچ لیا کہ وہ امریکہ کا مقابلہ کر سکتے تھے اس وقت بھی جبکہ کابل پر حکومت مشکل ثابت ہو رہی تھی۔

اس دوران مجھے ایک رپورٹ موصول ہوئی کہ ایک سعودی طیارہ آموں کے ڈبے لے کر پاکستان اُترا ہے۔ چونکہ سعودی عرب میں کھجوریں اُگتی ہیں آم نہیں اس لیے اُن کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ سویلین انٹیلی جنس نے پتہ چلایا کہ ڈبوں میں آم نہیں، بلکہ رقم تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے شاہ فہد کی حمایت حاصل ہے۔ جب میری اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میرے والد کی تعریف کی تھی اور یاد دلایا تھا کہ کس طرح انہوں نے میرے والد کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے والد کا قتل ''غیر منصفانہ'' تھا۔ وہ میرے والد کے بھائی کی طرح تھے اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے میں نے اپنے وزیر قانون کو سعودی عرب بھیجا کہ وہ اُن سے استفسار کریں کہ کیا وہ اپنی بیٹی سے ناراض ہیں اور اُس کے مخالفین کو فنڈز مہیا کرنے کے لیے سعودی پیسہ پاکستان بھیج رہے ہیں۔ شاہ نے یقین دلایا کہ جو رقم پاکستان منتقل کی گئی ہے اس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے بیان کیا کہ کچھ لوگ جو افغان جہاد سے متاثر ہیں وہ اپنا نجی پیسہ بھیج رہے ہیں۔ شاہ کے ایک مشیر نے رقم بھیجنے کا ذریعہ دریافت کر لیا یہ اُسامہ بن لادن تھے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں رمزی یوسف نے نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر پہلے حملہ میں حصہ لیا تھا۔ القاعدہ کے پہلے حملہ کی اس طرح منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ ایک مینار دوسرے مینار پر گرتا۔ فروری کی بمباری کے بعد یوسف امریکہ سے بچ کر نکل آیا اور پاکستان پہنچ گیا۔ سات ماہ بعد اُسے میرے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 1993ء کی انتخابی مہم کے دوران دو الگ مواقع پر اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

ستمبر میں اُس نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ میرے گھر کے سامنے کی گلی میں ایک بم رکھا جسے ریموٹ کنٹرول سے چلایا جانا تھا۔ اس کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ جوں ہی میری گاڑی گیراج سے باہر نکلے بم دھماکے سے پھٹ جائے۔ جب وہ یہ بم نصب کرنے کی کوشش کر رہا تھا ایک پولیس اہلکار نے وہاں سے گزرتے ہوئے اُسے روکا اور پوچھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنی چابیاں ڈھونڈ رہا تھا جو گلی میں گر گئی تھیں۔ پولیس اہلکار کو شبہ ہوا اُس نے اُسے فوری طور پر وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ بظاہر یوسف نے اس رات کو اس بم کو ناکارہ بنانے کی کوشش میں اپنے آپ کو زخمی کر لیا اور علاج کے لیے ہسپتال گیا۔ ہسپتال کی فائلوں کے مطابق اس رات اُس کی ایک انگلی ضائع ہو گئی۔

یہ کوششیں نہ رکیں۔ رمزی یوسف اور اس کا گروپ اپنے چچا خالد محمود شیخ اور اس کے حمایتیوں کی واضح ہدایات پر مجھے قتل کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ خالد شیخ جسے اب ہم جانتے ہیں القاعدہ کا سی ای او بن گیا۔ اس پر وال سٹریٹ جنرل کے بیورو چیف ڈینیل پرل کو قتل کرنے کا شک ظاہر کیا گیا ہے۔ (آج کل وہ امریکہ کی تحویل میں ہے) اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی پھر منصوبہ بندی کی لیکن اس مرتبہ منصوبہ زیادہ پیچیدہ تھا۔ اس کا ایک ثانوی سیاسی مقصد بھی تھا کہ پی پی پی کے عناصر کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا جائے۔

القاعدہ اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کا بنایا ہوا منصوبہ میرے قتل پر مبنی تھا اور اسے اس طرح ظاہر کرنا مقصود تھا جیسے میرا بھائی اس کا ذمہ دار تھا۔ میں نے نشتر پارک کراچی میں ایک بڑی انتخابی ریلی میں شرکت کرنی تھی۔ خالد شیخ نے بہت سے جدید ہتھیاروں کا انتظام کیا ہوا تھا جو پشاور سے رمزی یوسف کو پہنچائے گئے۔ جسے ٹرین کے ذریعے قتل کے مقررہ دن پہنچنا تھا۔ منصوبہ اس طرح ناکام ہو گیا کہ ٹرین حیدر آباد دیر سے پہنچی اور ریلی کے ختم ہونے تک ہتھیار نہ پہنچے۔ مضحکہ خیز امر یہ ہے کہ فروری 1995ء میں رمزی کو پاکستان میں گرفتار کیا گیا۔

1993ء کے انتخابات میں پی پی پی نے پنجاب میں اکثریت حاصل کی تھی اور پنجاب اسمبلی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

میں مخلوط حکومت تشکیل دی جسے نواز شریف اور انتہا پسندوں نے میری پہلی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا۔ 1990ء میں میری حکومت کے خلاف انقلاب کے صرف تین سال بعد پی پی پی پاکستان کی حکمران جماعت کی حیثیت سے واپس لوٹی۔ میں ایک مرتبہ پھر وزیر اعظم بن گئی۔

دوسری دفعہ وزیر اعظم بننے کا غیر معمولی موقع ملنے کے بعد میں پُرعزم تھی کہ ہر دن کو پاکستان کے کام کرنے والے گھرانوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے استعمال کروں اور خطرناک بین الاقوامی ماحول میں اعتدال پیدا کروں۔

جب میں نے دوسری مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اُٹھایا تو پاکستان کو درپیش بہت سے چیلنج میرے ذہن میں آئے۔ میرا ملک دہشت گرد ریاست قرار دیئے جانے کے قریب تھا، کراچی میں فوجی آپریشن کیا جا رہا تھا اور پاکستان اقتصادی طور پر دیوالیہ قرار دیا جانے کے کنارے پر تھا۔ یہ کثیر الجہتی قومی بحران تھا۔

میں نے دوبارہ جہاں تک ممکن ہو سکا تیز اور مؤثر انداز میں پاکستان کو جدید دور میں لانے کی کوشش کی۔ ابتدائی مہینوں میں میری حکومت نے انتہائی آرزومندانہ سوشل ایکشن پلان (ایس اے پی) بنایا اور اس کا نفاذ شروع کیا۔ اس منصوبے کے مقاصد میں تعلیم، صحت عامہ، صحت و صفائی، انفراسٹرکچر، حقوق نسواں جیسے شعبوں میں ملکی سطح پر تیز ترقی کے اہداف حاصل کرنا تھا۔ ایس اے پی کا اہم نکتہ پبلک پرائیویٹ شراکت داری تھی جس میں یہ عزم کیا گیا تھا کہ مرکزی حکومت سے غیر معمولی حد تک فنڈز، بین الاقوامی ترقیاتی تنظیموں سے گرانٹس حاصل کی جائیں۔ اس کے ساتھ اسے پاکستان کے سرعت پذیر نجی شعبہ کی بھی مدد حاصل ہو۔

میری نئی حکومت کے پہلے سال ہی میں ہم نے غیر ملکی سرمایہ کاری کا ریکارڈ ہدف حاصل کیا۔ ایک ہی سال میں ہم نے اتنی سرمایہ کاری کر لی جو گذشتہ 40 سالوں میں ممکن ہی نہ ہو سکی تھی۔ نئی غیر ملکی سرمایہ کاری کا 80 فیصد حصہ پاور جنریشن میں تھا۔ اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ اقتصادی سرگرمیوں کو تیز رفتاری سے شروع کیا جائے۔ ہم نے سٹاک ایکسچینج کے قوانین کو جدید بنایا اور سٹیٹ بنک آف پاکستان کو کمپیوٹرائزڈ کیا۔ تمام ایشیا میں بجلی کے شعبے میں سب سے کم نرخوں پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے مذاکرات کیے اور اس طرح بجلی بند کرنے کا سلسلہ ختم کیا۔ نجکاری سے حاصل شدہ منافع سے ہم بڑے قرضے ادا کرنے لگے اور سود کی لاگت کم کی۔ پاکستان کی تاریخ میں ہم پہلی حکومت تھے، جنہوں نے صرف سود کے بجائے حقیقتاً اصل سرمایہ واپس کیا۔ ہم نے صنعتوں کی نجکاری متعارف کرائی اور اپنے اقتصادی اداروں کو اس قابل بنایا کہ وہ جدید دُنیا میں ترقی اور تقابل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کر سکے۔ غیر ملکی قرض کو کم کرنے کے لیے مشکل فیصلے کیے۔ ہم نے 3 بلین روپے کے غیر ترقیاتی اخراجات کم کیے۔ جو اس وقت ہمارے ٹیکسوں کا ایک تہائی تھے۔ ان مشکل فیصلوں کے اچھے ثمرات نکلنا شروع ہوئے۔ پاکستان خوشحال ہونا شروع ہو گیا۔

جب میں نے وزیراعظم کی حیثیت سے لندن کا دورہ کیا تو اسلامی اتحاد کے داعی مذہبی انتہا پسند گروپ ڈورچسٹر ہوٹل کے باہر اور ان مقامات پر جمع ہو گئے تا کہ میرے خلاف نعرہ بازی کر سکیں۔ ان انتہا پسندوں نے نعرے لگا کر لندن میں مجھے رات بھر جگائے رکھا اور مجھے احساس ہوا کہ انگلینڈ میں ان کی معقول تعداد موجود ہے۔ چونکہ انتہا پسندوں نے مغرب سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی خواہش کو بہت کم چھپا کر رکھا اس لیے مجھے ملک سے باہر بھی ان کی رسائی کے متعلق تشویش لاحق تھی۔ اگلے روز جب میں برطانوی وزیراعظم جان میجر سے ملی تو انہیں کہا کہ وہ ان مسجدوں کو چیک کریں جہاں امام (جنہوں نے افغان مہاجرین کی حمایت کی تھی) وعظ دیتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ پاکستانی آبادکاروں اور برطانوی پاکستانیوں کی دوسری نسل کو نفرت اور تشدد کی تعلیم دیتے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حیران ہو گئے۔ پاکستان میں مجھ پر انتہا پسندوں کا خطرہ عیاں تھا کیونکہ مجھے ہر روز دہشت گردوں اور انتہا پسندوں سے نمٹنا پڑتا تھا تاہم مغرب والوں کو اب بھی اس کا ادراک نہیں تھا یہ صورت حال جلد تبدیل ہو گئی۔

انتہا پسندوں کی یہ سوچ غیر منطقی نہیں تھی کہ میں اُن کے عزائم کے راستہ میں رکاوٹ تھی۔ وہ اس لیے میری مخالفت کرتے تھے کہ وہ پاکستان پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انتہا پسندوں نے میری پالیسیوں کو ناکام بنانے اور میری دونوں حکومتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے توانائیاں صرف کیں اور اپنے وسائل کا بھرپور استعمال کیا۔

میں حقیقتاً یہ سوچتی ہوں کہ یہ کچھ اتفاقی امر ہے کہ دہشت گردوں کے بڑے حملے اس وقت ہوئے جب انتہا پسندوں کو ایک جمہوری پاکستانی حکومت سے نہ نمٹنا پڑا۔ جب انہوں نے کسی پابندی اور نگرانی کے بغیر کام کیا۔ ان میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر 1993ء اور 2001ء کے حملے، بمبئی دھماکے، بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ، افریقہ میں امریکی سفارت خانے شامل ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اگر 1996ء میں پاکستان میں میری حکومت کو عدم استحکام سے دوچار نہ کیا جاتا تو طالبان اُسامہ بن لادن کو افغانستان میں مرکز قائم کرنے کی اجازت، تمام اسلامی دُنیا سے اعلانیہ نوجوان بھرتی کر کے انہیں تربیت دینے کا کام اور 1998ء میں امریکہ میں جنگ کا اعلان نہ کر سکتے۔

دوسری مدت اقتدار کے دوران مجھے سیکورٹی پر بریفنگ دینے کے لیے ایک مرتبہ پھر جنرل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہیڈ کوارٹرز میں مدعو کیا گیا۔ ڈائریکٹر ملٹری آپریشن میجر جنرل پرویز مشرف (جو بلاشبہ بعد میں چیف آف آرمی سٹاف اور اقتدار چھین کر صدر بنے) نے مجھے بریفنگ دی۔ مجھے یہ گھسا پٹا منظر محسوس ہوا کیونکہ ایک مرتبہ پھر میں نے یہ سنا کہ اگر میں احکامات جاری کر دوں تو پاکستان کس طرح سری نگر پر قبضہ کر سکتا ہے۔ مشرف نے اپنی بریفنگ ان الفاظ پر ختم کی کہ فائر بندی ہو جائے گی اور پاکستان کا مقبوضہ کشمیر کے دارالحکومت سری نگر پر قبضہ ہو جائے گا۔ میں نے ان سے استفسار کیا اس کے بعد کیا ہوگا، وہ میرے سوال پر حیران ہوئے اور کہا کہ اس کے بعد ہم پاکستان کا جھنڈا سری نگر کی پارلیمنٹ پر لہرا دیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ میں نے جنرل سے پوچھا، اس کے بعد آپ اقوام متحدہ جائیں اور انہیں بتائیں کہ سری نگر اب پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں نے اصرار جاری رکھا، میں دیکھ سکتی تھی کہ جنرل مشرف اس قسم کے سخت سوالوں کے لیے تیار نہ تھے اور اس صورت حال سے گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ اور.....اور آپ انہیں بتائیں گی کہ نئے جغرافیائی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے دُنیا کا نقشہ تبدیل کر دیں۔

آپ جانتے ہیں کہ اقوام متحدہ مجھے کیا کہے گا؟ میں نے جنرل مشرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جبکہ آرمی چیف ساتھ بیٹھے تھے۔ ماحول ساکت ہو گیا۔ میں نے واضح طور پر کہا وہ سلامتی کونسل کی قرارداد پاس کریں گے جس میں ہماری مذمت کی جائے گی اور مطالبہ کیا جائے گا کہ ہم یک طرفہ طور پر سری نگر سے اپنی فوجیں نکال لیں۔ ہمیں اپنی کوششوں سے سوائے بے عزتی اور تنہائی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اجلاس ختم کر دیا۔

انتہا پسندوں کی طرف سے میری حکومت کو برطرف کرنے کا نتیجہ ستمبر 1995ء میں بریگیڈیئر مستنصر کی طرف سے انقلاب کی صورت میں نکلا۔ یہ گروپ اسلام آباد ہتھیار اسمگل کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک اجلاس کے دوران ملٹری ہیڈ کوارٹر پر قبضہ اور تمام جنرلوں کو ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ یہ ظاہر کرنے کا تھا کہ ہلاک شدہ جنرل مجھے جی ایچ کیو لے جانا اور پھر قتل کرنا چاہتے تھے۔ جب جی ایچ کیو پر قبضہ کے لیے استعمال کرنے والے ہتھیار سرحد سے اسلام آباد جانے والے راستے کے دوران روک لیے گئے تو گروپ نے دعویٰ کیا کہ وہ کشمیری عسکریت پسند تھے لیکن مقامی پولیس نے جو منتخب حکومت کی وفادار تھی آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر معاملہ کی چھان بین کا فیصلہ کیا۔ آئی ایس آئی کے چیف نے اُن کی گرفتاری اور انکوائری کے احکامات دیئے۔

اس وقت جنرل وحید کاکڑ آرمی چیف تھے۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے کہا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

میں نے انہیں وزیراعظم ہاؤس میں بلایا۔ سازش کی تفصیلات منکشف کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا ''وزیراعظم! آپ خوش قسمت خاتون ہیں۔''

میں نے احتیاط سے قوم سے خطاب کا مطالعہ کیا جو سازش کے ایک کردار میجر ظہیر الاسلام عباسی نے پہلے ہی سے لکھ کر رکھا تھا۔ اُن کا خطاب تمام مسلمانوں سے اس اپیل سے شروع ہوا کہ تمام مسلمان اسلامی انقلاب کے لیے متحد ہو جائیں جو رُونما ہو چکا تھا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب سے اسلامی دنیا میں کوئی سرحدیں نہیں ہوں گی۔ افغانستان اور پاکستان کے مابین سرحدیں ختم ہو جائیں گی کیونکہ اسلام کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کنفیڈریشن کا پرانا خیال تھا جو اب نئی زبان میں تیار کیا گیا تھا۔ یقیناً سخت گیروں کا یقین تھا کہ وہ افغانستان سے وسط ایشیا، ترکی، چیچنیا سے یورپ کے ساحلوں تک پہنچ سکتے ہیں اور اسلام پھیلا سکتے ہیں۔ یہ خلافت کے لیے القاعدہ کی طرح کا خاکہ تھا۔ جنرل وحید کاکڑ نے مجھے کہا ''وزیراعظم میں ان افراد پر بغاوت کے الزام میں فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلاؤں گا اور انہیں پھانسی پر لٹکاؤں گا۔'' یہ سازشی افراد جنرل مشرف کے دور میں رہا کر دیئے گئے۔

میں فوج میں انتہا پسندوں کے گھس جانے کی وجہ سے پریشان تھی اور جنرل کاکڑ سے کہا کہ وہ 1995ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بجائے بعد میں بھی اس عہدے پر اپنی خدمات جاری رکھے۔ بدقسمتی سے جنرل کاکڑ نے آرمی چیف کی حیثیت سے اپنی ملازمت جاری رکھنے کی میری تجویز سے اتفاق نہ کیا۔

آئی ایس آئی کے ایک سابق افسر میجر عامر نے ٹی این ایس ایم کے نام سے جنگ جو تنظیم بنا رکھی تھی جو صوبہ سرحد میں فعال تھی۔ اس تنظیم نے 1996ء میں صوبہ سرحد کے علاقہ مالاکنڈ میں مسلح بغاوت تیار کی۔ مذہبی انتہا پسندوں نے پولیس سٹیشنوں پر قبضہ کر لیا اور میری پارٹی کے ایک رُکن اسمبلی کو ہلاک کر دیا۔ میری حکومت نے ان کی چال بازیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ہم عسکریت پسندوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے اور مالاکنڈ میں امن و امان قائم کیا۔ ایک پریس رپورٹ کے مطابق اس بغاوت کا ایک اہم لیڈر مولانا لیاقت 30 اکتوبر 2006ء کو باجوڑ واقعہ میں مارا گیا جب کہ اس کا ایک مسلح ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جب مجھے دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا تو میں نے وہ کیا جس کی ضرورت تھی اور مجھے عوام کی حمایت حاصل تھی۔ داخلی اور خارجی سطح پر دہشت گردی کے واقعات کم ہو گئے۔ جنوری 1996ء میں اکھوڑہ ڈیم کا افتتاح کرنے کے لیے میں بلوچستان گئی۔ یہ بلوچستان کے عوام کو پینے کا پانی فراہم

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کرنے کے لیے میرے عہد کی تکمیل تھی۔ ایک سینئر صحافی نے مجھے آگاہ کیا کہ اسے آرمی ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا جہاں اسے بتایا گیا کہ فوج اس (بے نظیر) سے تنگ ہے۔ ایک فولڈر اس کے حوالے کیا گیا جس میں موجود مواد پر مبنی کرپشن کے متعلق کہانی لکھنے کے لیے انہیں کہا گیا۔

مارچ میں فوج کے ایک میجر نے مجھے اطلاع دی کہ انٹیلی جنس نے میری حکومت برطرف کرنے کے لیے عدم استحکام کی کوششوں پر مبنی مکمل پروگرام تیار کیا ہے۔ ایک ماہ بعد ایک اور فوجی افسر نے مجھے اطلاع دی کہ افسر ڈیل کرنے کے لیے سپریم کورٹ سے رُجوع کر رہے ہیں۔ آئینی بحران کے بدلے میں جو صدر میری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے برپا کرتے چیف جسٹس کو عبوری وزیراعظم بنانے کا وعدہ کیا گیا۔

میں نے اور میری ٹیم نے آرمی چیف جنرل کرامت سے بعض فوجی افسروں کے تبادلے کرنے کا ایشو اُٹھایا لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے متذبذب تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے استعفیٰ دینے کی پیش کش کی۔ جب میں نے ڈائریکٹر جنرل آف ملٹری آپریشن جنرل محمود کے متعلق شکایت کی جو میرے خیال کے مطابق میرے خلاف مہم چلانے میں فعال کردار ادا کر رہے تھے۔ فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں میں وہ تبدیلیاں جو 1995ء کے آخر میں ہونا شروع ہو گئی تھیں، جب جنرل کاکڑ ریٹائرڈ ہوئے اور جنرل جاوید اشرف کا آئی ایس آئی سے تبادلہ ہو گیا، میری دوسری حکومت کی تباہی کا باعث بنی۔

جنرل کاکڑ کی ریٹائرمنٹ کے بعد فوج کے سخت گیروں نے صدر کی حمایت حاصل کر لی اور میری حکومت کو برطرف کرنے کی سازش کی۔ صدر کے ایک رشتہ دار نے اگست 1996ء میں مجھے اطلاع دی کہ ملٹری انٹیلی جنس نے اُن سے کہا ہے کہ وہ صدر تک اُن کا ایک پیغام پہنچا دیں۔ پیغام میں میری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اس انداز کی دھمکی دی گئی کہ جب تک وہ ایسا نہیں کرتے فوج صدر اور وزیراعظم دونوں سے نجات حاصل کر لے گی۔ فوج سے معاملہ طے کرنے والی آئینی قوتیں صدر کے بجائے میرے ساتھ ہوتیں تو میں اُن لوگوں کے خلاف انضباطی کارروائی کا حکم دیتی جو قانونی حکومت کے خلاف جوڑ توڑ میں شریک تھے لیکن صدر میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ انٹیلی جنس کے جنرلوں کا مقابلہ کرتے۔

صدر اس فریب میں مبتلا تھے کہ فوج کی حمایت سے وہ 10 سال تک صدر رہ سکتے تھے۔ یہ یقینی امر ہے کہ صدر کو انٹیلی جنس نے ڈرایا دھمکایا تھا۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل اگست 1996ء میں آرمی کے سربراہ سے ملاقات کرنے کے لیے گئے۔ انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سے کہا کہ صدر وزیراعظم کو برطرف کرنے کے لیے تیار ہے لیکن انہیں شبہ ہے کہ فوج کے سربراہ وزیراعظم کے بہت قریب ہیں۔ اگر یہ صورت حال نہیں ہے تو آرمی چیف کو صدر کے ساتھ وزیر اعظم کو برطرفی کرنے کا ایشو اُٹھانا چاہیے۔

ان دو پیغامات سے جن میں سے ایک جنرل محمود کی طرف سے صدر کے رشتہ دار کو دیا گیا اور دوسرا جو جنرل گل نے ملٹری چیف کو دیا، میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ فریب دہی پر مبنی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ صدر کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ حکومت کو برطرف نہیں کرتے تو انہیں بھی ہٹا دیا جائے گا۔ آرمی چیف کو دھمکی دی گئی کہ اگر وہ وزیراعظم کے بہت نزدیک ہیں تو انہیں صدر کے ذریعے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس وقت صدر کے پاس فوج کے سربراہوں کا تقرر کرنے اور انہیں ہٹانے کے آئینی اختیارات تھے۔

ایم آئی کے سربراہ جنرل محمود جنرل مشرف کے انقلاب کے بنیادی محرک تھے۔ بعد ازاں وہ آئی ایس آئی کے سربراہ بن گئے۔ انہیں 9/11 کے بعد بین الاقوامی دباؤ کے تحت ریٹائر کیا گیا۔ بڑھتی ہوئی سیاسی بے یقینی کے درمیان میرے خاندان کے ساتھ ایک اور الم ناک واقعہ پیش آیا۔ میرے والد ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ میرے بھائی شاہ نواز کو فرانس میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ 20 ستمبر 1996ء کو میرا خاندان ایک اور قتل سے سخت صدمہ انگیز صورت حال کا شکار ہوا۔ میرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں اس کے گھر کے سامنے پولیس فائرنگ کے ذریعے قتل کر دیا گیا۔ میں خصوصاً سخت پریشان ہوئی کیونکہ کچھ سالوں کی سیاسی رنجش کے بعد ہماری اب مصالحت ہوئی تھی اور ہمارا خاندان ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے قریب آ رہا تھا۔ میں بہت افسوس کے ساتھ کہتی ہوں کہ میں امریکہ کے ضیاء کے متعلق غلط اندازوں کا عمل نئے فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے معاملہ میں بھی دیکھ رہی ہوں۔

اداروں میں جمہوریت کا انفراسٹرکچر تباہ ہو جانے کی شکل میں نکلا ہے۔ علاوہ ازیں بجٹ میں اُن کی ترجیحات کا رُخ سماجی شعبے سے فوج کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس سے لاکھوں پاکستانی جو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہیں اُن کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ہم اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جنرل مشرف پر قاتلانہ حملوں کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ ان پر مزید کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ خطرہ پھر بھی موجود ہے۔ پاکستان میں پائیدار جمہوریت قائم کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے دوررس نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

مشرف حکومت پاکستانی سرحد کے بعض حصوں میں اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ کنٹرول نہیں کیے جا سکتے۔ یہ انوکھا خیال کہ پاکستان کے یہ وسیع حصے کنٹرول نہیں کیے جا سکتے محض حماقت ہے۔ وزارت عظمیٰ کے دونوں ادوار میں میری حکومت نے امن و امان قائم کرنے کے لیے ان علاقوں میں فوجیں بھیجیں۔ اب مشرف حکومت نے دہشت گردوں کو ان علاقوں پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ان کی حکومت ان دہشت گردوں کے ساتھ رہتی ہے جو طیاروں اور ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرنے والی معصوم خواتین، بچوں اور مردوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اگر ایک خاتون وزیراعظم کے دور میں اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں تو اس پر کمزور اور بے صلاحیت ہونے کا الزام عائد کیا جائے گا۔ لیکن یہ جنرل ہر کام سزا کی بریت کے بغیر کر رہا ہے۔ خواتین کے عظیم کاموں کے باوجود عورت مرد کی کارکردگی کو جانچنے میں دوہرے معیار برقرار ہیں۔

مشرف دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تھوڑا تھوڑا کر کے مدد فراہم کر رہے ہیں۔ چمچہ بھر ضرورت کے مطابق تاکہ واشنگٹن اور لندن کی نگاہوں میں اچھے بنے رہیں۔ لیکن ان کی پالیسیاں مغرب کے دشمنوں کو طاقت دے رہی ہیں۔ میں نے جو سال وزیراعظم کی حیثیت سے گزارے تو یہ سیاسی مدرسے جو ملک میں مغرب کے خلاف عدم رواداری اور جنگ کی تعلیم دے رہے ہیں انہیں کنٹرول کیا اور بعض اوقات انہیں ختم بھی کیا۔ اب یہ موجودہ پاکستانی ملٹری ڈکٹیٹر کے تحت پھل پھول رہے ہیں۔ پاکستان میں جمہوریت کے خلاف ضیاء کے انقلاب کی دو دہائیوں کے بعد ایک اور آرمی چیف نے سویلین حکومت کے خلاف انقلاب برپا کیا ہے۔ اپنے سے پہلے کی ڈکٹیٹرشپ کی قیادت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئے پاکستانی ڈکٹیٹر نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے مفاد کے لیے مدد فراہم کر کے مغرب کے ساتھ فلرٹ کیا ہے۔ اس سے امریکہ اور برطانیہ اس کی سیاسی حمایت سے دور ہوئے ہیں جبکہ طالبان پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پھر منظم ہوئے ہیں اور ہمسایہ ملک افغانستان میں نیٹو کے فوجیوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔

اکثریت پسندوں کے سیل جوں کے توں ہیں۔ اُن کے لیڈر گرفتار کیے جاتے ہیں اور جونہی عالمی توجہ رُخ پھیرتی ہے انہیں رہا کر دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اپوزیشن لیڈروں پر دباؤ ڈال کر منتخب کردہ سیاسی جماعتوں کو قتل کر کے، پریس پر پابندی عائد کر کے اور انسانی حقوق کی وجوہات کو روک کر فوجی ڈکٹیٹرشپ اب بھی روبہ عمل ہے۔

فوجی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ اس امر کی یقین دہانی حاصل کی جائے کہ حکومتیں تشکیل دینے کے لیے انٹیلی جنس اداروں کا کوئی متبادل نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پی پی پی کی مخالفت کرتے ہیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شہادت سے قبل بے نظیر کا آخری خطاب

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن و سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے لیاقت باغ راولپنڈی میں اپنی شہادت سے قبل انتخابی جلسے سے اپنی زندگی کے آخری خطاب میں کہا کہ قائداعظم اور بھٹو کا پاکستان آج ایک بار پھر شدید خطرے میں ہے اور حکمران پاکستان کو توڑنے کے لیے جنرل یحییٰ، جنرل ایوب اور جنرل ضیاء سے بھی آگے نکل چکے ہیں۔ ملکی سرحدیں غیر محفوظ ہیں اور پاکستان بدامنی کا شکار ہے، انتظامیہ اور پولیس کا ساتھ نہ دے کر دہشت گردوں کو تقویت دینے والے اب فوجی آپریشن کے ذریعے ملک کو انارکی میں دھکیل رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی روزگار، تعلیم، صحت، ماحول اور مساوات کے 5 نکاتی منشور کے تحت میدان میں اُتر چکی ہے اور 8 جنوری کو آمریت سے جمہوریت کی طرف نئے سفر کا آغاز ہوگا۔ پنجاب کے عوام ملک وقوم کے دفاع کے لیے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیں۔ ہم پاکستان کا تحفظ کرتے ہوئے نہ صرف خطے سے بیرونی فوجوں کو بے دخل کریں گے بلکہ ملک میں دہشت گردوں کا مکمل خاتمہ کریں گے۔ راولپنڈی بہادروں اور جاں نثاروں کا علاقہ ہے۔ اسے میں اپنا دوسرا گھر سمجھتی ہوں۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت کے دور میں راولپنڈی کے سکول میں پڑھتی تھی، راولپنڈی کے لوگ ہر خوشی وغم میں میرے ساتھ شامل رہے۔ راولپنڈی کے عوام نے لیاقت باغ کے گراؤنڈ میں طاقت کا مظاہرہ کر کے جنرل یحییٰ کو رخصت کیا اور اقتدار کا تاج پیپلز پارٹی کے سر پر رکھا۔ اس شہر کے لوگوں نے جمہوریت کے لیے قربانیاں دیں اور آمروں کو ہمیشہ شکست دی۔ اب جلد یہاں جمہوریت کا سورج دوبارہ طلوع ہوگا۔ جنرل ضیاء کی آمریت میں بھی یہاں کے نوجوانوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور یہاں کے عبدالمجید نے خودسوزی کی، ادریس کو پھانسی پر چڑھایا گیا لیکن کارکنوں نے پارٹی اور اس کے نظریات کو نہیں چھوڑا۔ قائد عوام نے مظلوم لوگوں کے لیے پارٹی بنائی اور اپنے دور میں عوامی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا اور دفاع کو لازوال بنا کر پاکستان کو دنیا بھر میں ایک باوقار مقام دیا۔ بھٹو مرحوم نے لاہور میں اسلامی کانفرنس منعقد کر کے پوری اسلامی دنیا کو یہاں جمع کیا۔ لاہور پنجاب اور پنجاب پاکستان کا دل ہے،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

فوجی حکومت کے حامیوں کو صدر جان ایف کینڈی کے الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے 1961ء میں اپنے افتتاحی خطاب میں کہے تھے۔ ''جو شیر کی کمر پر سواری کرتا ہے عموماً اندر سے ڈرا ہوتا ہے۔''

جنرل مشرف سے میری اتفاقیہ ملاقات اس وقت ہوئی جب ترک فوجیوں کے دوروں کے دوران انہوں نے ترک مترجم کے فرائض سرانجام دیئے۔ میں نے انہیں اپنا ملٹری سیکرٹری بنانے سے انکار کیا۔ ہم نے مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے ساتھ ان کے مشتبہ روابط کی وجہ سے شروع میں ان کی ترقی کرنے سے انکار کر دیا۔ آخری دفعہ میری ان سے ملاقات سب سے اہم تھی جب انہوں نے 1996ء میں کشمیر پر جنگ کے متعلق خاکہ پیش کیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

یہاں کے عوام نے ہمیشہ پاکستان کی بقاء کے لیے دلیری کا مظاہرہ کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے بھی پنجاب نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ پنجاب کے لوگ قربانی دینے میں ہمیشہ آگے رہے اور پاکستان بنانے کے لیے پہل کی۔ جنرل ایوب کے دور میں ہونے والی پاکستان بھارت جنگ میں لاہور میں عوام نے پیٹ اور سینے سے بم باندھ کر پاکستان اور پنجاب کا دفاع کیا۔ میں پنجاب کے عوام کو سلام پیش کرتی ہوں، جس طرح ماضی میں عوام نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان بنایا اسی طرح عوام پاکستان کے استحکام و سلامتی کے لیے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیں تاکہ پاکستان کو باعزت مقام دلایا جائے۔ بھٹو مرحوم نے اس ملک کو 73ء کا آئین دیا۔ جرنیلوں نے ہمیشہ آئین توڑا۔ بھٹو نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنایا۔ جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو خطے میں بے چینی تھی۔ جنرل یحیٰی نے اس دوران پاکستان کو توڑا لیکن بھٹو نے عوام پر واضح کیا کہ ہم گھاس کھالیں گے لیکن پاکستان کو ایٹمی قوت بنائیں گے۔ انہوں نے ملک کو مضبوط کیا۔ میری وزارت عظمیٰ کے دور میں جرنیلوں نے مجھے کہا کہ بھارت کے پاس میزائل ٹیکنالوجی ہے اور پاکستان اس سے محروم ہے اگر ہمارے پاس بھی یہ ٹیکنالوجی ہو تو پاکستان کا دفاع مضبوط ہوگا۔ ہم نے پاکستان کو دشمن پر جوابی حملے کی طاقت دی۔ کئی ملکوں کے دورے کر کے میں نے مسلح افواج کو میزائل ٹیکنالوجی دلوائی۔ ماضی میں عوام نے صرف ایک خاتون کو وزیراعظم نہیں بنایا بلکہ اسلامی دُنیا میں پہلی خاتون کو وزیراعظم بنا کر پاکستان کا نام روشن کیا۔ ہماری سیاست ملک کو اندرونی طور پر مضبوط کرنے کے لیے پیپلز پارٹی کے منشور میں یہ شامل ہے کہ جس ملک میں غریب کا پیٹ خالی ہو وہ ملک مضبوط نہیں ہوسکتا۔ صرف ایٹمی صلاحیت اور میزائل ٹیکنالوجی دُکھوں کا مداوا نہیں کرسکتی۔ میں فخر سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ عوام کی حمایت اور محبت کے نتیجے میں عوامی طاقت کے ساتھ ماضی میں پیپلز پارٹی نے مضبوط حکومت بنائی، کسی کو ملک توڑنے کی جرأت نہیں ہوئی، کسی کو پاکستان پر جنگ مسلط کرنے اور تخریب کاری کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ پیپلز پارٹی کے دور میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ملک کی عزت پیپلز پارٹی کی عزت ہے اور ہم عزت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم نے پاکستان کو امن دیا۔ جب بیرونی دُنیا پاکستان کو دہشت گرد قرار دے رہی تھی تو ہم نے پاکستان کو بچایا۔ آج پھر ملک خطرے میں ہے اور بلوچستان میں فوجی آپریشن سے مایوسی پھیل رہی ہے۔ سرحدوں پر عجیب صورت حال ہے۔ انتظامیہ اور پولیس کا ساتھ نہ دے کر سرحدی علاقوں میں دہشت گردوں کو پہلے پروان چڑھایا گیا اب وہاں فوجی آپریشن کیے جا رہے ہیں۔ وزیرستان اور قبائلی علاقوں کے علاوہ چارسدہ میں عید کے اجتماع پر قتل عام ہو رہا ہے اور پرویز مشرف حکومت نہیں سنبھال سکتے۔ موجودہ حکمران یہ چاہتے ہیں کہ سوات اور باجوڑ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سمیت دیگر علاقوں سے پاکستانی پرچم غائب کر دیا جائے۔ یہ ہمارا ملک ہے اور اسے ہم سنبھالیں گے۔ ہم غیر ملکیوں کو پاکستان میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ مجھے اپنے عوام پر اعتماد ہے اور میں عوامی طاقت سے ملک بچاؤں گی جس طرح قائداعظم نے ملک بنایا اور قائد عوام نے ملک بچایا تو ہم اور عوام مل کر اسے دوبارہ مضبوط بنائیں گے۔ خزانہ بھرا ہونے کا دعویٰ کرنے والے حکمران دیکھ لیں کہ عوام کی جیب خالی ہے، آج مہنگائی ہے تنخواہ دار اور پنشنرز بمشکل زندگی گزار رہے ہیں۔ موجودہ حکومت عوامی مشکلات کے خاتمے کے لیے ناکام ہو چکی ہے۔ ہم نے اپنے نظریات کے تحت یہ منشور دیا ہے کہ روزگار اور تعلیم عام کی جائے گی اور راولپنڈی میں نئی یونیورسٹی بنائی جائے گی اور توانائی کے شعبے کو فروغ دیا جائے گا۔ عوام کو زندگی گزارنے کے لیے بہتر ماحول اور صحت کی سہولیات دی جائیں گی۔ ملک میں مساوات کا نظام لایا جائے گا، پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں کارخانے لگائے جائیں گے۔ زرعی ملک ہونے کے ناطے زراعت کو جدید خطوط پر اُستوار کریں گے۔ مزدوروں کو یونین سازی کا حق دیں گے۔ ڈاؤن سائزنگ پر مکمل پابندی لگائیں گے۔ پیپلز پارٹی نے ہمیشہ قربانیاں دیں اور میرے باپ کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ میرے بھائی قتل ہوئے لیکن ہم نے عوام کو کبھی نہیں چھوڑا، یہ سال ایک اہم سال ہے۔ اس سال میں اہم واقعات ہوئے۔ چیف جسٹس کو دو مرتبہ نکالا گیا اور ججوں کو گرفتار کیا گیا۔ لال مسجد میں بے گناہوں کو خون میں نہلایا گیا۔ اب عوام تبدیلی لانے اور ملک کو آمریت سے جمہوریت کی طرف لانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ حکمرانوں کی کوشش ہے کہ غیر آئینی اقدامات کو طول دینے کے لیے پھر بوگس اسمبلی بنائی جائے۔ مگر عوام یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ میری بہنو اور بھائیو میرا اور آپ کا ملک خطرے میں ہے ہم نے مل کر اپنے ملک کو بچانا ہے آیئے عہد کریں کہ ہم پاکستان کی آزادی اور سلامتی کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

دبئی سے مقتل گاہ تک

قیوم نظامی

محترمہ بے نظیر بھٹو نے 2002ء کے انتخابات سے پہلے پاکستان واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا مگر جنرل پرویز مشرف نے بے نظیر کے خلاف خصوصی قوانین جاری کر کے بے نظیر کو واپسی کا فیصلہ مؤخر کرنے پر مجبور کر دیا۔ بے نظیر جلا وطن رہ کر بھی پی پی پی کو منظم، متحد اور فعال رکھنے میں کامیاب رہیں۔ پی پی پی نے بے نظیر غیر حاضری کے باوجود 2002ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ یہ کامیابی پارٹی قیادت کے لیے حوصلہ افزا تھی۔ بے نظیر نے ایک جانب، جنرل پرویز مشرف کے مختلف حربوں کا مقابلہ کیا جن کا مقصد پی پی پی کو کمزور اور تقسیم کرنا تھا اور دوسری جانب بے نظیر عالمی طاقتوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہیں کہ دہشت گردی کا مقابلہ مکمل جمہوریت اور سیاسی آپشن ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ جنرل پرویز مشرف 2007ء میں اپنے اقتدار کے آٹھ سال پورے کرنے والے تھے امریکہ اور مغرب کو اُن کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو کا خیال تھا کہ اگر 2008ء میں منعقد ہونے والے انتخابات کے دوران وہ پاکستان سے باہر رہیں تو پی پی پی کمزور ہو جائے گی اور اُن کا اپنا سیاسی مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ پاکستان کو اُن کی قیادت کی ضرورت ہے لہٰذا انہیں پاکستان واپس آ کر عوام کی قیادت کرنی چاہیے تاکہ پاکستان کو بحران سے باہر نکالا جا سکے۔

بے نظیر بھٹو نے 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی واپسی کا اعلان کر دیا۔ اُن کے اس اعلان سے پورا پاکستان جھوم اُٹھا۔ پاکستان کے وکلاء جنرل پرویز مشرف کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔ جسٹس افتخار محمد چوہدری سپریم کورٹ کے فل بنچ کے فیصلہ کی روشنی میں چیف جسٹس کے عہدے پر بحال ہو چکے تھے۔ جنرل پرویز مشرف کے صدارتی انتخاب کے بارے میں ایک رٹ سپریم کورٹ کے زیر سماعت تھی۔ جنرل پرویز مشرف کا خیال تھا کہ ان حالات میں بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی اُن کی حکومت کے لیے عدم استحکام کا سبب ہو گی لہٰذا اُنہوں نے بے نظیر کو اپنی واپسی کچھ عرصہ کے لیے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مؤخر کرنے کا مشورہ دیا مگر اس مشورے کا ٹھوس جواز پیش نہ کیا۔ پی پی پی اپنی قائد کے تاریخی استقبال کی تیاریاں مکمل کر چکی تھی لہٰذا بے نظیر اپنے فیصلے پر کاربند رہیں۔ بے نظیر نے اپنی واپسی سے قبل جنرل پرویز مشرف کے نام ایک خفیہ خط روانہ کیا جس میں خدشہ ظاہر کیا کہ چوہدری پرویز الٰہی، بریگیڈیئر اعجاز شاہ، حسن وسیم افضل، اور جنرل (ر) حمید گل اُن کی زندگی ختم کرنے کی سازش کر سکتے ہیں۔ جنرل مشرف نے اس خط کو کوئی اہمیت نہ دی۔

بے نظیر اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی کے ایئرپورٹ پر اُتریں تو عوام کے سمندر نے اُن کا پرتپاک استقبال کیا۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان بھر سے تیس لاکھ عوام تاریخی استقبال میں شریک ہوئے۔ بے نظیر قرآن کے سایے میں جہاز سے باہر آئیں تو اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ انہوں نے ہاتھ بلند کیے اور آسمان کی جانب دیکھ کر دعا مانگی۔ وہ آٹھ سال کی جلا وطنی کے بعد اپنے وطن واپس آئی تھیں۔ اس دوران اُن کے کئی پیارے عزیز اور رفقاء بچھڑ چکے تھے اور وہ آخری رُسومات میں شرکت سے بھی محروم رہی تھیں۔ بے نظیر انتہائی خوش تھیں۔ عوام کا ہجوم خوشی سے رقص کر رہا تھا۔ اس عظیم الشان ریلی کی منزل قائداعظم کا مزار تھی۔ استقبالی ریلی میں عوام کی غیر معمولی شرکت پارٹی کے مرکزی قائدین اور حکمرانوں کے لیے حیران کن تھی۔ حکومت کے اندازوں کے مطابق بے نظیر بھٹو ڈاکٹر قدیر خان کے بارے میں منفی اور امریکہ کے بارے میں مثبت بیانات کی وجہ سے مقبولیت کھو چکی تھیں اور حکمرانوں کے اقتدار کے لیے خطرہ نہیں بن سکتی تھیں۔ کراچی کے بے مثال استقبال نے حکمرانوں کے اوسان خطا کر دیئے۔ عوام کا ہجوم انتہائی سست رفتار کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کارساز کے مقام پر یکے بعد دیگرے دو طاقت ور خودکش دھماکے ہوئے جس میں 180 شہری جاں بحق ہو گئے۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں پی پی پی کے غریب کارکن اور سپاہی شامل تھے۔ اس سانحے میں 500 شرکاء زخمی ہوئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور اُن کے رفقاء معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ پاکستان کے عوام کا عمومی تاثر یہ تھا کہ یہ دھماکہ خفیہ ہاتھوں نے کرایا۔ کئی ماہ گزر جانے کے باوجود کراچی کے سانحہ کے ملزموں کو بے نقاب نہیں کیا جا سکا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اس نوعیت کا دھماکہ اور خودکش حملہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اگر بے نظیر بھٹو کا کوئی ذاتی ایجنڈا ہوتا تو وہ کراچی دھماکے کے بعد دبئی واپس روانہ ہو جاتیں مگر وہ تو پاکستان اور جمہوریت کا قومی ایجنڈا لے کر ملک واپس لوٹی تھیں اور پاکستان کے لیے اپنی جان قربان کر دینے کے لیے تیار تھیں۔ انہوں نے کراچی سانحہ کے بعد بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کو محدود نہ کیا۔ وہ چاروں صوبوں کی زنجیر تھیں لہٰذا انہوں نے سندھ، بلوچستان، سرحد اور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پنجاب کا دورہ کیا۔ بے نظیر بھٹو نے کئی بار حکومت سے مکمل سیکیورٹی کا مطالبہ کیا مگر حکومت نے کوئی سنجیدہ نوٹس نہ لیا۔ بے نظیر نے امریکہ کے نامور لابی اسٹ مارک سیگل کو ای میل پیغام بھیجا جس میں تحریر کیا کہ حکومت پاکستان انہیں مناسب سکیورٹی فراہم نہیں کر رہی لہٰذا اُن کی موت کی ذمہ داری جنرل پرویز مشرف پر عائد ہوگی۔ ایک رپورٹ کے مطابق جنرل مشرف نے 18 اکتوبر کے سانحہ کے بعد بے نظیر بھٹو سے فون پر بات کی اور یقین دلایا کہ کراچی دھماکے کی مکمل اور غیر جانب دارانہ تحقیقات کر کے ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔ اس گفتگو کے دوران جنرل مشرف نے بریگیڈیر ایاز شاہ کا غیر معمولی طور پر دفاع کیا۔

بلوچستان اور سرحد کا دورہ مکمل کرنے کے بعد بے نظیر بھٹو 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں تاریخی جلسے سے خطاب کے لیے پہنچیں۔ انہوں نے عوام سے پُر جوش انداز میں خطاب کیا۔ بے نظیر نے کہا ''یہ ہمارا ملک ہے اسے ہم سنبھالیں گے۔ ہم غیر ملکیوں کو پاکستان میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ مجھے اپنے عوام پر اعتماد ہے اور میں عوامی طاقت سے ملک بچاؤں گی جس طرح قائداعظم نے ملک بنایا اور قائد عوام نے ملک بچایا تو میں اور عوام مل کر اسے دوبارہ مضبوط بنائیں گے۔'' بے نظیر خطاب کے بعد بہت خوش تھیں۔ پنجاب کے تاریخی سیاسی باغ نے اُن کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ جب وہ واپس جانے کے لیے اپنی گاڑی میں سوار ہوئیں تو عوام نے پُر جوش انداز میں اُن کی گاڑی کو گھیرے میں لے لیا اور جیئے بھٹو کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ بے نظیر عوام کو سلام کرنے کے لیے سن روف سے باہر نکلیں تو ایک شخص نے اُن پر گولی چلا دی جب کہ ایک دوسرے شخص نے خود کش دھماکہ کر دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے 22 جاں نثاروں کے ساتھ شہید ہوگئیں۔ اس الم ناک سانحہ کے عینی شاہد ڈاکٹر صفدر عباسی نے بے نظیر بھٹو کے قتل کے واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''بے نظیر بھٹو نے ریلی کے اختتام پر مجھے کہا کہ میں اُن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ بے نظیر کراچی سانحے کے بعد بہت محتاط تھیں اور آخری وقت تک نہیں بتاتی تھیں کہ وہ کس کار میں بیٹھیں گی۔ لیاقت باغ کی ریلی کے بعد انہوں نے سفید بلٹ پروف جیپ نمبر BF 7772 میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ ناہید خان اُن کے ساتھ بیٹھ گئیں اور میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ مخدوم امین فہیم فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ محترمہ مسکرا رہی تھیں وہ ناہید خان کی جانب مڑیں اور اسے گلے لگا کر کہا کہ 'یہ ساری تمہاری محنت ہے۔ تم نے ریلی کو کامیاب بنانے کے لیے بہت کام کیا۔' بے نظیر نے ناہید کے رخسار پر بوسہ دیا۔ جب جیپ نے چلنا شروع کیا بے نظیر نے دیکھا کہ بہت لوگ اُن کے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

لیے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ بے نظیر اُوپر اُٹھیں اور اپنا سر سن روف سے باہر نکال لیا۔ بے نظیر نے پُر جوش طور پر ہاتھ ہلا کر عوام کے نعروں کا جواب دیا۔ جیپ بڑی آہستہ چل رہی تھی۔ ہجوم میں سے ایک کارکن نے نعرہ لگایا ''بھٹو دے نعرے'' بے نظیر نے دوسرے کارکنوں کے ساتھ نعرے کے جواب میں کہا ''وجن گے۔'' یہ بے نظیر کے آخری الفاظ تھے۔ میں نے بے نظیر کو سن روف سے نیچے گرتے دیکھا۔ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی۔ ہم نے خیال کیا کہ گولی کی آواز سننے کے بعد بے نظیر جیپ کے اندر آ گئی ہیں۔ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ اُن کو گولی لگ چکی ہے۔ بے نظیر ناہید خان کے اُوپر لڑھک گئیں۔ ہم بے نظیر سے بات بھی نہ کر پائے تھے کہ جیپ خود کش دھماکے سے ہٹ ہوئی۔ میجر امتیاز نے کار کو جائے وقوعہ سے نکال لیا۔ ہم نے سوچا کہ دھماکے کی آواز کی وجہ سے بے نظیر بیلنس نہیں رہیں اور وہ گولی کی آواز سے بھی حیرت زدہ ہیں اس لیے بول نہیں رہیں۔ ناہید خان نے بے حس بے نظیر کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بے نظیر کی گردن کی بائیں جانب سے خون نکل رہا ہے۔ ناہید خان نے۔ بے نظیر کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اپنے دوپٹے سے خون بند کرنے کی کوشش کی۔ میجر امتیاز نے تیز رفتاری سے جیپ چلائی اور ہم ہسپتال کی جانب روانہ ہوئے۔ جیپ پھٹے ہوئے ٹائروں کی وجہ سے رُک گئی۔ بے نظیر کو پی پی پی لیڈر کی کار میں منتقل کیا گیا اور راولپنڈی کے جنرل ہسپتال پہنچے جہاں پر ڈاکٹروں نے بے نظیر کی جان بچانے کی پوری کوشش کی مگر بے نظیر شہید ہوگئیں۔''

بے نظیر بھٹو کی ناگہانی موت نے پورے پاکستان کو سکتے میں مبتلا کر دیا۔ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دُنیا سکتے میں آ گئی۔ بے نظیر نے اپنی جان پاکستان، عوام اور جمہوریت کے لیے نثار کر دی۔ جب بے نظیر کو گولی کا نشانہ بنایا گیا اس وقت پولیس اُن کی جیپ کے اردگرد موجود نہ تھی۔ اگر بے نظیر کو مکمل سکیورٹی فراہم کی جاتی تو قاتل اُن کی جیپ کے قریب نہیں پہنچ سکتے تھے۔ حیران کن طور پر جائے وقوعہ کو چند گھنٹوں کے اندر پانی سے صاف کر دیا گیا۔ حالانکہ قانون کے مطابق جائے وقوعہ کو کم از کم دو دن تک محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ فارسنیک نمونے حاصل کیے جا سکیں اور تحقیقاتی ادارے مختلف شواہد حاصل کر سکیں۔ حکومت نے اس سانحہ کے بعد غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ پوسٹ مارٹم قانونی ضرورت تھی اسے نظر انداز کیا گیا۔ لاش کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں پر دباؤ ڈالا گیا۔ ابتدائی طور پر سرکاری سطح پر اعلان کیا گیا کہ بے نظیر کی موت گولی لگنے سے ہوئی ہے۔ بعد میں وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیر چیمہ نے نیا مؤقف بیان کرتے ہوئے کہا کہ بے نظیر بھٹو نے جب اپنا سر گاڑی کے اندر کرنے کی کوشش کی تو اُن کا سر گاڑی کے سن روف کے لیور سے ٹکرا گیا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بیگم نصرت بھٹو ایک زندہ لاش

قیوم نظامی

بیگم نصرت بھٹو پاکستان کی بدقسمت خاتون ہیں۔ اُن کے شوہر ذوالفقار علی بھٹو کو ایک آمر نے پھانسی دے دی اور وہ اپنے شوہر کے آخری دیدار سے محروم رہیں۔ کسی عزیز کی موت فطری ہو تو انسان صبر کر لیتا ہے۔ غیر فطری موت کا غم دیرپا ہوتا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو ابھی اپنے شوہر کے غم سے نکل نہ پائی تھیں کہ فرانس میں اُن کا نوجوان بیٹا شاہ نواز بھٹو پُراسرار طور پر قتل ہو گیا۔ بیگم بھٹو کے لیے نوجوان بیٹے کی موت قیامت سے کم نہ تھی۔ شاہنواز کی موت نے اُن کی صحت کو متاثر کیا البتہ اُن کا ایک بیٹا مرتضیٰ بھٹو موجود تھا جو اُن کے لیے جینے کی آخری اُمید تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اپنے بیٹے کے ساتھ 70 کلفٹن کراچی میں رہتی تھیں۔ اس گھر کے ساتھ اُن کی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ اُن کے پوتے اور پوتیاں انہیں جینے کا حوصلہ دیتے تھے۔ قدرت نے بیگم نصرت بھٹو سے جینے کا آخری سہارا بھی چھین لیا۔ اُن کا آخری بیٹا مرتضیٰ بھٹو 70 کلفٹن کے سامنے پولیس کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ بیگم نصرت بھٹو جو پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں یہ غم برداشت نہ کر سکیں۔ اُن کی دماغی صلاحیت متاثر ہوئی اور وہ یادداشت کھو بیٹھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی والدہ کو دبئی لے گئیں اور اُن کی نگہداشت کرتی رہیں۔ بیگم نصرت بھٹو تو ایک زندہ لاش بن چکی ہیں۔ وہ تو شاید کسی کو پہچان بھی نہیں سکتیں۔ زندہ لاش کو کیا خبر کہ اُن کی سب سے بڑی بیٹی پنکی بھی اُن کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ بے نظیر بھٹو کی موت بھی غیر فطری ہوئی۔ بھٹو خاندان کتنا بدنصیب ہے کہ اسے وطن کی محبت پر نثار ہونا پڑا۔ بھٹو شہید کی صرف ایک بیٹی صنم بھٹو زندہ ہے۔ بیگم نصرت بھٹو اگر ہوش و حواس میں ہوتیں تو اپنے وطن سے یہ گلہ ضرور کرتیں:

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارض وطن
جو تیرے عارض بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہو گا
کتنے آنسو تیرے صحراؤں کو گلزار کریں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جس سے اُن کی شہادت ہوئی۔ بریگیڈیر چیمہ نے طالبان کے کمانڈر بیت اللہ محسود پر قتل کا الزام لگاتے ہوئے ایک ٹیپ بھی پیش کی جس میں بیت اللہ محسود اپنے ایک ساتھی کو کامیاب آپریشن کے لیے مبارک باد دے رہے ہیں۔ عوام نے اس ٹیپ پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ کی سکاٹ لینڈ یارڈ کی ایک ٹیم نے بے نظیر کے قتل کی تحقیقات کیں۔ پی پی پی کی مرکزی کمیٹی نے اقوام متحدہ کی زیر نگرانی تفتیش کا مطالبہ کیا۔ جنرل پرویز مشرف نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔

بے نظیر کے بہیمانہ قتل کے بعد پورے پاکستان میں شدید احتجاج ہوا۔ اس احتجاج میں جرائم پیشہ عناصر ملوث ہو گئے جنہوں نے بنکوں میں لوٹ مار کی، سرکاری اور نجی املاک اور گاڑیوں کو نذر آتش کیا جس سے پاکستان کو اربوں روپے کا مالی نقصان ہوا جب کہ درجنوں شہری جاں بحق ہو گئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا ہے اسے مستقبل قریب میں پُر کرنا ممکن نہیں ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہو کر بھی پاکستان کی سیاست پر طویل عرصے تک چھائی رہیں گی اُن کی شہادت سے پاکستان اور اقوام عالم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے جس کے اثرات وقت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ بے نظیر بھٹو کے جسد خاکی کو گڑھی خدا بخش لے جایا گیا اور انہیں ذوالفقار علی بھٹو شہید کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بیگم نصرت بھٹو نے اپنی زندگی کی کہانی اپنی زبان میں بیان کی:

''میرے بچپن میں، جب ہم ابھی ممبئی میں رہتے تھے تو اکثر نزدیکی پُرفضا پہاڑی مقام ''کھنڈالہ'' جایا کرتے تھے۔ وہاں پر ہم نے موسم گرما کے لیے چھوٹا سا گھر بنا رکھا تھا۔ بعض اوقات ہم ''کھنڈالہ'' کے نزدیک ''لونا والا'' بھی جایا کرتے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ انہیں (ذوالفقار علی بھٹو) ''لونا والا'' میں دیکھا اور مجھے یہ کل کی بات لگتی ہے۔ میں اس وقت گیارہ برس کی تھی۔ ہم وہاں گھوم پھر رہے تھے اور اُن کے گھر والے بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ اتفاقاً ہم دونوں کے والدین اکٹھے مل بیٹھے اور آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ وہاں صرف ہم تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا (ذوالفقار علی بھٹو) چنانچہ ہم بچوں نے بھی آپس میں گپ شپ شروع کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سندھ سے آئے تھے تو ہم نے پھر اُن سے پوچھا سندھ کہاں واقع ہے؟ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ کہاں پر واقع ہے..... میرا خیال ہے کہ ہم دو مرتبہ ملے..... پھر ہم بھی کراچی منتقل ہو گئے۔''

نصرت اصفہانی کے والدین اصفہان سے آئے تھے۔ اُن کے پردادا کے تین بیٹے تھے جن میں سے ایک ریشم سازی سیکھنے کے لیے چین بھیجا گیا اور وہ تاجر بن گیا۔ دوسرا بیٹا، جو بیگم نصرت کے دادا تھے، کو اعلیٰ اسلامی تعلیم کے لیے نجف اشرف بھیجا گیا اور انہوں نے اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے لیے وقف کر دی اور آیت اللہ بنے۔ باپ نے تیسرے بیٹے کو گھر پر ہی رکھا تا کہ وہ آبائی زمینوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ وہ کاشت کار بنا۔ بیگم نصرت کے والد مرزا محمد، نجف میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندانی نام مرزا محمد عبداللطیف اصفہانی تھا۔ انہوں نے نجف ہی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک خوش طبع انسان تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ چھٹیاں گزارنے ممبئی گئے اور یہ شہر انہیں اتنا پسند آیا کہ جب وہ گھر واپس آئے تو انہوں نے اپنے محسوسات والد کے گوش گزار کیے اور خواہش کا اظہار کیا کہ وہ برصغیر میں بسنا چاہتے ہیں۔ اس طرح نصرت اصفہانی کے والدین ہندوستان منتقل ہوئے۔ اُن کے والد نے ''بغداد سوپ انڈسٹری'' کے نام سے ممبئی میں ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔

نصرت اصفہانی 23 مارچ 1929ء کو ممبئی میں پیدا ہوئیں اور وہ اپنے والدین کی تیسری بیٹی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تھیں۔ اُن کی بہنیں عمر میں اُن سے بہت بڑی تھیں۔ سب سے بڑی بہن اُن سے عمر میں 14 سال بڑی تھیں جبکہ اُن سے چھوٹی 13 سال بڑی تھیں۔ اُن کی دونوں بہنوں کی شادیاں چھوٹی عمر میں ہو چکی تھیں اور اُن کے بچوں کی عمریں بھی نصرت کی عمر کے قریب قریب تھیں۔ انہوں نے ممبئی میں تعلیم حاصل کی اور سینئر کیمبرج کا امتحان وہاں کے Jesus & Mary Convent سے پاس کیا۔

1947ء کے آغاز میں کہ جب ممبئی کے مسلمان نسبتاً غیر محفوظ تھے، نصرت کے والدین نے کراچی منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ ابتداء میں یہ گھرانہ ''پیلس ہوٹل'' میں ٹھہرا۔ (جواب شیراٹن کہلاتا ہے) جو کہ شہر کے بہترین ہوٹلوں میں سے تھا۔ تاہم ایک قریبی عزیز کے اصرار پر وہ بھٹو کے گھر منتقل ہو گئے۔ چند ہی ماہ میں اس گھرانے نے 23 کلفٹن کے مقام پر ایک جگہ خرید لی جو کہ وسطی کراچی سے ساحل سمندر تک رسائی کا عام راستہ تھا۔ اُن کے والد نے کراچی میں ایک کارخانہ قائم کیا اور اس تیزی سے پھیلتے ہوئے شہر میں اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد نصرت اصفہانی نے ایک رضا کار تنظیم ''پاکستان وومن نیشنل گارڈ'' میں شمولیت اختیار کی۔ وہ فوجی پریڈ میں ماہر تھیں اور جلد ہی انہوں نے ٹرک اور ایمبولینس گاڑی چلانا سیکھ لیا تھا لہٰذا انہیں جلد ہی کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ نصرت بھٹو کہتی ہیں۔

''دونوں خاندان ایک مرتبہ پھر ذوالفقار علی بھٹو کی ہمشیرہ بیگم منور اسلام کی شادی پر ملے۔ ''اُن کی بہن 'منا' میری اچھی دوست تھی اور جب اُس کی شادی ہو رہی تھی تو میں نے ذوالفقار علی بھٹو کو دیکھا۔ وہ اب کافی بڑے ہو چکے تھے اور پہلی مرتبہ میں پہچان نہ سکی کہ وہ کون تھے لیکن اُن کی والدہ بھی وہاں موجود تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ میں 'منا' کی دوست ہوں۔ اوہ! نصرت یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے امریکہ سے آیا ہے۔ اس کا نام زلفی ہے۔''

ذوالفقار علی بھٹو اور نصرت اصفہانی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بھٹو نے اپنے ایک شادی شدہ دوست کی بیوی کے ذریعے نصرت اصفہانی کو کراچی کے اعلیٰ ریسٹورنٹ میں کھانے کی دعوت دی اور وہاں پر اُنہوں نے نصرت اصفہانی کو شادی کا پیغام دیا۔ تاہم نصرت اصفہانی نے اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ایک دو ہفتوں میں بھٹو کو اپنی تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے واپس امریکہ جانا۔ ہے تاہم بھٹو اپنے پیغام کو نہ بھلا سکے اور نہ ہی یہ خیال چھوڑ سکے۔ دوری اور وقت نے اُن کے اس ارادے کو مزید تقویت پہنچائی کہ وہ نصرت اصفہانی سے شادی کریں۔

جلد ہی ذوالفقار علی بھٹو برکلے واپس لوٹ گئے جہاں انہوں نے طلبا سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور سٹوڈنٹ کونسل کی عمومی نمائندگی کی نشست کا انتخاب لڑا۔ وہ اس انتخاب کے ساتھ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اُمیدواروں میں واحد غیر امریکی تھے۔ انہوں نے یہ انتخاب اکثریت سے جیتا۔ 1950ء میں وہ آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کالج میں حصول تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ وہ وہاں قانون و انصاف کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے جس کے لیے عام طور پر یونیورسٹی میں تین سال زیر تعلیم رہنا ہوتا تھا۔ وہ اسے دو سال میں مکمل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے کونسلر نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا وہ لاطینی زبان جانتے ہیں۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو کونسلر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ معمول کے تین سال کے دورانیے میں اپنا کورس مکمل کریں کیونکہ لاطینی زبان ایک لازمی مضمون تھا اور یہ کہ اگر وہ رومن قانون کے مضمون میں فیل ہو گئے تو وہ مجموعی طور پر فیل ہی تصور کیے جائیں گے۔

جب وہ کونسلر کے کمرے سے باہر جا رہے تھے تو کونسلر نے انہیں بتایا ''کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اپنے ذہین طلبا بھی اسے دو سال میں مکمل نہیں کر سکتے۔'' بھٹو پلٹے اور جواب دیا کہ وہ اسے دو سال میں ہی مکمل کریں گے۔ ''کیونکہ اس نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ مجھے اسے یہ دکھانا تھا کہ میں بھی، اگر بہت نہیں، تو کم از کم برطانوی لڑکوں جیسا ہی ذہین ہوں،'' ذوالفقار علی بھٹو اپنی یادداشتوں میں بتاتے ہیں۔ آکسفورڈ کا پروفیسر اُن سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اُن کا پرستار اور عمر بھر کا دوست بن گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو 1951ء کی بہار کے سیمسٹر کے بعد کراچی لوٹے۔ انہوں نے اپنے والدین کو نصرت اصفہانی سے اپنی شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ تمام معاملات خوش اُسلوبی سے طے پا گئے اور جلد ہی وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ 8 ستمبر 1951ء کو کراچی میں اُن کی شادی انجام پائی۔ بعد کے ایام روایتی ظہرانوں اور عشائیوں کی بھرمار میں گزرے۔ ایک ہفتے بعد نوبیاہتا جوڑا کراچی سے لندن روانہ ہوا۔ وہ ''ڈورچیسٹر ہوٹل'' کے ایک سوٹ میں قیام پذیر ہوئے جہاں سے ہائیڈ پارک دکھائی دیتا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ وہاں گزارنے کے بعد (دونوں) میاں بیوی موسم خزاں کے سیمسٹر کے لیے آکسفورڈ پہنچ گئے۔

چونکہ یونیورسٹی میں اُن کا یہ پہلا سال تھا۔ لہٰذا انہیں قواعد کے مطابق کیمپس سے باہر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے اُن کی بیوی ہوٹل میں ٹھہری اور وہ اپنے ہوسٹل میں قیام پذیر ہوئے۔ وہ دن اکٹھے گزارتے اور رات گیارہ بجے کے بعد حاضری لگنے سے پہلے واپس ہاسٹل پہنچ جاتے۔ ایک مرتبہ وہ ہاسٹل واپس نہیں پہنچے اور اگلے روز ڈین نے اُن سے وضاحت طلب کر لی۔ جس پر انہوں نے اسے آگاہ کیا کہ وہ رات اپنی بیوی کے ہمراہ ہوٹل میں تھے۔ ڈین کو یہ جان کر انتہائی حیرانی ہوئی کہ یہ 24 سالہ ایشیائی نوجوان ایک شادی شدہ شخص تھا۔ تاہم بعد ازاں اس نے دونوں کو اکٹھے رہنے کی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اجازت دے دی۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد گھر سے خطوط نے نصرت بھٹو کو مجبور کر دیا کہ وہ واپس پاکستان چلی آئیں کیونکہ اُن کے والد اور اُن کی بہنیں اُن کے لیے بہت اُداس رہتے تھے۔ اُن کے سسرالی بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ کراچی میں رہیں تاکہ اُن کے شوہر اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دے سکیں۔ نومبر کے اختتام تک وہ لندن سے کراچی اپنے سسرالیوں کے ساتھ رہنے کے لیے واپس اس گھر میں آئیں جس کا نام ''بے نظیر'' ذوالفقار علی بھٹو کی پندرہ سال کی عمر میں وفات پا جانے والی بہن کے نام پر رکھا گیا تھا۔

نوبیاہتا جوڑے کے لیے ایک دوسرے سے دور رہنا بڑا مشکل تجربہ تھا۔ وہ باقاعدگی سے فون پر گفتگو کرتے اور ایک دوسرے کو خط لکھتے۔ آخرکار بیگم نصرت بھٹو 1952ء کے وسط میں دوبارہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے لندن چلی گئیں جنہوں نے اس وقت تک کرائسٹ چرچ میں لازمی رہائش کا عرصہ گزار لیا تھا اور انہیں لندن منتقل ہونے کی اجازت مل چکی تھی۔ وہ ''چیشورتھ کورٹ کنزنگٹن'' کی چھٹی منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں ایک ماہ کے لیے رہائش پذیر ہوئے جس دوران بھٹو کو روزانہ لندن سے آکسفورڈ کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔

لندن میں ایک ماہ گزارنے کے بعد دونوں آکسفورڈ چلے گئے جہاں وہ دو مہینے رہے۔ وہیں پہ ایک ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی کہ بیگم نصرت، ماں بننے والی تھیں۔ ''زلفی بہت پُرجوش تھے،'' وہ اپنی یادداشتوں سے بتاتی ہیں۔ ''وہ گلیوں میں مجھے اُٹھائے ناچتے پھرے اور جس اجنبی سے بھی وہ ملے ذوالفقار بے ساختہ بتاتے، آپ جانتے ہیں میں باپ بننے والا ہوں۔ میری بیوی ایک بچے کو جنم دینے جا رہی ہیں۔'' برطانیہ میں تین ماہ قیام کے بعد اپنے شوہر کو تعلیم مکمل کرنے کے لیے برطانیہ چھوڑ کر وہ اپنے پہلے بچے کو جنم دینے پاکستان واپس چلی آئیں۔ یہاں وہ اپنے سسرالیوں کے ہمراہ اپنے گھر ''بے نظیر'' میں قیام پذیر ہوئیں۔ پورے گھرانے نے جون کا انتظار کیا کہ جب ڈاکٹروں نے اس دنیا میں بے نظیر بھٹو کی آمد کی تشخیص کی تھی۔

بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر بھٹو کی سیاسی سرگرمیوں میں پوری دل چسپی لی۔ انہوں نے پی پی پی کے شعبہ خواتین کی چیئرپرسن کی حیثیت میں ملک بھر میں خواتین کو منظم کیا۔ جنرل ایوب کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو شہید کیا تو بیگم نصرت بھٹو نے پی پی پی کی قیادت سنبھالی اور ضیاء الحق کی آمریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بیگم نصرت بھٹو کا نام پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نصرت بھٹو جو پاکستان کی خاتون اول رہی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کے بعد انہوں نے جتنی مشکلات اور مصائب دیکھے شاید ہی دنیا کے کسی سیاسی لیڈر نے اتنی مشکلات جھیلی ہوں۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے بعد انہوں نے پارٹی کو متحد رکھا اور پہلے سے زیادہ مضبوط بنایا۔ بھٹو کے جیل کے ایام میں اُن کا زیادہ تر وقت جیل میں بھٹو سے ملاقاتوں اور قانونی ماہرین کے ساتھ گزرا۔ انہوں نے طویل عرصہ تک بے نظیر بھٹو کے ساتھ اسیری کے ایام بھی گزارے۔ نصرت بھٹو نے اپنے خاوند کی پھانسی کے بعد کچھ عرصہ جلاوطنی میں گزارا۔ اس عرصہ میں اُن کے جواں سال بیٹے شاہ نواز بھٹو کی پُراسرار ہلاکت نے انہیں توڑ پھوڑ دیا۔ بے نظیر بھٹو اقتدار میں آئیں تو اُن کی سیاسی معاملات میں مکمل رہنمائی کرتی رہیں۔ نصرت بھٹو کا اس سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ اُن کا جوان بیٹا مرتضیٰ بھٹو بھی پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ دو جوان بیٹوں اور خاوند کی موت نے انہیں جسمانی اور ذہنی طور پر مکمل تباہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کافی عرصہ سے ایسی حالت میں ہیں کہ وہ نہ کسی کو پہچان سکتی ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات کا علم ہوسکتا ہے کہ انہیں کیا کہا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں اُن پر ایک قیامت اور ٹوٹ گئی کہ اُن کی ہونہار بیٹی دو مرتبہ ملک کی وزیراعظم رہنے والی بے نظیر بھٹو کی زندگی کا چراغ سفاک قاتلوں نے گل کر دیا۔ جب بے نظیر بھٹو وزیراعظم بنی تو انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بے نظیر بھٹو کے بچپن اور سیاست کے بارے میں بتایا کہ ''ہم دونوں کو احساس تھا کہ وہ ضرور کچھ کرے گی، کوئی بڑا کام جس سے اس کا نام بڑا ہو مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا بنے گی اور کیا کرے گی، بعد میں وہ جب کالج اور پھر یونیورسٹی گئی اور سیاست میں دل چسپی لینے لگی تو ہمیں احساس ہوا کہ اس میں لیڈر بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ جب وہ وزیراعظم بنی اور جس روز حلف اُٹھا رہی تھیں تو میں بہت ہی جذباتی ہوگئی تھی اور میری آنکھوں میں آنسو تھے اس لیے کہ میں نے سوچا کاش آج بھٹو زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ اُن کی لاڈلی بیٹی کس مقام پر پہنچ چکی ہے۔ شہید بھٹو کی عدم موجودگی کا دُکھ بھی تھا اور اپنی بچی کے وزیراعظم بننے کی خوشی بھی۔ مجھے وہ آٹھ ماہ کی بچی یاد آئی اس کا معصوم چہرہ یاد آیا۔ مجھے یوں لگا وہ میری بانہوں میں ہے، میری گود میں ہے۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ وہ چھوٹی بچی اتنا آگے بڑھی کہ ملک کی وزیراعظم بن گئی ہے۔ بے نظیر میری پہلی بچی تھی جس طرح ماں کو اپنے پہلے بچے سے بہت پیار ہوتا ہے مجھے بھی اس سے بہت پیار تھا۔ پہلا بچہ ایک معجزہ ہوتا ہے میری نظر میں وہ ایک معجزہ تھی۔ بہت سمجھ دار، بہت خوبصورت اور ذہین۔ جب وہ آٹھ ماہ کی تھی تو کھڑی ہونے اور دیوار پکڑ کر چلنے کی کوشش کرنے لگی، دس ماہ میں اس نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ بے نظیر کی پہلی سالگرہ پر ہم کوئٹہ میں تھے۔ یہ میری نند کا گھر تھا۔ ملازم صبح کی چائے لاتا تھا اور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

دروازے پر اندر آنے کی اجازت چاہتا تھا۔ جس روز بے نظیر ایک سال کی ہوئی ملازم چائے لے کر آیا تو مجھ سے پہلے اس نے کہا 'اندر آجاؤ.....' اتنی گوری اور گلابی رنگت کی وجہ سے اس کی بڑی آنٹی نے اسے پنکی کے نام سے پکارنا شروع کیا، بے نظیر نام بھٹو صاحب کی والدہ نے رکھا تھا۔ بھٹو صاحب کی ایک بہن انڈیا میں بورڈنگ سکول میں تھی، تیرہ چودہ برس کی عمر میں گردن توڑ بخار کی وجہ سے اُس کا انتقال ہوگیا اُس کا نام بے نظیر تھا۔ جب بے نظیر پیدا ہوئیں تو میری ساس نے خواہش ظاہر کی کہ بچی کا نام بے نظیر رکھا جائے۔''

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

محترمہ بے نظیر بھٹو کی آخری کتاب

قیوم نظامی

محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی شہادت سے چند روز قبل اپنی آخری کتاب مکمل کی جس کا نام "Reconciliation Islam, Democracy and The West" ''مفاہمت اسلام، جمہوریت اور مغرب'' رکھا۔ محترمہ نے اس کتاب میں اپنی وطن واپسی کی روداد بیان کی ہے اور اسلامی انتہا پسندی کے خاتمے نیز اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق برداشت، رواداری اور انصاف پر مبنی کلچر پیدا کرنے کے لیے رہنما اصول متعین کئے ہیں۔ محترمہ نے تحریر کیا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ انتہا پسندی کے پھیلاؤ کے ذمے دار ہیں کیونکہ وہ ایسے گروپوں کی سرپرستی کرتے ہیں جو اپنے سیاسی مفادات کے لیے شارٹ ٹرم پالیسی پر گامزن ہیں اور لانگ ٹرم حل کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتے۔

محترمہ نے اسلام اور مغرب دونوں کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں ایک ایسا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو مفاہمت اور جمہوریت سے ہی نکالا جا سکتا ہے۔ اپنی کتاب میں انہوں نے مغرب اور مڈل ایسٹ کی تاریخ تجزیاتی انداز میں رقم کی ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی دہشت گردی کی بنیادوں کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے محترمہ نے تحریر کیا ہے کہ امریکہ نے جنرل ضیاء الحق کو سپورٹ کیا جس نے سیاسی جماعتوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور جمہوریت کو تباہ کیا۔

محترمہ اپنی کتاب میں عالم اسلام اور مغرب دونوں سے مخاطب ہوئی ہیں جو ماضی اور مستقبل کے چوراہے پر کھڑے ہیں۔ عالم اسلام اور مغرب تعلیم اور جہالت، امن اور دہشت گردی، آمریت اور جمہوریت کے درمیان کھڑے ہیں۔ محترمہ نے اسلام کا لبرل امیج پیش کیا ہے۔ محترمہ اپنی وطن واپسی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''جب میں نے قائداعظم انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر قدم رکھا تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سکی۔ میں عام طور پر اپنے اندرونی جذبات عیاں نہیں ہونے دیتی کیونکہ سیاست میں جذباتی ہونا کمزوری کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب میں نے آٹھ سالہ اذیت ناک جلاوطنی کے بعد اپنی سرزمین پر قدم رکھا تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور میں نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ پہاڑ میرے سر سے اُتر چکا ہے اور میں اب آزاد ہوں۔ آخر کار میں اپنے گھر واپس آ چکی تھی۔ میں نے اپنے شوہر آصف زرداری کے ساتھ تبادلہ خیال کر کے وطن واپسی کا مشکل فیصلہ کیا تھا۔ آصف اور میں اپنی ذاتی خوشیاں قربان کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ میں نے پاکستان کے عوام کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ میں نے دبئی میں صحافیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"This is a begining of a long journey for pakistan back to democracy and I hope my going back is a catalyst for change. We believe that miracle can happen".

ترجمہ: ''یہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے طویل سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری وطن واپسی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ معجزے برپا ہو سکتے ہیں۔''

پاکستان کو بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ پاکستان عالمی دہشت گرد تحریک کا مرکز بن چکا ہے۔ دہشت گردوں کا ایک مقصد یہ ہے کہ مغرب اور اسلام کے درمیان تصادم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور اسلام کا ایسا تصور پیش کیا جائے جو لبرل ازم اور جمہوریت کے خلاف ہو۔ دہشت گردوں کی منزل یہ ہے کہ مغرب کی اقدار اور انتہا پسندوں کے فہم کے مطابق اسلامی اقدار کے درمیان کشمکش پیدا کی جائے۔ عالم اسلام میں اندرونی اختلافات اور تضادات موجود ہیں جو فقہی اور فکری بنیادوں پر ہیں۔ اسلام کی تشریح کے بارے میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں جو اکثر اوقات تصادم اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان اختلافات نے بھائی کو بھائی سے لڑا دیا ہے۔

ایک ارب مسلمان امریکہ کی عراق جنگ کے سخت خلاف ہیں جو امریکہ نے اقوام متحدہ کی منظوری کے بغیر شروع کی۔ عالم اسلام کے مسلمانوں نے عراق میں مسلمانوں کے قتل کی مذمت کی۔ ہم کراچی ائیر پورٹ سے شاہراہ فیصل پہنچے تو تاحد نظر عوام کا سمندر تھا۔ جانثاران بے نظیر نے ہمارے ٹرک کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق تیس لاکھ افراد نے استقبال میں شرکت کی۔ ان میں عورتوں اور بچوں کی کثیر تعداد بھی موجود تھی۔ عوام کی شرکت اس حقیقت کا مظہر تھی کہ وہ آمریت کی بجائے جمہوریت کے حامی ہیں۔ عوام خوشی سے ڈانس کر رہے تھے اور ٹرک پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ جمہوری کارواں مزار قائداعظم کی جانب رواں دواں تھا۔ ہر

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جانب پارٹی پرچم لہرا رہے تھے میں بڑی خوش تھی اور کراچی استقبال کا ماضی کے استقبالوں سے موازنہ کر رہی تھیں۔ جنرل مشرف میری وطن واپسی پر راضی نہ تھا۔ اس نے میرے ساتھ نجی ملاقاتوں میں مجھے مشورہ دیا کہ میں انتخابات کے بعد وطن واپس آؤں۔ حکومت چاہتی تھی کہ میں کراچی ائیر پورٹ سے ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر مزار قائد جاؤں۔ مشرف نے کہا کہ اسے میری زندگی کے بارے میں تشویش ہے۔ جنرل مشرف نے مجھے پیغامات روانہ کئے تھے کہ قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے خودکش حملہ آور مجھے نشانہ بنا سکتے ہیں۔ دوست مسلم ملک نے مجھے نامزد قاتلوں کے ناموں اور موبائل فون نمبروں سے مطلع کر دیا تھا۔ مشرف حکومت کو بھی ان قاتلوں کے ناموں کا علم تھا جنہوں نے میرے قتل کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ مشرف کے قریبی حلقے میں ایسے لوگ موجود تھے جو سازش میں شریک تھے۔ میں نے پاکستان واپسی سے پہلے جنرل مشرف کو شہادتیں مہیا کیں مگر ان پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مجھے اپنی واپسی مؤخر کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا مگر میں اپنے عوام سے بے وفائی نہیں کر سکتی تھی جو کئی ہفتوں سے میرے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جب ہمارا کارواں کارساز کے قریب پہنچا تو سٹریٹ لائٹس بجھنا شروع ہوگئیں اور سڑک پر اندھیرا ہوگیا۔ یہ ایک حیران کن اور پراسرار کارروائی تھی۔ ہمیں شک تھا کہ ہم پر ریموٹ کنٹرول بم سے حملہ کیا جائے گا اور گولیوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمیں کار بم کی ہرگز توقع نہ تھی۔

رات آدھی گزر چکی تھی میں امریکہ میں پاکستان کی سابق سفیر عابدہ حسین کے ساتھ ٹرک کے اندر محفوظ کمرے میں چلی گئی۔ ٹرک پر کھڑے ہونے سے میرے پاؤں سوجھ گئے تھے۔ میری جوتی پاؤں میں تکلیف پیدا کر رہی تھی۔ جب ہم کارساز کے مقام پر پہنچے تو عوامی ہجوم میں اضافہ ہو چکا تھا ہم سوچ رہے تھے کہ 18 اکتوبر کی رات کو پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ میں نے ناہید خان کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تقریر پر نظر ثانی کی۔ یہ ایک تاریخی تقریر تھی جو مجھے قائد کے مزار پر کرنا تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنی تقریر میں سپریم کورٹ میں دائر کی جانے والی اس پٹیشن کا ذکر بھی کرنا چاہیے جس میں ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ سیاسی حلقوں کو قبائلی علاقوں میں کام کرنے کا موقع دیا جائے تا کہ دہشت گردی کو سیاسی اور جمہوری سرگرمیوں سے ختم کیا جا سکے۔ میں نے دہشت گردی کے الفاظ ادا ہی کئے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہمارا ٹرک لرز گیا اور وحشت ناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے دھماکے کے بعد دوسرا دھماکہ ہوا جو پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ ہمارا ٹرک آگے پیچھے لڑھکنے لگا۔ جس جانب میں بیٹھی تھی اس جانب ٹرک میں دو بڑے ڈینٹ پڑ چکے تھے۔ حالانکہ یہ ٹرک بڑا مضبوط اور بم پروف تھا جو خصوصی طور پر تیار کروایا گیا تھا۔ ایک قیامت کا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سماں تھا میرے سینکڑوں جیالے جانثار شہید ہو چکے تھے۔ یہ میری زندگی کا انتہائی المناک اور ہیبت ناک منظر تھا۔ ٹرک کے چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سینکڑوں زخمی چیخ و پکار کر رہے تھے۔ سڑک خون سے بھر گئی تھی۔ جانثاروں کی وجہ سے میری اور پارٹی کے مرکزی رہنماؤں کی جانیں بچ گئی تھیں۔ اس سانحہ میں 179 غریب کارکن شہید ہوگئے۔ سانحہ کے آٹھ منٹ کے بعد ہم ٹرک سے باہر نکلے۔ جنرل سلیم حیات نے جو جمہوری کارواں کے چیف سیکورٹی آفیسر تھے، نے اپنی کار میرے لیے بھیجی اور میں بلاول ہاؤس پہنچ گئی۔ میں نے اپنے شوہر اور بچوں سے فون پر بات کی اور انہیں یقین دلایا کہ میں خیریت سے ہوں اور مجھے کوئی زخم نہیں آیا۔

حکومت نے اعلان کیا کہ خودکش حملہ آور نے ہمارے ٹرک کو نشانہ بنایا۔ یہ القاعدہ اور طالبان طرز کا دھماکہ تھا میرے ذہن میں کوئی شک نہ تھا کہ القاعدہ اور طالبان اس حملے میں ملوث تھی مگر ٹرک میں جس نوعیت کے ڈینٹ پڑے فضا میں جس قسم کی گیس موجود تھی۔ اور حقیقت جو رپورٹ نہ ہوئی کہ ہمارے ٹرک کو فاصلے سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ایسی شہادتیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حملہ گہری منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ پاکستان میں سامنے نظر آنے والا منظر حقیقی نہیں ہوتا۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ لائنیں سیدھی اور واضح ہوں۔ اکثر اوقات ایک دائرے کے اندر کئی دائرے ہوتے ہیں۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے 1980ء میں طالبان کو تخلیق کیا تھا۔ ایجنسیوں میں ایسے عناصر موجود ہیں جو القاعدہ کے نظریاتی اور مذہبی بنیادوں پر حامی ہیں۔ کچھ لوگ تو القاعدہ کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور اس کے لیے افرادی قوت مہیا کرتے رہے ہیں۔ میں نے ان کو شناخت کر لیا تھا اور پاکستان واپسی سے قبل جنرل مشرف کو خفیہ خط لکھ کر مطلع بھی کر دیا تھا۔ حکومت نے ابتداء میں ایسے شخص کو تفتیش کے لیے نامزد کر دیا جس نے 1999ء میں میرے شوہر پر سخت تشدد کیا تھا اور ان کی جان بڑی مشکل سے بچ سکی تھی۔ مسلم لیگ (ق) کے رہنماؤں نے شرمناک بیان دیا کہ پی پی پی نے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے خودکش حملہ خود کروایا تھا۔

دہشت گردی آمریت سے ختم نہیں کی جا سکتی۔ جمہوری دنیا کو اخلاقی بنیادوں پر اپنے اپنے مفادات کے لیے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمان ملکوں میں جمہوریت کو مستحکم کیا جائے۔ مغرب نے تین صدیوں سے مسلمان ملکوں میں جمہوریت کو پروان نہیں چڑھنے دیا اور جمہوری ادارے مستحکم نہیں ہونے دیئے۔ میں دلائل سے ثابت کر سکتی ہوں کہ جمہوری طرز حکومت اسلامی اقدار کے مطابق ہے اور جمہوریت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ جمہوریت اسلام کا اٹوٹ انگ ہے جو لوگ اسلام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور دہشت گردی کے لیے اسلامی جواز پیش کرتے ہیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

انہیں مسترد کرتی ہوں۔ ان کے تشدد پر مبنی اقدامات اسلام کے منافی اور غیر اخلاقی ہیں۔ اگر ہم نے منطق اور استدلال کی بنیاد پر اپنے اندرونی مذہبی اختلافات کو ختم نہ کیا تو اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کا خطرہ موجود ہے اسی خطرے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے حقیقی تصور اور فلسفے پر متفق ہو جائیں اور مفاہمت و برداشت کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے مذہبی اختلافات ختم کر دیں۔

اسلام برداشت پر زور دیتا ہے۔ اسلام نہ صرف دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کو برداشت کرنے کا سبق سکھاتا ہے بلکہ مسلمانوں کے اندرونی اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا پیغام دیتا ہے۔ اللہ قرآن میں بار بار بیان کرتا ہے کہ اس نے کائنات میں مختلف رائے اور پس منظر رکھنے والے لوگ پیدا کیے۔ کائنات کی نیرنگی اور مختلف صورتیں ایک اچھی چیز ہے جن سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ خدا کی حکمت اور دین فطرت کے عین مطابق ہے۔ قرآن عورتوں کی سماج میں مکمل شرکت کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام علم سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیتا ہے۔ اسلام تشدد، انتہا پسندی، عدم برداشت اور خودکش حملوں کے خلاف ہے۔ اسلام مشاورت (جمہوریت) شوریٰ (پارلیمنٹ) اور احتساب پر مبنی سیاسی نظام کا داعی ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اس ابدی پیغام کا تحفظ کریں نیز انتہا پسندی اور آمریت دونوں کا مقابلہ کریں تا کہ خدا کے پیغام کے مطابق امن، انصاف اور مساوات پر مبنی نظام قائم کیا جا سکے۔

نظام ایسا ہونا چاہیے جس میں حکمران، دنیا میں عوام کو جواب دہ ہوں اور قیامت کے دن خدا کو جواب دہ ہوں۔ جواب دہی کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ مخلوق خدا جمہوری نظام کے ذریعے جمہور کو جواب دہ ہو۔ دوسری یہ ہے کہ ہم دنیا سے رخصت ہوں تو خدا کو جواب دہ ہوں۔ انتہا پسند اور شدت پسند جو اسلام کو ہائی جیک کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی ناکامی کی صورت میں ہی اسلام اور مغرب کے درمیان مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے۔

عملی اقدامات کے نتائج بھی نکلتے ہیں۔ مغرب نے پچھلی صدی میں مسلم دنیا میں جمہوری اداروں کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو اقدامات اٹھائے ان کا تعلق مسلمانوں کے تعصب اور مغرب کے ارادوں سے جڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں نے مغرب کے خلاف منافقت کے الزامات لگائے۔ یہی جذبات آج بھی مسلم دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اگر امریکہ اور مغرب نے 1953ء میں ایران میں مصدق کی منتخب جمہوری حکومت کو عدم استحکام کا شکار نہ کیا ہوتا تو آج کی دنیا مختلف ہوتی۔ آج حالات مختلف ہوتے۔ اگر برطانیہ نے عراق کو جمہوری ملک بنانے کی کوشش کی ہوتی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کا موقع دیا جاتا اور انتخابات کے ذریعے ایسی حکومت کا قیام عمل میں آتا جس کے نتیجے میں اکثریت کو حکومت کرنے کا موقع ملتا۔ اقلیت کے حقوق محفوظ ہوتے اور عوام کو گڈ گورننس ملتی۔ آج دنیا بالکل مختلف ہوتی اگر برطانیہ اور خاص طور پر امریکہ نے افغانستان کو روس کے خلاف ایک تیز دھار آلے کے طور پر استعمال نہ کیا ہوتا تو افغانستان سینٹرل ایشیا، مڈل ایسٹ اور بلاشبہ دنیا کی صورت حال مختلف ہوتی۔ اگر سی آئی اے نے پاکستان کی آئی ایس آئی سے ساز باز کر کے انتہا پسندوں، جنونیوں اور مغرب کے مخالف مجاہدین کو تربیت دے کر طاقتور نہ بنایا ہوتا اور ان قوتوں سے تعاون نہ کیا ہوتا جو روس کے خلاف تھے مگر جمہوریت، مشاورت اور احتساب میں یقین رکھنے والے نہیں تھے۔ آج دنیا یقینی طور پر مختلف ہوتی اگر امریکہ نے 1989ء میں روسی افواج کی واپسی کے بعد افغانستان کو تنہا نہ چھوڑا ہوتا اور افغانستان کی تعمیر نو میں دلچسپی لی ہوتی، افغان عوام کو تعلیم، صحت اور سڑکوں کی سہولتیں فراہم کی ہوتیں۔

دوسری عالمی جنگ میں آمروں کی شکست کے بعد امریکہ نے آزادی سے غیر معمولی وابستگی کا اظہار کیا اور انسانیت کا زمینی حقائق اور عملیت کے تصور کے مطابق تجزیہ کیا۔ وہ ملک جس نے خون اور انسانی جانوں کی قربانی دی تھی اس نے عالمی ذمہ داری پوری کرنے سے گریز کیا۔ امریکہ اپنے آپ کو اندرونی معاملات تک محدود کر سکتا تھا مگر اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ 1945ء میں جو گیلپ سروے ہوا اس کے مطابق 15 فیصد امریکی شہریوں کی رائے تھی کہ امریکہ یورپ سے تعاون جاری رکھے مگر اس وقت کے عظیم امریکی صدر نے جو عظیم وژن کا حامل تھا فیصلہ کیا کہ دنیا کے ممالک کی معیشت کو مضبوط اور مستحکم بنایا جائے۔ صدر ٹرومین نے یونان، اٹلی اور فرانس کی تعمیر نو کے لیے اربوں ڈالر کی امداد فراہم کی۔ آج کی دنیا مختلف ہوتی اگر برطانیہ نے بھی مسلم ممالک کی جمہوریتوں اور معیشتوں کو مستحکم بنایا ہوتا اور ان کا استحصال نہ کیا ہوتا۔ جو سماج معاشی طور پر مستحکم ہوتے ہیں اور جس سماج کے جوانوں کو ایک بہتر مستقبل کی امید ہوتی ہے وہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے لیے آلہ کار نہیں بنتے۔ بھوک انتہا پسندی پیدا کرتی ہے۔ نا اُمیدی انتہا پسندی کو فروغ دیتی ہے۔ مواقع جمہوریت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ ہم تاریخ سے سبق سیکھ کر انتہا پسندی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں انتخابات کو شفاف بنانے کے لیے میں نے 4 دسمبر 2007ء کو اسلام آباد میں اپنی رہائش گاہ پر مسلم لیگ کے رہنما میاں نواز شریف سے ملاقات کی۔ میں نے ان کو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اگر اپوزیشن کی سب جماعتیں انتخابات میں حصہ لیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تو دھاندلی مشکل ہوگی۔ کبھی کبھی میں اس تشویش میں مبتلا ہو جاتی ہوں کہ کیا ہم ایک قوم کی حیثیت میں انتشار اور ٹوٹ پھوٹ سے بچ سکتے ہیں۔ میری حکومت کے خاتمے کے بعد تشدد پسند اپنے حکومتی حامیوں کے ذریعے مختلف شعبوں میں اثر و رسوخ قائم کر چکے تھے۔ پاکستان ماچس کی ڈبیہ بن چکا ہے جو کسی وقت آگ پکڑ سکتی ہے۔ پاکستان میرا اور میرے بچوں کا گھر ہے۔ پاکستان ان تمام بچوں کا گھر ہے جن کے لیے بے شمار قربانیاں دی جا چکی ہیں۔ اگرچہ ہمارا جمہوری ریکارڈ افسوس ناک رہا ہے مگر علامہ اقبال نے درست کہا تھا کہ ''مطلق العنانیت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی''۔

ٹیکنالوجی اور مواصلات نے ہماری دنیا کو تبدیل کر دیا ہے اور گلوبل کلچر متاثر ہو رہا ہے۔ جتنا ہم دنیا کے لوگوں کو جانیں گے اتنا ہی ہم ان کے قریب ہوں گے۔ انٹرنیٹ نے ترقی پذیر اقوام کو موقع فراہم کر دیا کہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر اقوام عالم کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ مختلف قوموں کے درمیان تجارتی تعلقات قائم کر کے ہم مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مفاہمت پیدا کر سکتے ہیں اور تہذیبوں کے تصادم سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ مختلف ملک آپس میں جس قدر تجارت کریں گے اس قدر ان میں تعاون اور یگانگت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ میں نے دسمبر 1988ء میں سارک کانفرنس کو کلچرل ایسوسی ایشن سے اکنامک ایسوسی ایشن میں تبدیل کرنے کا آئیڈیا پیش کیا۔ سارک حکمران نے میرے آئیڈیا سے اتفاق کیا۔ میں نے 1998ء میں اپوزیشن لیڈر کی حیثیت میں پارلیمنٹ کے اندر جنوبی ایشیا کو فری ٹریڈ زون بنانے کی تجویز پیش کی۔ میری تجویز یورپین کامن مارکیٹ کے تجربے پر مبنی تھی۔ بھارت اور پاکستان ایٹمی قوتیں ہیں جو تجارتی، ثقافتی، تعلیمی روابط کے ذریعے اپنے مستقبل کو محفوظ بنا سکتے ہیں۔ جمہوریت اور تجارت امن کو فروغ دیتی ہیں۔

تہذیبوں کے درمیان تصادم کو روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ عالم اسلام تجارت، ٹیکنالوجی، وفود کے تبادلے، تعلیم، جمہوریت اور برداشت پر زور دے۔ اسی طرح ہم مغرب سے اعتماد اور مفاہمت کے رشتے قائم کر سکتے ہیں۔ ہمیں دوسرے ممالک کی تہذیبوں سے ٹکراؤ کی بجائے انہیں برداشت کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کی اصل جنگ مغرب سے نہیں ہے بلکہ عالم اسلام کے اندر مختلف فرقوں کے درمیان تصادم پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام کی مختلف تشریحات اور امت کے وژن پر مباحثے جاری ہیں۔ مسلمانوں کے کچھ فرقے دوسرے مسلمان فرقوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ برداشت ہی ایک ایسا عامل ہے جو انتہا پسندی اور ماڈریشن کے درمیان فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے۔ برداشت کے جذبے سے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہی آمریت اور جمہوریت کا تنازعہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں کسی تاخیر کے بغیر غربت کی زنجیریں توڑنا ہوں گی۔ ہمیں انتہا پسندی، آمریت اور دہشت گردی کو خیر باد کہتے ہوئے حقیقی مفاہمت کی جانب لوٹنا ہوگا۔

مسلمان ممالک اپنے دائرے میں محدود رہ کر غربت، جہالت، تشدد، آمریت کا شکار ہو چکے ہیں۔ قدامت پسندی اور رجعت پرستی کی بنا پر اسلام اور مغرب تصادم کے راستے پر چل پڑے ہیں۔ یہ نئے خیالات کا دور ہے۔ یہ دیانت اور تخلیق کا وقت ہے۔ ہم نے کافی دکھ اور درد دیکھ لیے ہیں اب مفاہمت کا وقت ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آصف علی زرداری اور پی پی پی

محترمہ بےنظیر بھٹو کو پورا ادراک تھا کہ اُن کی شہادت کے بعد آصف علی زرداری کے علاوہ اور کوئی ایسی شخصیت موجود نہیں ہے جو پی پی پی کو متحد رکھ سکے۔ آصف زرداری طویل قید کاٹ کر سیاسی حلقوں میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ محترمہ نے اپنے ہاتھ سے ایک وصیت تحریر کر کے آصف زرداری کو اپنا جانشین نامزد کر دیا جسے پی پی پی کی سینٹرل ایگزیکٹیو اور فیڈرل کونسل کے ارکان نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا۔ مشاورت سے یہ فیصلہ ہوا کہ بلاول کو پارٹی کا چیئرمین نامزد کر دیا جائے۔ اور جب تک بلاول تعلیم مکمل کر کے پارٹی کی قیادت نہیں سنبھالتے اس وقت تک آصف زرداری شریک چیئرمین کی حیثیت میں فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ پاکستان کے سیاسی تجزیہ نگاروں نے عمومی طور پر آصف علی زرداری کی نامزدگی کو ایک دانشمندانہ فیصلہ قرار دیا ہے۔ البتہ بعض تجزیہ نگاروں نے اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ مخدوم امین فہیم پارٹی قیادت کے مستحق اور اہل تھے۔ پارٹی کی قیادت چونکہ پارٹی کا اندرونی مسئلہ ہوتا ہے اس لیے پارٹی کے رہنما ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ آصف زرداری 1988ء سے پاکستان کی سیاست میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ اُن کے سیاسی تجربے اور اہلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ محترمہ بےنظیر بھٹو شہید عالمی سطح کی لیڈر تھیں۔ اُن کی شہادت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنا آسان بات نہیں ہے۔ آصف زرداری کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا پورا موقع ملنا چاہئے۔

فاروق عالم انصاری، آصف علی زرداری کے بارے میں رقم طراز ہیں

''پٹارو کیڈٹ کالج اور پھر لندن سنٹر میں اقتصادیات اور سیاست کے مضمون کا طالب علم، تیراکی اور پولو کا کھلاڑی، مختلف علوم پر نہ صرف کتابیں خریدنے بلکہ اُنہیں پڑھنے کا بھی خاصا شوق رکھنے والا، خوش گفتار اور پُرکشش شخصیت کا مالک، فیاض لیکن انتہائی بہادر بھی، پُر اعتماد اتنا کہ لندن شہر کی گلیوں میں بھی بلوچی جنگلی لباس پہن کر گھومنے والا، سندھ کے معروف جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھنے والے آصف علی زرداری کا اخبارات میں ذکر محترمہ بےنظیر بھٹو سے منگنی کے حوالہ سے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شروع ہوا۔ موصوف قابل ذکر حیثیت کے مالک ہونگے۔ لیکن ہم نے کبھی پہلے اُن کا ذکر نہ سنا۔ ہاں اُن کے والد محترم حاکم علی زرداری، جو کئی مرتبہ قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے، گاہے بگاہے اخبارات میں نظر پڑتے تھے۔ کبھی کسی سیاسی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کی منگنی کی خبر شائع ہوئی۔ نقل کفر کفر نباشد، درست لیکن شائستگی کے بھی کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ من وعن خبر نقل کرنے سے رہا جسے تصدیق کا شوق ہو اُن دنوں کا اخبار خود دیکھ کر اپنا شوق پورا کر لے۔ انتہائی چھلنی شدہ الفاظ میں، بےنظیر بھٹو کا منگیتر ایک آوارہ، لاأبالی اور کھلنڈرا نوجوان بیان کیا گیا۔ لیکن شعور نظر کا سفر کتنا عجیب ہے۔ اسی آصف زرداری کو ایک عرصہ گزرنے پر اُسی اخبار کے مدیر ''روداد جنوں'' میں ''مردِ حُر'' کے خطاب سے خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئے۔''

نومبر 1996ء میں جب آصف زرداری کو گورنر ہاؤس لاہور سے گرفتار کیا گیا اس وقت وہ ''ولن'' تھا۔ افواہ اُڑی کہ اس کی گرفتاری کے وقت کروڑوں روپے برآمد ہوئے۔ وہ پہلے ہی پاکستان کی افواہ ساز فیکٹری کا نشانہ بنا ہوا تھا لہٰذا عوام نے اس افواہ پر بھی یقین کر لیا کہ ''برآمدگی'' ضرور ہوئی مگر رفتہ رفتہ افواہیں دم توڑنے لگیں اور جھوٹ پر سچ غالب آنے لگا۔ آصف زرداری کو گرفتار کرنے والوں کا خیال تھا کہ آصف اور محترمہ مصائب سے گھبرا کر سرینڈر کر دیں گے۔ آصف زرداری کو گرفتار ہوئے آٹھ سال ہونے کو ہیں، اس دوران تین حکومتیں ہوئیں اور چوتھی تبدیل ہونے کو ہے مگر آصف اور محترمہ کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔

آصف کے سیاسی مخالفین بھی برملا اس کی جرأت اور بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔ بے مثال صبر، استقامت اور بہادری کا مظاہرہ کر کے ''ولن'' ایک ہیرو بن چکا ہے۔ پاکستان کے عوام گلی گلی اُس سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ چھوٹے صوبوں میں آصف سے محبت اور حکمرانوں سے نفرت کے جذبات بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور یہ بات اہل اقتدار کے لیے بڑی تشویش کا باعث ہے۔ حکومت نے شاید اپنے سیاسی مقاصد پورے کر لئے ہیں اور اب اسے قیدی آصف زرداری کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ اگر کچھ عرصہ اور قید میں رہا تو ''کنگ'' اور کنگز پارٹی'' کے مستقبل کے منصوبے خاک میں مل سکتے ہیں۔ حکومت اب آصف زرداری سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ابھی تک درجنوں مقدمات میں سے ایک میں بھی آصف زرداری کو سزا نہیں ہوئی جب کہ وہ عمر قید کی سزا پہلے ہی بھگت چکے ہیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ آصف زرداری اُس کی شرائط کے مطابق رہا ہوں مگر آصف باعزت رہا ہونا چاہتے ہیں۔ ایس جی ایس کوٹیکنا کیس میں سوئٹزرلینڈ کے تحقیقاتی آفیسر نے محترمہ بےنظیر بھٹو اور آصف زرداری کے سمن جاری کئے۔ بین الاقوامی قوانین کے مطابق یہ سمن

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آصف زرداری کو سوئس سفارت خانے کے ذریعے موصول ہونے چاہیے تھے مگر سمن کی کاپی جس پر تفتیشی آفیسر کی مہر اور دستخط نہیں تھے۔ وزارت داخلہ کے ذریعے آصف کو پہنچائے گئے۔ سمن 23 مارچ 2004ء کو جاری کئے گئے تاریخ پیشی 22 اپریل 2004ء کو کرائی۔ الیکٹرانک میڈیا پر جو خبر نشر کرائی گئی اس میں کہا گیا کہ پاکستان کے صدر اور وزیراعظم نے آصف زرداری کو سوئٹزرلینڈ جا کر عدالت میں پیش ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ پاکستان کے عوام نے اس خبر سے یہ تاثر لیا کہ حکومت آصف زرداری کو رہا کردے گی۔ عوام پر اس خبر کا مثبت اثر ہوا اور حکومت کے فیصلہ کو سراہا گیا مگر عوام کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

حکومت کے نمائندے جب آصف زرداری کے پاس پیغام لے کر پہنچے۔ یہ راز کھلا کہ حکومت ایک قیدی کی حیثیت سے خصوصی چارٹرڈ طیارے کے ذریعے آصف کو سوئس عدالت میں پیش کرنا چاہتی ہے اور وہاں پر بھی وہ ایک قیدی کی حیثیت سے رہیں گے اور پیشی کے بعد انہیں پاکستان واپس لایا جائے گا۔ آصف زرداری نے مشروط روانگی کو مسترد کردیا تو ایک سرکاری اہلکار نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سوئٹزرلینڈ چلے جائیں اور وہاں جا کر سیاسی پناہ حاصل کرلیں۔ آصف نے اس پیش کش کو ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ کسی ''ڈیل'' کے تحت پاکستان سے باہر نہیں جائیں گے۔ بی بی سی نے اپنے ایک تبصرے میں کہا ہے کہ آصف زرداری کو سوئٹزرلینڈ بھیجنا حکومت کی سیاسی چال تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ آصف کو ایک جیل سے نکال کر سوئس جیل میں ڈال دیا جائے۔ آصف زرداری اس چال میں حکومت کو مات دینے میں کامیاب رہے۔ آصف زرداری نے احتساب عدالت میں صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ڈرامہ وزیراعظم ہاؤس میں تیار کیا گیا جس کے پروڈیوسر حکمران ڈائریکٹر نیب حکام، ڈسٹری بیوٹر وزارت اطلاعات ونشریات اور موسیقار پیٹریاٹ اراکین ہیں، صحافیوں نے جب آصف سے پوچھا کہ کیا وہ سوئٹزرلینڈ جارہے ہیں تو انہوں نے جواب میں فیض کے یہ شعر پڑھے۔

جزا و سزا سب یہیں پر ہوگی
یہیں پر عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شور محشر
یہیں پہ یوم حساب ہوگا

آصف زرداری کے وکلاء نے سوئس جج کی عدالت میں میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کردیا ہے جس میں درج ہے کہ آصف طبی بنیاد پر سفر کے قابل نہیں ہیں۔ سوئس جج نے سرٹیفکیٹ تسلیم کرلیا ہے حکومتی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ڈرامے کا ڈراپ سین ابھی نہیں ہوا۔ حکومت نے سندھ کے ڈاکٹروں سے میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا ہے۔ جس میں تحریر ہے کہ آصف کو کوئی ایسی بیماری لاحق نہیں ہے کہ وہ سفر نہ کرسکیں۔ پی پی پی کے رہنماؤں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ حکمران آصف کو زبردستی پاکستان سے باہر بھیج سکتے ہیں۔ حکومت شہباز اور آصف دونوں سے خوف زدہ ہے اور چاہتی ہے کہ شہباز پاکستان واپس نہ آئیں اور آصف پاکستان سے باہر چلے جائیں تاکہ متحدہ مسلم لیگ ایک مزید انتخاب جیت کر دو تہائی اکثریت حاصل کرلے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو سیاست کی ماہر ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ آئندہ انتخابات میں اگر وہ خود اور آصف پاکستان سے باہر ہوئے تو پی پی پی کا سیاسی مستقبل مخدوش ہوجائے گا لہٰذا اُن کی کوشش ہے کہ دونوں میں سے ایک ہرصورت پاکستان میں موجود ہونا چاہیے خواہ اُسے جیل میں ہی رہنا پڑے۔ ایک ذرائع کے مطابق پی پی پی کے کئی اراکین پارلیمنٹ نے حکومت کو یقین دلایا ہے کہ اگر آصف زرداری ملک سے باہر چلے جائیں تو وہ پی پی پیٹریاٹس یا متحدہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلیں گے۔ حکومت ابھی تک آصف کے خلاف کوئی کیس ثابت نہیں کرسکی البتہ اُس کی شدید خواہش ہے کہ محترمہ اور آصف زرداری کو سوئٹزرلینڈ کی عدالت سے باضابطہ سزا ہوجائے، تاکہ وہ اصل پی پی پی کو کچھ عرصہ کے لیے سیاست اور حکومت سے باہر رکھ سکے۔ ظلم اور ناانصافی دیکھئے کہ جس سیاسی راہنما نے بھارت کی قید سے نوے ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرایا اُس کا اپنا داماد اپنے ہی ملک پاکستان میں بغیر کوئی جرم ثابت ہوئے آٹھ سال سے قید میں پڑا ہے۔ حکومت اگر روز قیامت کو ذہن میں رکھ کر انصاف کرے تو ضمانت پر رہائی آصف زرداری کا قانونی، انسانی اور شرعی حق ہے۔

سوئس عدالت میں دفاع کا حق ذمہ داری آصف زرداری پر ہے۔ حکومت کو اس سلسلے میں خوش ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک قیدی جو آٹھ سال کی قید کاٹ چکا ہے وہ اپنی عزت اور وقار قائم رکھنے کے لیے مزید آٹھ سال بھی جیل میں گزار سکتا ہے۔ حکمرانوں کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ آصف زرداری کو ضمانت پر رہا کردیں اور اسے اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ خود کرنے دیں۔''

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ پی پی پی کو کمزور اور تقسیم کرنے کی سازش جاری رکھے گی۔ محترمہ نے اپنا خون دے کر پی پی پی کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ عوامی سطح پر پارٹی کو کمزور کرنا ممکن نہیں ہوگا البتہ پارٹی رہنماؤں کی سطح پر غلط فہمیاں پیدا کرکے پارٹی کو مختلف گروپوں میں تقسیم کرنے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔ صوبہ سرحد میں آفتاب شیرپاؤ گروپ قابل ذکر مثال ہے۔ آصف زرداری نے بہت بڑے چیلنج کو قبول کیا ہے۔ ان کا سیاسی امتحان شروع ہوچکا ہے۔ ان کا نمبر ون مسئلہ یہ ہونا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

غیر متزلزل آصف زرداری

نذیر ناجی

کچھ بھی کہئے، آصف زرداری ہے طرح دار جوان، اُس نے جیل کاٹنے کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے اُس کا ہر حصہ اپنی جگہ منفرد ہے۔ وہ جہاں پر اَڑ گیا پھر اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ آٹھ سال کی طویل قید کے دوران مختلف حکومتوں نے اُسے دبانے، ڈرانے اور للچانے کے لیے اپنی اپنی سوچ کے مطابق نئے نئے حربے استعمال کیے، کسی نے خوفزدہ کیا تو کسی نے ٹارچر سیل میں لے جا کر تھرڈ ڈگری کے استعمال کا حکم دیا، کسی نے جلاوطنی کا مشورہ دیا تو کسی نے سیاسی سودے بازی کی کوششیں کیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بے نظیر بھٹو کو چھوڑ دے تو اُسے زندگی کی ہر آسائش مہیا کی جاسکتی ہے۔ ایک اور کوشش یہ تھی کہ وہ بے نظیر بھٹو کی سیاست کو مسترد کردے اور سیاسی حریف کے طور پر اُن کے سامنے آجائے اور یہ کوشش بھی کی گئی کہ وہ شہباز شریف کی طرح کسی بہانے بے نظیر کو پارٹی کی قیادت سے دستبردار کر کے خود قیادت سنبھال لے تو اُسے وزیر اعظم بنانے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ کسی انسان کو اپنے مؤقف سے ہٹانے کے لیے دنیا میں دہشت زدگی سے لے کر لالچ اور ترغیب تک جو حربہ ممکن ہے آصف زرداری پر آزمایا گیا لیکن یہ شخص ہے کہ ٹس مس نہیں ہوا۔ نہ طویل قید نے اس کا کچھ بگاڑا اور نہ خوف اور لالچ اس کے قدم ڈگمگا سکے۔ یہاں تک کہ طویل قید کی وجہ سے جو نفسیاتی دباؤ اور اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں آصف نے انہیں بھی اپنے قریب نہیں آنے دیا، یہ اُس کی باطنی طاقت کا ثبوت ہے، البتہ جسمانی بیماریوں نے اسے ضرور گھیرا لیکن یہاں بھی اس کا انداز جُداگانہ رہا۔ اس نے اپنی بیماریوں کا ڈھول بجا کر نہ ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کی اور نہ مراعات طلب کیں۔ معمول کے مطابق اُس نے جیل میں علاج کی سہولتیں مانگیں، حاصل ہوگئیں تو ان سے استفادہ کرلیا نہ ملیں تو بھی گزارا کرتا رہا لیکن اپنی بیماری کو اس نے سیاست کا ذریعہ نہیں بنایا۔ میں اُس کی کرپشن پر بحث نہیں کروں گا کیونکہ اتنی لمبی قید کاٹ لینے کے بعد اب یہ الزام بے معنی ہوگیا ہے۔ آصف کی کیفیت بقول غالب اب یہ ہے کہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

چاہئے کہ وہ پی پی پی کو متحد اور منظم رکھیں۔ پی پی پی کے کارکن اس ضمن میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگر آصف زرداری کارکنوں کو فعال اور متحرک رکھ سکیں تو پارٹی لیڈر بھی ڈسپلن میں رہیں گے۔ منظم اور فعال کارکن میں چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

2008ء کا سال پی پی پی کے لیے بڑا اہم ہوگا۔ آصف زرداری کو اپنی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوگا۔ وہ اگر محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی روایات پر چلتے رہے تو اُن کی منزل آسان ہوگی۔ بے نظیر بھٹو کا راستہ ہی کامیابی کا راستہ ہے۔ پارٹی سیاست کو ذاتی دوستوں کے اثر ورسوخ سے الگ رکھا جانا چاہئے اور پارٹی کے فیصلے مشاورت اور جمہوری اصولوں کے مطابق کیے جانے چاہئیں۔ جمہوری اصول ہی سیاسی جماعتوں کی طاقت ہوتے ہیں۔ اصول نظر انداز ہوں تو جماعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ آصف علی زرداری نے مفاہمت کو اپنی سیاست کا مرکزی نکتہ بنایا ہے پاکستان کے منتشر اور منقسم شدہ سماج میں مفاہمت آسان کام نہیں ہے۔ آصف علی زرداری کو یقین ہے کہ وہ پاکستان کے سیاسی گروپوں کے درمیان مفاہمت کا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''دھوئے'' گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

ڈرانے، للچانے کے لیے جو قسط وار سعی ہوتی ہے اُس کا حالیہ سلسلہ یہ ہے کہ بی بی کو آصف زرداری کی مراعات کے بدلے کسی ڈیل پر آمادہ کرنے کی سعی ہوئی لیکن بی بی نے اس ''محدود'' ڈیل سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد آصف زرداری سے براہ راست رابطے شروع ہوئے۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے افراد غیر رسمی ملاقاتوں کے لیے گئے اور آصف زرداری کے سامنے اپنے سیاسی تجزیئے پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ''پرویز مشرف کی حکومت ابھی کافی عرصے تک چلے گی اور اس کے دور میں آپ کی رہائی ممکن نہیں۔ آپ کی جوانی کا بہترین دور پہلے ہی جیل میں گزر چکا ہے۔ جو تھوڑا عرصہ باقی ہے اُسے باہر جا کر آزادی سے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گزاریں اور جب حالات سازگار ہوں تو واپس چلے آئیں۔ اگر آپ اس کے لیے تیار ہوں تو حکومت راستہ مہیا کر سکتی ہے'' اور راستہ یہ بتایا گیا کہ آپ کو سوئٹزرلینڈ میں جاری تحقیقات کی بنیاد پر شامل تفتیش کرنے کے بہانے بھیج دیا جائے گا اور سوئس قانون کے مطابق وہاں سیاسی پناہ کی درخواست دے کر آپ کو قیام کی سہولت مل جائے گی اور اس طرح آپ ایک خوبصورت اور آزاد زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ آصف زرداری نے اس پیشکش کو مسترد کرنے کے بجائے جواب دیا کہ ''اگر آخری کیس میں بھی ان کی ضمانت میں حکومت کی طرف سے رکاوٹ نہ ڈالی جائے تو وہ آزاد شہری کی حیثیت سے سوئٹزرلینڈ جانے کے لیے تیار ہیں'' (یاد رہے کہ آصف اپنے خلاف 14 مقدموں میں 13 میں پہلے ضمانت پر ہیں) اگر مبینہ پیشکش نیک نیتی سے کی گئی ہوتی تو آصف زرداری کو بیرون ملک بھیجنے کا مقصد پورا ہو رہا تھا لیکن ہمارے ہاں ہر حکومت میں کوئی نہ کوئی بقراط ضرور بیٹھا ہوتا ہے جو اچھی بھلی آگے کی طرف بڑھتی ہوئی کہانی کو اپنی طرف سے ایک موڑ دے کر اُسے ایک فلاپ سٹیج ڈرامے کی طرح مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ یہی کچھ آصف زرداری کے ساتھ ہوا۔ کسی بقراط نے آصف زرداری کی طرف سے سوئٹزرلینڈ جانے کے لیے مشروط آمادگی کا تجزیہ یوں کیا کہ ''آصف ٹوٹ چکا ہے، اب اسے بہانہ مہیا کر دیا جائے تو نکل جائے گا، کیوں نہ اُسے گندا کر کے نکالا جائے؟'' اور اس کے لیے ترکیب یہ نکالی گئی کہ ایک چارٹرڈ جہاز ائیر پورٹ پر کھڑا کر کے ہنگامی انداز میں آصف سے کہا گیا کہ ''آپ کے لیے ایک چارٹرڈ جہاز تیار کھڑا ہے۔ سوئس عدالت کی طرف سے طلبی کا سمن ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ حکومت کو بھی بہانے کی ضرورت ہوتی ہے ہم آپ کو بیرون ملک جانے کی سہولت مہیا کر رہے ہیں۔ آپ عدالت میں پیش ہونے کے بہانے یہاں سے نکل جائیں اور ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع دیں کہ ہم نے انصاف

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کے عمل میں مدد کے لیے آصف کو بھیجا ہے'' لیکن آصف زرداری اب وہ کھلنڈرا اور آزاد منش نوجوان نہیں رہ گیا۔ سیاست اور جیل کی مار انسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ آزادی کے بہانے اسے مفرور، بزدل اور بھگوڑا بنانے کا منصوبہ ہے۔ اتنی طویل قید کاٹنے کے بعد ذلت کا طوق گلے میں ڈالنا آصف جیسے بہادر آدمی کے لیے ناممکن ہے اور اس نے وہی کیا جس کی آصف زرداری سے اُمید تھی۔ مشرف خود ایک انسان ہیں انہیں محسوس کرنا چاہئے کہ عزت و وقار کے لیے اتنی بڑی قربانی جو آصف زرداری دے رہا ہے ایک بہادر شخص ہی دے سکتا ہے۔ ایک بہادر آدمی کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جس کا وہ مستحق ہے۔ سکندر اور پورس کا واقعہ سب کو یاد ہوگا۔ جب سکندر کے قیدی پورس سے پوچھا گیا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ پورس کا جواب تھا ''جو ایک بادشاہ، بادشاہ سے کرتا ہے'' پرویز مشرف کو بھی آصف زرداری سے وہی سلوک کرنا چاہئے جو ایک بہادر آدمی، دوسرے بہادر آدمی سے کرتا ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آصف زرداری۔۔۔قید اور قد دونوں میں اضافہ

نذیر ناجی

وقت کیسے بدلتا ہے؟ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے طرز حکومت پر مجھ سے زیادہ تنقید شاید ہی کسی نے کی ہو، جواب میں ان دونوں کے کارندوں نے میرے بھائی اور بیٹوں کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر مجھے یہی گمان رہا کہ ایسا کرنے کا حکم بی بی اور آصف نے نہیں دیا ہوگا، بھٹو صاحب کے ساتھ میرے تعلق اور نیاز مندی کا رشتہ تب سے ہے جب بے نظیر اور مرتضیٰ بچے تھے، میرے لیے وہ دونوں بہن بھائی تھے، میری خوش گمانی کا سبب یہی دیرینہ واسطہ تھا، ذاتی رشتوں میں بھٹو صاحب بہت ڈھیل دیتے تھے، راؤ خورشید، بھٹو صاحب کے ٹکٹ پر جیت کر اسمبلی میں اُن کے خلاف تقریریں کرتے رہے۔ سب کا خیال تھا کہ 1977ء میں انہیں ٹکٹ نہیں ملے گا لیکن بھٹو صاحب نے سب سے پہلے اُن کا ٹکٹ کنفرم کیا، رشتے نبھانے میں بے نظیر اپنے عظیم والد سے بہت آگے ہیں اور آصف زرداری، بے نظیر سے بھی آگے، حکمرانی میں یہ صفت ایک حد سے بڑھ جائے تو عیب بن جاتی ہے، ان دونوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اپنی قیادت کے ابتدائی ایام میں بی بی کا انداز تحکمانہ تھا، میں اس سے برگشتہ ہوگیا۔ اُن کے پہلے دور حکومت میں دوری اور بڑھی لیکن دوسری مرتبہ وزیراعظم بنیں تو بی بی میں تبدیلی آ چکی تھی، ذاتی طور پر مجھے اُن کی جارحیت کا تجربہ نہیں، ان کے دور وزارت میں پہلا سامنا ہوا تو بی بی نے ملک بھر کے صحافیوں کے سامنے مجھے دور کی میز سے بلوا کر وہ کرسی پیش کی جو آصف زرداری کے لیے رکھی گئی تھی، جو باتیں انہوں نے کیں، وہ ایک وزیراعظم کی نہیں ایک بہن کی باتیں تھیں، لیکن فاصلے باقی رہے، وقت بدلا، سارے سیاستدان میدان سے باہر ہوگئے۔ جو شرطیں مان گئے اُن کے لیے دروازے کھل گئے۔ بی بی اور نواز شریف نہیں مانے اُن پر دروازے بند ہیں۔ اس کھیل میں آصف زرداری کی قید اور قد دونوں بڑھتے جا رہے ہیں، میں نے گزشتہ روز ان کے متعلق ایک بات کی اور کالم لکھا تو اس پر ناقابل یقین حد تک داد ملی، ای میل، خطوط اور فون تو آئے ہی، محفلوں اور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

عوامی مقامات پر بھی لوگوں نے روک روک کر یہ کہا کہ ''آصف زرداری پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھا کر آپ نے دل خوش کر دیا'' گزشتہ روز بے نظیر بھٹو کا مراسلہ بھی ملا، اس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

''ڈیئر مسٹر نذیر ناجی!

میں اس کالم پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، جو مورخہ 16 اپریل 2003ء کو آپ نے ''جنگ'' میں لکھا، میں نے اُسے پوری دلچسپی، پسندیدگی اور اس شخصیت کے لیے احترام کے ساتھ پڑھا جو مظلوم کے حق میں آواز بلند کرتی ہے، درحقیقت وہ تمام لوگ جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی ایک یا دوسری صورت کا سامنا کر رہے ہیں، اُن سب کا دفاع ہونا چاہیے۔ بے شک آپ کی اچھائی ہے کہ آپ انسانی حقوق کی حمایت میں آواز اٹھاتے ہیں جو کہ 21 ویں صدی کے انتہائی نمایاں مسائل میں سے ایک ہے۔

اقوام عالم تحمل و برداشت کی بنیادی اسلامی اقدار کو اختیار کرنے یا انہیں فروغ دینے میں مصروف ہیں، آمریت کے راستوں کو مسترد کرنے والے ممالک یہ جانتے ہیں کہ عدم مرکزیت کا راستہ ہی احسن ہے، یہی وہ راستہ ہے، جس میں بحث و مباحثہ اور اختلاف رائے کی بنیاد پر ترقی و خوشحالی کی جانب پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔ ہمارے ملک میں ایک یا دوسری قسم کی آزادروی روز افزوں ہے، خواتین، اقلیتیں، میڈیا محروم طبقے اور سیاسی کارکن سب ایک یا دوسری طرح کے امتیازی جبر اور بربریت کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔ میں اور میرے خاندان کو یقین ہے کہ ہماری ذاتی قربانیوں ہمارے ملک کے عام آدمی کی ان قربانیوں کے مقابلے میں ہیچ ہیں، جو مدتوں سے انصاف کو ترستے رہے ہیں، اس باعث ہم اپنے اصولوں پر مسلسل قائم ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ایسا کر کے ہم اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کا تحفظ اور آج کے نوجوانوں کا دفاع کر رہے ہیں۔

آصف کو 4 نومبر 1996ء کی رات گرفتار کیا گیا، اس رات پی پی پی کی حکومت ختم کی گئی تھی، اس دوران آصف کو ذہنی اور جسمانی طور پر سینکڑوں شدید اور خفیف طریقوں سے ایذا پہنچائی گئی، ہمارے ملک کے قانون کے مطابق کسی ایسے شخص کو جیل میں نہیں رکھا جاسکتا جس کی ضمانت طبی بنیادوں پر منظور کی جاچکی ہو یا جس کے مقدمے کا فیصلہ دو سال تک نہ ہوا ہو، آصف ایک استثنیٰ ہے، وہ قتل کی سزا بھی بھگت چکا ہے، جو عمر قید ہوتی ہے، حالانکہ وہ بے گناہ ہے، یہ قید وہ جرأت اور حوصلہ مندی سے کاٹ رہا ہے، اُسے معلوم ہے کہ عوام کی اجتماعی جدوجہد آخر کار کامیاب ہوگی۔

نیلسن منڈیلا نے 27 سال کی قید کے دوران نسل پرست قوتوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا تھا،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آصف اور پی پی پی عوام کے حقوق کے حصول کی جدوجہد کررہے ہیں، ہم پاکستان کے لیے ایک ایسے مستقبل کے خواہاں ہیں جس میں معاشرہ آزاد اور مختلف خیالات رکھنے والوں پر مشتمل ہو اور جہاں معاشرے کی بنیاد، قانون، انصاف اور ہمہ گیر مساوات کے اصول پر ہو۔

یہ پاکستان کے غریب عوام کے ساتھ ایک سفا کانہ مذاق ہے کہ کروڑوں اربوں روپے جو کہ ہسپتالوں اور سکولوں پر خرچ کئے جاسکتے تھے، مزید حکومتی بیورو قائم کرنے پر خرچ کئے جارہے ہیں تاکہ وہ پاکستان کی مقبول قیادت کے خلاف مقدمے قائم کرسکیں، قوانین جو کہ تقدیس کے مستحق ہیں، انہیں بدل کر رکھ دیا جاتا ہے، یہ تبدیلیاں موثر بہ ماضی ہوتی ہیں، احتساب کے ججوں کو موثر بہ ماضی ترقیاں دی جاتی ہیں اور انہیں مالی فوائد پہنچائے جاتے ہیں، جو کسی دوسرے ملک میں ہوں تو رشوت کہلوائیں، ایسے ہی فوائد خصوصی احتساب کے ججوں کو سپیشل پیکجز کے نام پر پہنچائے جاتے ہیں، یہ فوائد اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی مراعات سے زیادہ نفع بخش ہیں، ایک عرصے کے بعد یہ سلسلہ روک دیا گیا لیکن جو کچھ دیا جاچکا ہے کبھی واپس نہ ہوا۔

پی پی پی نے قومی احتساب بیورو میں متعدد شکایات داخل کیں، ان شکایات پر آزادانہ اور منصفانہ تحقیقات کبھی نہیں کرائی گئیں۔ حالانکہ یہ بیورو عوام کے سرمائے سے استفادہ کرتا ہے، EOBI کے فنڈ سے ایک سو ملین ڈالر غائب کردیئے گئے اور یہ معاملہ دبا دیا گیا، یہ برف کے ایک زیر آب تودے کا ایک کونہ ہے، پلازے، پلاٹس، تجارتی اور رہائشی جائیدادیں، وہ طفیلی اور حاشیہ بردار ہضم کر گئے، جو عوام کی تکالیف اور مشکلات کو دیکھنے کے معاملے میں اندھے، بہرے اور غلیظ ہیں، اوکاڑہ فارم کا واقعہ پاکستانی عوام کی تکالیف کی ایک ادنیٰ سی جھلک ہے، عوام کی جائیدادیں اور حقوق وہ امراء شاہی غضب کررہی ہے جو عوام کو جمہوریت، انصاف، قانون کی حکمرانی، ترقی اور خوشحالی کے موقع دینے سے انکاری ہے۔

جب انصاف کے دروازے بند ہوجائیں اور قوم کا احساس زیاں جاتا رہے، ایسے وقت میں قیدی سینیٹر آصف زرداری کی بے جا اسیری کے خلاف آواز اٹھا کر آپ نے ثابت کردیا کہ پاکستان کے پندرہ کروڑ عوام کے عظیم وطن میں، ضمیر آج بھی زندہ ہے..............

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مستقبل کا لیڈر ــــ بلاول

محترمہ بے نظیر بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بعد 26 سال کی عمر میں پی پی پی کی قیادت سنبھالی تھی۔ انہوں نے کافی عرصہ شریک چیئر پرسن کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ بیگم نصرت بھٹو پی پی پی کی چیئر پرسن تھیں۔ لیکن عملی طور پر پارٹی کی قیادت محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہاتھ میں رہی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو خداداد صلاحیت اور شب و روز کی محنت سے پاکستان کی سیاست پر چھا گئیں۔ محترمہ نے 16 اکتوبر 2007ء کو پاکستان واپسی سے دو روز قبل اپنے ہاتھ سے ایک وصیت تحریر کی جس میں انہوں نے آصف علی زرداری کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ دانش مند لیڈر کو علم تھا کہ اُن کی شہادت کے بعد پی پی پی کے لیڈر کسی ایک نام پر متفق نہیں ہوسکیں گے اور اُن کی وصیت کو قبول کرلیا جائے گا۔ آصف علی زرداری نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلاول کا نام پارٹی کے نئے چیئر مین کے طور پر پیش کردیا اور خود شریک چیئر مین بننا قبول کرلیا۔ پی پی پی کو متحد رکھنے کے لیے یہ ایک اچھی تجویز تھی جسے پی پی پی کی سینٹرل ایگزیکٹو اور فیڈرل کونسل نے اتفاق رائے سے منظور کرلیا۔

بلاول 21 ستمبر 1988ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کی ولادت محترمہ بے نظیر بھٹو کے لیے مبارک ثابت ہوئی اور وہ بلاول کی پیدائش کے تین ماہ بعد پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بن گئیں۔ محترمہ نے اپنی سوانح عمری ''دختر مشرق'' میں بلاول کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شہرت یافتہ اور سیاسی طور پر متنازعہ بچہ قرار دیا ہے۔ بلاول نے اپنے بچپن کے دس سال پاکستان میں گزارے۔ بلاول اپنی والدہ اور بہنوں بختاور اور آصفہ کے ہمراہ اپریل 1999ء میں پاکستان سے باہر چلے گئے جب کہ اُن کے والد آصف زرداری جیل میں اسیر رہے۔ آصف زرداری نے صحافیوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُن کی طویل قید اُن کے بچوں کے لیے بہت بڑا گفٹ ہوگی جس پر وہ فخر کیا کریں گے۔ بلاول نے ابتدائی تعلیم دبئی کے ایلیٹ کلاس رشید سکول میں حاصل کی۔ وہ سٹوڈنٹ کونسل کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ بلاول 2004ء تک اپنے والد کی محبت شفقت اور

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سرپرستی سے محروم رہے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ بلاول نے 16 سال کی عمر میں اخبارات اور جرائد کو انٹرویو دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ بلاول نے ڈان اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اُن کے والد کو اُس وقت اپنے بچوں سے چھین لیا گیا جب بچوں کو اُن کی بڑی ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کئی اہم لمحات اپنے والد کی موجودگی کے بغیر گزارے۔ آصف زرداری کی رہائی کے تین سال بعد بلاول کی عظیم ماں اُن سے بچھڑ گئی۔ بلاول اپنی والدہ محترمہ بےنظیر بھٹو کا لاڈلا بیٹا تھا۔ والدہ کی ناگہانی شہادت نے بلاول کی زندگی پر وہ داغ چھوڑے ہیں جن کی کسک بلاول کو زندگی بھر محسوس ہوتی رہے گی۔ محترمہ بےنظیر بھٹو بلاول کی زندگی کا مرکز اور محور تھیں۔ بلاول زندگی کے ایسے موڑ میں داخل ہو چکے تھے جہاں انہیں اپنی والدہ کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔

بلاول نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کالج میں تاریخ اور سیاسیات کی تعلیم حاصل کرے گا۔ کرائسٹ چرچ کالج دنیا کا معروف تعلیمی ادارہ ہے جس نے برطانیہ کے 13 وزیراعظم تخلیق کیے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو نے بھی اسی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے آکسفورڈ کے لیڈی مارگریٹ ہال سے تعلیم حاصل کی اور آکسفورڈ یونین کی پہلی ایشیائی خاتون صدر منتخب ہوئیں۔ بلاول کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل مثالی ہو رہی ہے۔ وہ نئے دوست بنانے کا فن جانتا ہے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پاکستان کے عوام نے بلاول کو پہلی بار ٹیلی وژن سکرین پر پریس کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے سُنا۔ سیاسی تجزیہ نگار متفق تھے کہ بلاول پاکستان کا عظیم سیاست دان بنے گا۔ بلاول نے اپنے نام کے ساتھ بھٹو کا اضافہ کرنے کا دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے۔ ''بھٹو'' کا لفظ پاکستان میں جرأت، بہادری اور عوامی خوشحالی کی علامت بن چکا ہے۔ بھٹو ایک ایسا کلاسیکل ساز ہے جو اب پاکستان کے کلچر کا حصّہ ہے اور جس کی موسیقی کی دُھن پر غریب عوام ناچتے اور بھنگڑا ڈالتے ہیں۔ بلاول نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''جمہوریت ہی بہترین انتقام ہے۔''

بلاول نے آکسفورڈ میں اپنا تعلیمی سال شروع کرنے سے پہلے صحافیوں کے اصرار پر لندن میں پریس کو بریف کیا۔ اس پریس بریفنگ میں دنیا کے نامور سینئر صحافی موجود تھے۔ بلاول نے سینئر صحافیوں کے سوالات کے جوابات بڑے اعتماد کے ساتھ دیئے۔ اُن کے جواب مختصر جامع اور متاثر کرنے والے تھے۔ صحافیوں نے بلاول کی اہلیت کا اعتراف کیا۔ بلاول 2012ء تک اپنی تعلیم

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مکمل کرلے گا اور پی پی پی کی قیادت عملی طور پر سنبھال لے گا۔ بلاول کے پاس اعلیٰ تعلیم کے علاوہ وہ عظیم سیاسی ورثہ ہوگا جو اُن کے نانا ذوالفقار علی بھٹو کے پاس بھی نہیں تھا۔ بلاول اپنے نانا اور اپنی والدہ کے سیاسی ورثہ کا امین ہے۔ اُن کے والد نے بھی طویل قید کاٹ کر اپنے سیاسی اور نظریاتی مخالفین سے ''مردِ حر'' کا خطاب حاصل کیا جو بلاول کے لیے بہترین حوالہ ہوگا۔ بلاول اپنی عظیم ماں کی طرح پاکستان کی سیاست پر چھا جائے گا۔ اُس کے سامنے کسی اور کا چراغ جلنا ممکن نہیں ہوگا۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید نے موت کی کوٹھڑی سے اپنی سب سے پیاری بیٹی کے نام خط لکھ کر اپنا سیاسی ورثہ محترمہ بےنظیر بھٹو کے نام منتقل کر دیا تھا۔ یہ محض ایک باپ کا اپنی بیٹی کے نام ایک خط نہیں ہے بلکہ ایک وصیت نامہ ہے جس میں دو ٹوک الفاظ میں محترمہ بےنظیر بھٹو کو سیاسی جانشین نامزد کیا گیا ہے۔ محترمہ نے بڑی محنت اور جرأت کے ساتھ نہ صرف بھٹو شہید کے سیاسی ورثے کا تحفظ کیا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ سیاسی ورثہ کو پراپرٹی سے الگ رکھنا چاہیے۔ مادی جائیداد کے حق دار تمام وارث ہوتے ہیں جب کہ سیاسی ورثہ ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتا ہے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کا سیاسی ورثہ بلاول بھٹو کو منتقل ہو چکا ہے۔ 2012ء میں جو انتخابات ہوں گے اُن میں بلاول بھٹو پی پی پی کی انتخابی مہم کی قیادت کریں گے۔ پاکستان کی نئی نسل بلاول کے اردگرد ہوگی۔ پاکستان کے عوام کا ایک ہی خواب ہے کہ پاکستان ایک ایسی ویلفیئر سٹیٹ بن جائے جس میں پاکستان کے ہر شہری کو بلاتفریق عزت سے جینے کا حق مل جائے۔ عوام کے اس خواب کی تکمیل بھٹو اور محترمہ کا مقدس مشن تھا بلاول یہ مشن مکمل کریں گے۔

بلاول ٹارگٹ شوٹنگ، پیرا کی، گھڑ سواری اور اسکوائش کے شوقین ہیں۔ وہ تائی کوانڈو کی بلیک بیلٹ حاصل کر چکے ہیں۔ کرکٹ اُن کا پسندیدہ کھیل ہے مگر وہ والد کی اسیری اور والدہ کی جلاوطنی کی وجہ سے کرکٹ نہ کھیل سکے۔ بلاول کو کتب اور رسالے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بچپن میں بہت Shy تھے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے بڑی توجہ اور محنت سے بلاول کی اس کمزوری کو ختم کیا۔ اب بلاول لوگوں کو مل کر خوش ہوتے ہیں اور اعتماد کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے بلاول کو پاکستان کی تاریخ اور سیاست کی تعلیم دی۔ بلاول نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ''بانی پاکستان جمہوریت پر یقین رکھتے تھے اور پاکستان آمریت کے لیے حاصل نہیں کیا گیا تھا لہٰذا آمر حکمران نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پاکستان میں ہر چند سال کے بعد آمر اقتدار پر قبضہ نہ کر لیتا تو ہم موجودہ مسائل کا شکار نہ ہوتے۔ آمریت پس ماندگی اور غربت کو جنم دیتی ہے۔'' بلاول کے خیالات سے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی وصیت

قیوم نظامی

محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی وصیت کے بارے میں پورے پاکستان میں قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ پی پی پی کے سیاسی مخالفین شکوک وشبہات پھیلا رہے تھے۔ ہمارے ملک کی ایک بیماری یہ بھی ہے کہ جو لوگ عملی سیاست میں شریک نہیں ہیں وہ سیاسی تجزیے کرتے ہیں اور فتوے جاری کرتے ہیں، سیاسی جماعتوں کے فیصلوں پر تنقید کرتے ہیں۔ سیاسی پنڈتوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی وصیت پر بھی تنقید کی۔ پارٹی لیڈر اپنی جماعت کی خوبیوں اور کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی پارٹی کے رفقاء اور کارکنوں کے مزاج کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے۔ پارٹی فیصلوں پر تنقید کرنے والے غیر سیاسی لوگ پارٹی کے اندرونی ڈھانچے اور تنظیم سے آگاہ نہیں ہوتے لہٰذا انہیں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے جانشین کا فیصلہ اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے اپنی دانشمندی اور بصیرت کا ثبوت دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء کے انتخابات سے پہلے اپنے دو جانشین معراج محمد خان اور غلام مصطفیٰ کھر نامزد کئے تھے۔ ان پر قاتلانہ حملے ہو رہے تھے لہٰذا انہوں نے پارٹی کے وسیع تر مفاد میں دو جانشین نامزد کیے۔ ایک کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا جب کہ دوسرے کا تعلق جاگیردار طبقے سے تھا۔ بھٹو شہید دو طبقوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معراج محمد خاں اصولی اختلافات کی بناء پر بھٹو شہید سے علیٰحدہ ہو گئے جبکہ غلام مصطفیٰ کھر جانشینی کا فرض پورا کرنے کی بجائے بھٹو کو موت کی کوٹھڑی میں چھوڑ کر پاکستان سے باہر چلے گئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری کو اپنا جانشین نامزد کیا ہے۔ جن کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ وہ ان کی شہادت کے بعد پی پی پی کو متحد رکھنے کے لیے بہترین انتخاب ثابت ہوں گے۔ پاکستان میں چونکہ جذبات کا عمل دخل زیادہ ہے ہم نعروں اور تقریروں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور حکمت و بصیرت کو نظر انداز کرتے ہیں لہٰذا محترمہ بے نظیر بھٹو کی وصیت کے متن کی پوری طرح پذیرائی نہیں کی گئی۔ محترمہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں پاکستان کے بنیادی مسائل کا پورا ادراک ہے۔ پاکستان کو وہی قیادت بحران سے باہر نکال کر ترقی و خوشحالی کی راہ پر ڈال سکتی ہے جس کو پاکستان کے مسائل کا پورا ادراک ہو اور اس قدر باشعور ہو کہ ایسی ٹھوس منصوبہ بندی کرے جس کے نتیجے میں پاکستان کو جمپ سٹارٹ مل سکے۔ پاکستان کو ایک محب الوطن قومی قائد کی ضرورت ہے۔ خدا کرے بلاول قیادت کا خلا پورا کر سکیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بےنظیر بھٹو کی وصیت ایک تاریخی دستاویز ہے جسے پی پی پی کے ہر کارکن کو اپنی لیڈر کے آخری پیغام کے طور پر مشعل راہ بنانا چاہیے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو جنہیں اپنی شہادت کا یقین ہو چلا تھا بلکہ وہ شعوری طور پر سوئے مقتل سفر کا آغاز کر چکی تھیں۔

مقام فیض راہ میں کوئی جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محترمہ بےنظیر بھٹو نے دوبئی سے پاکستان واپسی سے دو دن پہلے اپنے ہاتھ سے سترہ صفحات پر مشتمل ایک وصیت تحریر کی جس میں خاندانی اور پارٹی امور کے علاوہ ایک صفحہ اپنے جانشین کی نامزدگی کے بارے میں بھی تھا۔ سیاسی وصیت کا ایک ایک لفظ قابل توجہ ہے۔ شہید بی بی نے تحریر کیا۔

''پی پی پی کے عہدیداروں اور اراکین (کارکنوں) سے میں کہتی ہوں کہ مجھے ان کی راہنمائی کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کوئی اور لیڈر اپنی پارٹی پر اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر میں اپنی پارٹی پر کر سکتی ہوں جس کے کارکنوں نے اپنے لیڈر قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کے مشن کی تکمیل پاکستان کو ایک وفاقی جمہوری اور انسانی مساوات پر مبنی ملک بنانے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور ڈسپلن کا مظاہرہ کیا۔ میں آپ کی جرأت اور حرمت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ میں آپ کو سلام پیش کرتی ہوں کہ آپ دو فوجی آمریتوں کے دوران اپنی بہن کے ساتھ کھڑے رہے۔ میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوں۔ براہ کرم انتہا پسندی، آمریت، غربت اور جہالت کے خلاف جدوجہد جاری رکھیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر آصف زرداری عبوری دور کے لیے اس وقت تک آپ کی رہنمائی کریں جب تک وہ اور آپ مل کر پارٹی کے لیے کوئی بہتر فیصلہ نہ کر لیں۔ میں یہ اس لیے کہتی ہوں کیونکہ آصف ایک جرأت مند اور قابل فخر شخص ہے۔ اس نے ساڑھے گیارہ سال جیل میں گزارے اور اذیت کے باوجود جھکنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے سیاسی مرتبے کی بنا پر ہماری پارٹی کو متحد رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کے لیے نیک تمنائیں رکھتی ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ پارٹی منشور پر عمل کرنے اور پسے ہوئے مظلوم عوام جن سے ناروا امتیازی سلوک کیا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

گیا، کی خدمت کرنے میں کامیاب ہوں۔ آپ ان عوام کو غربت اور پس ماندگی سے نجات دلانے کے لیے خود کو وقف کر دیں جیسا کہ آپ نے ماضی میں کیا۔''

اس وصیت نامہ پر محترمہ بےنظیر بھٹو نے دستخط کیے اور 16 اکتوبر 2007ء کی تاریخ درج کی۔ اردو پریس کا معیار چونکہ قابل رشک نہیں ہے اس لیے قومی اخبارات میں محترمہ کی انگریزی میں وصیت کا درست ترجمہ شائع نہیں کیا جا سکا۔ تحریر لکھنے والا لیڈر چونکہ اپنے دل و دماغ کو گواہ رکھتا ہے اس لیے تحریر کو ہمیشہ تقریر پر زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ محترمہ نے ایک صفحہ کی تحریر میں اپنی شخصیت، سیاست اور نظریے کو جس خوبصورت، دلکش اور جامع انداز میں بیان کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ پی پی پی کے حامیوں اور کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی شہید قائد کے آخری پیغام کو اپنا مشن بنائیں۔ عوام دشمن عناصر پی پی پی کو کمزور اور تقسیم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں گے۔ پی پی پی کے کارکن پہلے بھی ان کوششوں کو ناکام بناتے رہے ہیں آئندہ بھی انہیں متحد رہتے ہوئے ہر قسم کے حربوں اور ہتھکنڈوں کا مقابلہ کرنا ہے اور پارٹی کا قبلہ بھی درست رکھنا ہے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کی سیاسی وصیت کے ایک ایک لفظ پر پارٹی کارکنوں کا مکمل اعتقاد ہونا چاہیے۔ انتہا پسندی، غربت اور جہالت کا خاتمہ تین اہم اصول ہیں جو شہید بی بی نے پارٹی کے لیے متعین کئے ہیں۔ مفاد پرست عناصر پی پی پی کو ان اُصولوں سے دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ پارٹی کارکن ایسے مفاد پرست عناصر سے ہوشیار رہیں اور ہر گلی اور ہر کوچے میں محترمہ بےنظیر بھٹو کی آخری وصیت کا پرچار کریں تاکہ وصیت میں تحریر کردہ انقلابی پیغام کی روشنی میں عوام کو شعور سے مسلح کر کے انہیں منظم اور متحد کیا جا سکے تاکہ بھٹو اور محترمہ کے مشن کی تکمیل کی منزل حاصل کی جا سکے۔ اگر پارٹی کے کارکن شہیدوں کے مشن سے غافل کر دیئے گئے تو پھر منزل ہاتھ سے نکل جائے گی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

یادوں کا سفر

قیوم نظامی

جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کو بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا اور نوے روز کے اندر نئے انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو ملک سے باہر چلے گئے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے ملک کے اندر رہنے کا فیصلہ کیا تا کہ بھٹو شہید کی رہائی کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اگست 1977ء میں رہائی کے بعد کراچی اور لاہور پہنچے۔ لاکھوں عوام نے اُن کا پُر جوش استقبال کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے خوف زدہ ہو کر اکتوبر 1977ء میں ہونے والے انتخابات ملتوی کر دیئے اور ذوالفقار علی بھٹو کو نواب احمد خان قصوری کے قتل کے مقدمے میں گرفتار کر لیا۔ پی پی پی نے لاہور میں جمہوریت کی بحالی اور بھٹو کی رہائی کے لیے احتجاج کا فیصلہ کیا۔ میں نے باضابطہ طور پر اعلان کر کے داتا دربار لاہور سے گرفتاری پیش کی۔ میری گرفتاری کے بعد لاہور میں احتجاجی گرفتاریاں پیش کرنے کا سلسلہ چل نکلا۔ جنرل ضیاء الحق نے تحریک سے خوف زدہ ہو کر سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا۔ مجھے کوٹ لکھپت جیل میں دس کوڑے مارے گئے۔ میڈیا نے اس غیر انسانی واقعہ کو بڑی اہمیت دی۔ پاکستان کے سیاسی حلقوں میں میرے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ بھٹو شہید بھی کوٹ لکھپت جیل میں تھے۔ انہوں نے کارکنوں کے ننگے جسموں پر کوڑے لگنے کے واقعہ کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور جب میری بیگم کشور قیوم کو چار ماہ کے بیٹے قنداقی قیوم کے ساتھ کوٹ لکھپت جیل میں نظر بند کیا گیا تو بھٹو شہید میرے خاندان کی قربانیوں سے بڑے متاثر ہوئے۔ میں اُن کے ساتھ 1972ء سے پی پی پی پنجاب کے سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ بھٹو شہید نے جیل میں ہی مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر یہ تحریر بھیجی:

"You and your family have rendered great services for the party. You are in my heart and in my thoughts."

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ترجمہ: ''تم نے اور تمہارے خاندان نے پارٹی کے لیے عظیم قربانیاں دی ہیں۔ تم میرے دل اور دماغ میں ہو۔''

1978ء میں مولانا کوثر نیازی مرحوم نے جنرل ضیاء الحق سے خفیہ رابطے شروع کیے تو بھٹو شہید نے مجھے اُن کی جگہ پی پی پی کا مرکزی سیکریٹری اطلاعات نامزد کر دیا۔ میں ایک سال قید کاٹنے کے بعد رہا ہوا تو سپریم کورٹ راولپنڈی میں بے نظیر بھٹو سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ بے نظیر بھٹو اپنے پاپا کے کیس میں گہری دل چسپی لے رہی تھیں۔ وہ بھٹو شہید اور وکلاء کے درمیان رابطے کی ذمہ داری بھی پوری کر رہی تھیں۔ میں اُن کی ذہانت اور اعلیٰ پایہ کے انسانی و سماجی رویوں سے بڑا متاثر ہوا۔ اُن کے پاپا کو لاہور ہائی کورٹ سے موت کی سزا ہو چکی تھی اور سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت ہو رہی تھی۔ ذہنی دباؤ کے باوجود بے نظیر بھٹو بڑے اعتماد اور پُر جوش انداز میں وکلاء اور پارٹی کے سینئر اراکین سے تبادلۂ خیال کر رہی تھیں۔ مقدمہ کی سماعت ختم ہوئی تو مجھے کہنے لگیں ''نظامی بھائی آپ فلیش مین ہوٹل آ جائیں وہاں سے ہم اکٹھے سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد جائیں گے جو جتوئی ہاؤس میں ہونا تھا۔'' میں فلیش مین ہوٹل پہنچا تو بے نظیر بھٹو نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ اُن کی گاڑی میں اُن کی فرینڈز یاسمین ظفر اور سمعیہ بھی تھیں۔ بے نظیر کے ساتھ سیاسی صورت حال اور مقدمہ قتل کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک بے نظیر نے کہا ''نظامی بھائی پاپا کہتے ہیں کہ میں پنجاب قیوم نظامی کے حوالے کروں گا۔'' بھٹو شہید کا یہ فیصلہ میرے لیے غیر متوقع تھا۔ میرا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا اور میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ یا گورنر بننے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ بھٹو شہید لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے ملک معراج خالد اور حنیف رامے کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ نامزد کر کے لوئر مڈل کلاس سے اپنی محبت اور کمٹ منٹ کا ثبوت فراہم کر چکے تھے۔ میں نے بے نظیر بھٹو سے کہا کہ وہ بھٹو صاحب تک میرے دلی شکریے کے جذبات پہنچا دیں۔ بے نظیر بھٹو نے سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کر کے پارٹی لیڈروں کو متاثر کیا۔

سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل کی سماعت کے دوران مجھے پی پی پی کے ایک جیالے نے سرکاری دستاویزات کی فوٹو اسٹیٹ دیں جو مقدمہ قتل میں ملوث ایف ایس ایف کے انسپکٹروں کے بارے میں تھیں جن میں تحریر تھا کہ انہوں نے چونکہ نواب احمد خاں قصوری کے مقدمہ قتل میں حکومت سے تعاون کیا ہے لہٰذا اُن کو پروموشن دی جاتی ہے۔ میں نے اپنے لیٹر پیڈ پر نوٹ لکھ کر یہ سرکاری دستاویزات بے نظیر بھٹو کے ذریعے بھٹو شہید کو جیل میں بھجوا دیں۔ بے نظیر بھٹو نے مجھے بتایا کہ بھٹو

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شہید نے دستاویزات کے ساتھ منسلک میرا لیٹر موت کی کوٹھڑی میں ہی جلا دیا اور مجھے ہدایت کی کہ میں احتیاط کروں وگرنہ جرنیل مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ بھٹو نے دستاویزات اپنے وکیل یحییٰ بختیار کو بھجوا دیں۔ یحییٰ بختیار نے یہ دستاویزات عدالت میں پیش کی تو جج ششدر رہ گئے۔

بےنظیر بھٹو نے مجھے اور جہانگیر بدر کو ہدایت کی کہ جب تک بھٹو شہید کے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوتا ہم گرفتار نہ ہوں۔ ہم دونوں روپوش رہ کر پارٹی کے لیے کام کرتے رہے۔ بدقسمتی سے جہانگیر بدر دس دن کے بعد ہی گرفتار ہو گئے جبکہ میں ایک سال تک روپوش رہ کر اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس دوران میرا بیگم نصرت بھٹو اور بےنظیر بھٹو سے براہ راست اور بالواسطہ رابطہ قائم رہا۔ میں نے بےنظیر بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ پنجاب کے ہر ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں کارکنوں کے اجتماعات سے خطاب کر کے عوام کو آگاہ کریں کہ جنرل ضیاء الحق بھٹو کی جان کے درپے ہے اور عوام تحریک چلا کر ہی اپنے قائد کی جان بچا سکتے ہیں بےنظیر بھٹو نے میری تجویز بھٹو شہید تک جیل میں پہنچائی۔ انہوں نے تجویز سے اتفاق کیا اور بےنظیر بھٹو کو ہدایت کی کہ وہ پنجاب کے دورے کے دوران فاروق احمد خان لغاری سیکرٹری جنرل پی پی پی اور مجھے اپنے ہمراہ رکھیں۔ مارشل لاء کے خوف کے باوجود بےنظیر نے بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور، راولپنڈی، ملتان، سرگودھا اور بہاولپور کے دورے کئے اور کارکنوں کے اجتماعات سے جرأت مندانہ خطاب کر کے پارٹی کارکنوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ اگر پارٹی کے صف اوّل کے لیڈر بے وفائی نہ کرتے اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بےنظیر بھٹو کا ساتھ دیتے تو جنرل ضیاء الحق کبھی بھٹو کو پھانسی دینے میں کامیاب نہ ہوتے۔ بھٹو شہید نے جیل میں اپنی آخری کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' تحریر کی۔ بےنظیر نے مجھے کہا کہ یہ کتاب اپنے پریس میں شائع کرا دوں۔ میں نے اُن کو بتایا کہ ہمارے پریس میں کام کرنے والوں نے مولانا مودودی کی تصویر لگا رکھی ہے اس لیے مخبری کا خطرہ ہوگا۔ بےنظیر نے مجھ سے اتفاق کیا۔

بھٹو کی شہادت کے بعد پہلی برسی کے موقع پر میں لاڑکانہ گیا۔ المرتضیٰ لاڑکانہ میں سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ المرتضیٰ کے لان میں ہزاروں کارکن جمع تھے۔ میں نے بےنظیر بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ باہر نکل کر کارکنوں سے مختصر خطاب کریں۔ انہوں نے میرے مشورے پر عمل کیا کارکن اپنی قائد کی جھلک دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پُرجوش نعرے لگاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ بےنظیر پارٹی کے مفاد میں دیئے گئے مشوروں پر عمل کرتی تھیں۔ اسی دوران فوج کے پنجابی جوان اور افسر سفید کپڑوں میں بےنظیر سے اظہار تعزیت کے لیے المرتضیٰ آئے۔ جب وہ ملاقات کر کے باہر نکلے تو بےنظیر بھٹو نے مجھے کہا کہ میں ان فوجی جوانوں سے بات کروں کہ جنرل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دے کر فوج کے ادارے کو نقصان پہنچایا ہے۔ بےنظیر انتہائی ذہین تھیں اور ہر موقع پر اپنے مؤقف کے پرچار کا فن جانتی تھیں۔

1980ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کو فعال اور متحرک بنانے کے لیے بیگم نصرت بھٹو اور بےنظیر بھٹو نے سرگرم اور پُرجوش کردار ادا کیا۔ اسی دوران جنرل ضیاء الحق نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیراعظم بنانے کے لیے ساز باز شروع کر دی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کی جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی خبریں بھی شائع ہوئیں۔ کراچی میں ہونے والے سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس کے دوران میں نے جتوئی صاحب سے جنرل ضیاء الحق سے اُن کی ملاقات کے بارے میں کمیٹی کو اعتماد میں لینے کی گزارش کی۔ جتوئی صاحب نے تفصیل بتائی۔ اجلاس کے بعد بےنظیر بھٹو نے مجھے کہا ''بیگم صاحبہ اور میں بہت خوش ہیں کہ آپ نے جتوئی صاحب سے ضیاء الحق سے ملاقات کے بارے میں پوچھا کیونکہ ہمارے لیے یہ ممکن نہ تھا۔'' بےنظیر بھٹو اپنے رفقاء کی دل جوئی کرتی رہتی تھیں۔ بےنظیر بھٹو نے پیغام بھیجا کہ قیوم نظامی یا جہانگیر بدر اُن کے پاس کراچی آ جائیں تا کہ پنجاب سے آنے والے کارکنوں کے سلسلے میں اُن کی معاونت کر سکیں۔ میں چونکہ اپنے پبلشنگ ہاؤس گلوب پبلشرز میں کام کرتا تھا لہٰذا جہانگیر بدر کراچی چلے گئے۔

1981ء میں مجھے پاکستان سے جلا وطن ہونا پڑا۔ میں کینیڈا میں تھا اور بےنظیر بھٹو لندن میں جلا وطنی گزار رہی تھیں۔ انہوں نے ٹیلی فون اور خط و کتابت کے ذریعے مجھ سے رابطہ برقرار رکھا۔ پاکستان میں جب بھی کسی پارٹی کارکن کو فوجی عدالت سے سزائے موت یا عمر قید کی سزا ہوتی تو بےنظیر تڑپ اُٹھتیں اور فوری طور پر امریکہ، کینیڈا، برطانیہ اور دوسرے اہم ملکوں میں پارٹی کے عہدے داروں اور حامیوں کو ہدایت کرتیں کہ انسانی حقوق کی تنظیموں سے رابطے کر کے ضیاء الحق کی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے تا کہ اسیر پارٹی کارکن رہا ہو سکیں۔ سندھ کے پارٹی کارکنوں ایاز سومرو اور لالہ اسد کو فوجی عدالتوں نے پھانسی کی سزا سنائی تو بےنظیر بھٹو نے لندن سے مجھے کینیڈا فون کیا اور روتے ہوئے بتایا کہ پارٹی کارکنوں کو سزا ہو گئی ہے اُن کی جان بچانے کے لیے پوری کوشش کی جائے۔ میں امریکہ اور کینیڈا میں پی پی پی کی تنظیموں کا کوآرڈی نیٹر تھا۔ میں نے پارٹی کے نمائندوں کو متحرک کر دیا۔ بےنظیر بھٹو نے ذاتی طور پر اس مہم کی نگرانی کی اور پارٹی کارکنوں کی جانیں بچانے کے لیے پوری کوشش کی مگر سنگ دل آمر پر عالمی تنظیموں کی اپیلوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

میری درخواست پر بےنظیر بھٹو نے کینیڈا کے دورے کا پروگرام ترتیب دیا۔ میں نے اُن کو لندن فون کر کے استفسار کیا کہ وہ اوٹاوہ کینیڈا میں کہاں پر قیام کرنا پسند کریں گی۔ بےنظیر نے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جواب دیا۔ ''میں اپنے بھائی کے گھر پر ٹھہروں گی۔'' میرے لیے اُن کا جواب غیر متوقع تھا کیونکہ اُن کو علم تھا کہ میں کینیڈا میں مہاجر کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور میرا گھر ہرگز اُن کی شان کے مطابق نہ ہوگا۔ اوٹاوہ میں بھٹو شہید کے ایک عاشق منیر شیخ نے بے نظیر بھٹو کو اپنے عالی شان گھر میں ٹھہرانے کی پیش کش کر دی۔ شاہنواز بھٹو کی پُراسرار ناگہانی موت کی وجہ سے بے نظیر بھٹو کو کینیڈا کا دورہ ملتوی کرنا پڑا۔

1985ء میں بے نظیر بھٹو نے امریکہ کا دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران میں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے نیویارک میں پاکستانیوں سے خطاب کیا۔ اس موقع پر میں نے بھی تقریر کی۔ میں نے تقریر ختم کی تو بے نظیر بھٹو نے ایک چٹ مجھے دی جس پر تحریر تھا ''Very Good Speech'' (بہت اچھی تقریر)۔ بے نظیر بھٹو اپنے رفقاء کی حوصلہ افزائی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے انہوں نے ہزاروں افراد کو ذاتی طور پر اپنا گرویدہ بنالیا۔ جب میں کینیڈا واپس جانے لگا تو بے نظیر بھٹو نے میرے بچوں کے لیے چاکلیٹ خرید کر دیئے۔ میں نے بے نظیر بھٹو کی شخصیت سے متاثر ہو کر اپنی چھوٹی بیٹی کا نام بے نظیر رکھ لیا۔

1986ء میں میں بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی سے پہلے لندن منتقل ہو گیا۔ میں نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ وطن واپس آنے کی خواہش کی تو انہوں نے کہا ''نظامی بھائی جنرل ضیاء الحق آپ کو آزاد نہیں چھوڑے گا۔ آپ پارٹی کے لیے بہت کام کر رہے ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ کو کچھ عرصہ لندن میں ہی رہیں۔'' میرا بے نظیر بھٹو سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ برقرار رہا۔

1988ء میں جنرل ضیاء الحق کا طیارہ کریش ہوا تو میں واپس آ گیا۔ پولیس نے مجھے لاہور ایئرپورٹ سے گرفتار کر لیا۔ انتخابی مہم شروع ہو چکی تھی۔ میں صوبائی اسمبلی کا اُمیدوار تھا۔ لاہور ہائی کورٹ نے دس روز کے بعد ضمانت پر رہا کر دیا۔ بے نظیر بھٹو راولپنڈی سے لاہور آ رہی تھیں۔ میں اُن کو بشیر گجر کے گھر مرید کے میں ملا۔ بے نظیر بھٹو مجھے اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ خوشی کے اثرات اُن کے چہرے پر نمایاں تھے۔ کہنے لگیں ''نظامی بھائی آپ سوچ نہیں سکتے کہ مجھے آپ کی وطن واپسی کی کتنی خوشی ہوئی ہے۔'' بے نظیر بھٹو نے لاہور پہنچ کر ریلوے اسٹیڈیم میں عوام سے خطاب کیا اور اپنے خطاب کے دوران کہا کہ اگر نواز شریف کے دو بھائی ہیں تو میرے بھی لاہور میں جہانگیر بدر اور قیوم نظامی دو بھائی ہیں۔

1988ء کے انتخابات کے بعد بے نظیر بھٹو نے خواتین کی مخصوص نشستوں کے لیے درخواستیں طلب کیں۔ پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ میں بے نظیر نے حیران ہو کر مجھے پوچھا کہ ''بیگم نظامی نے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پارٹی ٹکٹ کے لیے درخواست کیوں نہیں دی میں تو اُن کو ایم این اے بنانا چاہتی ہوں۔'' میں نے بے نظیر بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ ایک فیملی میں دو پارٹی ٹکٹ نہ دیں۔ بے نظیر بھٹو نے کہا ''نظامی بھائی بیگم نظامی کی اپنی قربانیاں ہیں لہٰذا پارٹی ٹکٹ اُن کا حق بنتا ہے۔'' میں اپنے مؤقف پر قائم رہا۔

اقتدار کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ پہلی خاتون وزیراعظم بننے کے بعد بے نظیر بھٹو نے مجھے وزیراعظم کا او ایس ڈی یا وزارت اطلاعات میں ایڈوائزر تعینات کرنے کی پیش کش کی۔ میں چونکہ پارٹی کا مرکزی سیکریٹری اطلاعات تھا لہٰذا میں نے یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت کی بجائے پارٹی میں سرگرم کردار ادا کرتا رہا۔ میں نے بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے بیس ماہ کے بعد ایک کتاب تحریر کی جسے روزنامہ ''پاکستان'' نے شائع کیا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے کتاب کی مارکیٹنگ کے لیے اشتہار میں ''ناہید خان ڈپٹی پرائم منسٹر بن چکی ہیں'' کی سرخی لگا دی حالانکہ کتاب کے اندر یہ جملہ نہیں تھا۔ ناہید خان وزیراعظم کی پولیٹیکل سیکرٹری کے طور پر فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ناہید خان نے وزیراعظم سے میری شکایت کی۔ بے نظیر بھٹو نے مجھے فون کیا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ کتاب کے اندر ایسے ریمارکس نہیں ہیں اور پبلشر نے مارکیٹنگ کے لیے سرخی لگا دی ہے۔ بے نظیر بھٹو نے میری وضاحت کو تسلیم کر لیا اور کہا کہ ''یہ معاملہ ناہید خان اور آپ کے درمیان ہے۔'' بے نظیر بھٹو پارٹی معاملات میں فریق بننے کی بجائے غیر جانب دار رہتی تھیں۔

میں نے 1992ء میں محسوس کیا کہ گزشتہ پندرہ سال سے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے عہدے پر کام کر رہا ہوں پارٹی کے مفاد میں عہدہ اب کسی اور شخص کے سپرد ہونا چاہیے۔ میں نے بے نظیر بھٹو کو استعفیٰ پیش کیا تو وہ حیران رہ گئیں اور کہنے لگیں ''میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا اور آپ نے خود ہی یہ منصب چھوڑ دیا ہے۔'' انہوں نے مجھے اپنا سیاسی مشیر اور پی پی پی کے مرکزی سیکرٹریٹ لاہور کا انچارج نامزد کر دیا۔

1993ء میں میاں نواز شریف کی حکومت کے خاتمے کے بعد ایک نگران حکومت تشکیل پائی۔ سردار بلخ شیر مزاری نگران وزیراعظم نامزد ہوئے۔ بے نظیر بھٹو نے پارٹی کے لوگوں کو نگران کابینہ میں شمولیت کے لیے نامزد کیا۔ انہوں نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ میں نے اُن کے نام ایک احتجاجی خط فیکس کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اُن کا فون آ گیا انہوں نے کہا ''آپ ناراض نہ ہوں میں نے آپ کا نام کابینہ میں شامل کرا دیا ہے۔'' بے نظیر بھٹو اپنے رفقاء کی ناراضگی کا نوٹس لیتی تھیں۔

1996ء میں بے نظیر بھٹو میرے والد کی وفات کی تعزیت کے لیے میرے گھر تشریف لائیں۔ پنجاب کے گورنر جنرل سروپ خان، حامد ناصر چٹھہ، جہانگیر بدر، ناہید خان اور پارٹی کے دوسرے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

راہ نما اُن کے ہمراہ تھے۔ بے نظیر بھٹو نے میرے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی کہا ''نظامی صاحب میری پارٹی کے دیانت دار لیڈر ہیں اُن کو صوبائی محتسب نامزد کیا جائے۔'' بے نظیر بھٹو کافی دیر تک میرے گھر پر تشریف فرما رہیں۔ میں نے اُن کی تواضع کے لیے چائے کے ساتھ چاکلیٹ رکھے ہوئے تھے۔ حامد ناصر چٹھہ میرے سیاسی پس منظر سے واقف نہیں تھے۔ پوچھنے لگے ''نظامی صاحب آپ کو کیسے پتہ ہے کہ بی بی کو چاکلیٹ پسند ہیں۔'' میں نے جواب دیا ''چٹھہ صاحب میرا بی بی سے بہت پرانا سیاسی تعلق ہے۔'' صوبائی محتسب کے لیے ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس کی شرط تھی لہٰذا میں صوبائی محتسب تو نہ بن سکا البتہ 1996ء کے آخر میں بے نظیر بھٹو نے مجھے متروکہ وقف املاک بورڈ کا چیئرمین نامزد کر دیا۔

بے نظیر بھٹو کی جلاوطنی کے دوران میرا اُن سے مسلسل رابطہ رہا۔ انہوں نے میری ذمہ داری لگائی کہ اُن کو اُردو پریس کی انگریزی سمری تیار کر کے بذریعہ ای میل روانہ کروں۔ میں یہ ذمہ داری 2000ء سے 2007ء تک ایمان داری اور جذبے کے ساتھ پوری کرتا رہا۔ میں اُردو کے تمام اہم قومی اخبارات کے کالموں کا مطالعہ کرتا۔ اُن کے اہم نکات کا ترجمہ کر کے اپنے ہاتھ سے کمپیوٹر پر کمپوز کرتا اور بے نظیر بھٹو کو ای میل کرتا۔ وہ ان رپورٹوں میں گہری دل چسپی لیتیں اور کالموں میں درج تنقید کا جواب ای میل کے ذریعے واپس بھیجتیں۔ منور انجم بے نظیر بھٹو کے جوابات اُردو پریس میں شائع کراتے اور کالم نویسوں سے رابطے کرتے۔ میری اخباری رپورٹوں کی وجہ سے بے نظیر بھٹو پاکستان کی سیاسی صورت حال اور عوام کی سوچ سے آگاہ رہتیں۔ میں گاہے بگاہے پارٹی اُمور اور قومی مسائل کے بارے میں اُن کو مشورے بھی دیتا رہتا۔ وہ میری ہر ای میل کا جواب دیتیں۔ بے نظیر بھٹو روزانہ کمپیوٹر پر تین سو کے لگ بھگ ای میلز کا خود جواب دیتیں اس طرح انہوں نے جلا وطن رہ کر بھی پی پی پی کو متحرک رکھا اور پاکستانی سیاست میں مرکزی کردار کی حامل رہیں۔ 2003ء میں جہانگیر بدر بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر کے پاکستان واپس آئے تو انہوں نے مجھے بتایا ''بی بی کہتی ہیں کہ جتنا کام نظامی صاحب میرے لیے کر رہے ہیں اتنا میری میڈیا ٹیم نہیں کر رہی جس پر لاکھوں روپے ماہانہ خرچ ہو رہے ہیں۔'' بے نظیر بھٹو جذبے سے کام کرنے والے پارٹی کارکنوں کی غائبانہ بھی تعریف کرتی تھیں۔

2008ء کے انتخابات میں پی پی پی نے خواتین کی مخصوص نشستوں کے لیے درخواستیں طلب کیں۔ میری بیگم نے درخواست دینے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے بے نظیر بھٹو کو ای میل ارسال کی ''آپ میری لیڈر ہیں میری آپ سے طویل سیاسی رفاقت ہے لہٰذا میں آپ سے راہ نمائی چاہتا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہوں میری بیگم پی پی پی کے ٹکٹ کے لیے درخواست دینا چاہتی ہے۔ مجھے فکر ہے کہ اگر اس کو پارٹی ٹکٹ مل گیا تو میرے سینیٹ ٹکٹ کے امکانات کم نہ ہو جائیں آپ براہ کرم راہ نمائی فرمائیں۔'' بے نظیر بھٹو نے جواب دیا ''مائی ڈیئر نظامی صاحب آپ نے مجھ سے سینیٹ ٹکٹ کے بارے میں راہ نمائی طلب کی ہے آپ نے پارٹی کی بڑی خدمت کی ہے۔ میری خواہش ہو گی کہ آپ کو پارٹی ٹکٹ دوں مگر اس وقت میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ سینیٹ کے لیے اُمیدوار کتنے ہوں گے اور پارلیمانی بورڈ کی رائے کیا ہو گی۔ میں پھر کہتی ہوں کہ آپ کو اکاموڈیٹ کرنا چاہوں گی۔ اب آپ فیصلہ خود کر لیں۔'' بے نظیر بھٹو نے میری بیگم کشور قیوم کو پنجاب اسمبلی کی خصوصی نشست کے لیے پارٹی ٹکٹ دے دیا اور پنجاب کی لسٹ میں اس کا نام تیسرے نمبر پر رکھا گیا۔ شہید بی بی سے میرا ای میل رابطہ 27 دسمبر 2007ء تک رہا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''بھٹوز اور ہمارا ملک''

عباس اطہر

ایک عام تاثر یہ ہے کہ جاگیردار بنیادی طور پر اتنے بہادر نہیں ہوتے کہ موت سامنے کھڑی ہو اور وہ راستہ بدلنے کے بجائے سیدھے اس سے ٹکرا جائیں۔ سرشاہنواز بھٹو کی اولاد میں سے ذوالفقار علی بھٹو، اپنے سوتیلے اور بڑے بھائیوں سے بالکل مختلف شخصیت کے حامل تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ایسی ماں کے بیٹے تھے۔ جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جاگیردار خاندان میں انہیں وہ عزت کبھی نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس رویے نے بھٹو صاحب کی شخصیت کے اس رُخ کو پروان چڑھایا جو بغاوت اور مزاحمت سے عبارت تھا۔ 1970ء کا الیکشن جیتنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے، آنکھوں میں آنسو بھر کر بھٹو صاحب نے کہا ''ہر کوئی میرے والد کا حوالہ دیتا ہے جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں ایک غریب ماں کا بھی بیٹا ہوں۔ میں جاگیردارانہ سماج کے ظالمانہ نظام کردار سے آگاہ ہوں بلکہ میں خود ایک وقت تک جاگیردارانہ استحصال کا نشانہ بنتا رہا ہوں۔''

بھٹو صاحب نے اپنی تصنیف ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو یوں ہے:

> ''1935ء میں جب میری عمر سات برس تھی میرے والد اس وقت بمبئی کی حکومت میں وزیر تھے۔ ایک دن بمبئی کے گورنر لارڈ برابورن نے میرے والد کو تینوں بیٹوں کے ہمراہ چائے کی دعوت پر بلایا۔ جب میرے بڑے بھائی امداد علی جن کی عمر 21 برس تھی کا تعارف ہو چکا تو گورنر نے بھائی کے بارے میں کہا ''کتنا خوبصورت اور جوان آدمی ہے۔'' امداد علی نے ایک تربیت یافتہ ارسٹوکریٹ ہوتے ہوئے جواب دیا ''میں اپنے آپ کو بہت مسرور اور مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ میری تعریف

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

> ہمارے خوبصورت گورنر نے کی ہے۔'' جب میری باری آئی تو میں نے باریک آواز میں کہا ''ہز ایکسی لینسی گورنر اس لیے خوبصورت ہیں کیونکہ وہ ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پلتے ہیں۔'' لارڈ برابورن اس جواب پر ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے تک وہ حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا اور پھر میرے والد سے کہنے لگا اور اس میں شاہنواز آپ کو ایک شاعر اور انقلابی ملا ہے۔ یہی کچھ ہے جو میں ان سارے برسوں میں رہا ہوں ''ایک شاعر اور ایک انقلابی'' اور جب تک میرے جسم میں سے آخری سانس نہیں نکل جاتی میں یہی رہوں گا۔ واپسی پر میرے والد نے کہا ''سائیں وہ بات وہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا ''یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے۔''

بھٹو کے کلاس فیلو اور قریبی دوست پیلو مودی نے اپنی کتاب ''زلفی مائی فرینڈ'' میں لکھا ہے۔ ''زلفی جناح کا پکا پیروکار تھا۔ دوقومی نظریے کی وکالت کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ مسلمان پاکستان کے بغیر اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتے۔'' پاکستان بننے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سے محترمہ بے نظیر تک بھٹوز (مرتضیٰ بھٹو سمیت) اسی ضد پر قائم رہ کر لڑتے لڑتے مارے گئے کہ ''یہ ہمارا ملک ہے۔'' ایوب خان کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو نے پہلے وزیر معدنیات اور پھر وزیر خارجہ کے طور پر پاکستان کو امریکہ کے مکمل شکنجے سے نکال کر چین کی طرف راستہ بنایا۔ کشمیر کے لیے پاکستان کی جنگ کو ''ہم ہزار سال تک لڑیں گے'' کا عنوان دیا۔ ملک ٹوٹنے کے بعد انہوں نے مغربی پاکستان کو ''نئے پاکستان'' کے طور پر دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ وہ امریکہ کی ایما سے اقتدار میں آئے تھے لیکن اسلامی کانفرنس اور ایٹمی پروگرام شروع کرنے جیسے اقدامات کر کے ''واجب القتل'' ٹھہرے۔ سزائے موت سننے کے بعد وہ چند سطری معافی نامہ لکھ کر سیاست سے دست برداری کا اعلان کر دیتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن ہار ماننے کے بجائے انہوں نے پھانسی قبول کر لی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو باپ اور ماں دونوں کی طرف سے جنگ جوئی کا جذبہ ملا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو نے ایوب دور میں اپنے خاوند کی گرفتاری کے بعد سڑکوں پر نکل کر لڑائی لڑی اور ضیاء دور میں سر پر لاٹھیاں کھا کر لہولہان ہونے کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا۔ باپ کی پھانسی کے بعد محترمہ بے نظیر

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اسٹیبلشمنٹ کی سختیاں اور جیلیں کاٹ کر ملک سے باہر چلی گئی تھیں لیکن جنرل ضیاء کی زندگی میں ہی 10 اپریل 1986ء کو واپس لوٹیں۔ دو مرتبہ اقتدار میں آئیں۔ دوسری وزارت عظمیٰ کے دوران اپنے بھائی مرتضیٰ کو قتل ہوتے دیکھا۔ ساتھ ہی اقتدار سے نکال دی گئیں اور پھر انہیں مقدمات کے ایک طویل سلسلے میں اُلجھا دیا گیا۔ انہیں ایک بار پھر وطن چھوڑنا پڑا۔

گزشتہ روز لندن کی ایک غائبانہ نماز جنازہ کی ٹی وی کوریج میں، میں نے اپنے ایک دوست اور برطانیہ میں پیپلز پارٹی کے عہدیدار ریاض خان کو زاروقطار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج اظہار تعزیت کے لیے انہیں فون کیا تو وہ رو رو کر یہ بتا رہے تھے کہ لندن اور پھر دبئی میں، وہ اور اُن کے بہت سے ساتھی محترمہ کے پاؤں پکڑ پکڑ کر یہ فریاد کرتے رہے کہ ''وہ پاکستان کو بھول جائیں، انہیں قتل کردیا جائے گا۔'' لیکن وہ موت کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تلی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آصف زرداری اور بچوں نے بھی انہیں روکا ہوگا لیکن یہ بھٹوز موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑ جانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ محترمہ کو موت کا خوف ہوتا تو وہ باپ کی پھانسی کے بعد بھول جاتیں کہ یہ ''ہمارا ملک'' ہے۔ وہ اپنی جنگ جویانہ فطرت سے مجبور نہ ہوتیں تو 18 اکتوبر کے بم دھماکوں کے بعد کراچی، لاڑکانہ یا دبئی کی چاردیواریوں میں محدود ہو جاتیں اور پارٹی قیادت کو الیکشن لڑنے دیتیں لیکن وہ تو باقاعدہ وصیت لکھ کر اور اپنی قبر کی جگہ کی نشاندہی کر کے جنگ پر نکلی تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ جلسہ ختم ہونے کے بعد گاڑی کی ''سن روف'' ہٹا کر کھڑی نہ ہوتیں تو اس خاص وقت پر گولی یا گولیوں سے بچ سکتی تھیں لیکن قاتل جو بھی تھے، وہ تو مسلسل اُن کے پیچھے لگے ہوئے تھے، واقعہ لیاقت باغ میں نہ ہوتا تو پنجاب کے کسی اور شہر میں ہو جاتا کیونکہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ سانحہ پنجاب کے کھاتے میں ڈالنا مقصود تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو یا محترمہ بے نظیر، دونوں اس خطے کی نئی جغرافیائی تقسیم کے عالمی منصوبے میں کبھی حصہ دار نہیں بن سکتے تھے۔ نہ ہی وہ پاکستان کو مزید توڑنے کی خواہش مند طاقتوں کے آلہ کار بننے پر تیار تھے۔ بھٹو صاحب امریکہ سے مغربی پاکستان کے تحفظ کی ضمانت لے کر برسر اقتدار آئے تھے پھر ایٹمی پروگرام پر امریکہ سے لڑ گئے۔ محترمہ بے نظیر 1986ء میں بھی امریکہ سے اپنی جان کا تحفظ لے کر پاکستان واپس آئیں اور اس مرتبہ بھی امریکہ اور برطانیہ ہی اُن کی خیریت کے ذمہ دار بنے تھے۔ دو مرتبہ اقتدار میں رہنے کے دوران خدا جانے وہ امریکہ کے کون سے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہوئیں کہ انہیں 9 سال کے لیے دربدر کردیا گیا۔ امریکہ کے ساتھ بھٹوز کا محبت اور نفرت کا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

عجیب سا رشتہ تھا۔ وہ انہیں اپنے ناگزیر ہونے کا قائل بھی کر لیتے تھے لیکن اقتدار میں آ کر یہ ''ہمارا ملک ہے'' والا ایجنڈا نکال کر بیٹھ جاتے تھے اور پھر کام خراب ہو جاتا تھا۔ اسی طرح کا معاملہ میاں نواز شریف کا ہے۔ وہ اپنے ملک کے مفاد کو ایک طرف رکھ کر امریکیوں کی بات نہیں مانتے۔ 9/11 برپا ہونے پر دونوں میں جو بھی اقتدار میں ہوتا، وہ یقیناً امریکہ کی ایسی شرائط کو تسلیم نہ کرتا جن کے بارے میں امریکی خود بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسترد کر دی جائیں گی۔ ''یس مین'' نہ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں لیڈر ہماری اسٹیبلشمنٹ کو بھی ہضم نہیں ہوتے۔

1996ء میں جب یہ طے ہو چکا تھا کہ محترمہ بے نظیر کو اقتدار اور سیاست سے ہمیشہ کے لیے رخصت کرنا ہے تو میر مرتضیٰ بھٹو کو جو اُس وقت متبادل قیادت بن سکتے تھے، قتل کرا دیا گیا۔ ذمہ دار کون تھا۔ آج تک یہ تعین نہیں ہو سکا لیکن کوئی نہ کوئی بین الاقوامی اور قومی مافیا بھٹوز کو ملیا میٹ کر کے سندھ کے قوم پرستوں کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی سازش ہے تو اس کا تعلق ان نقشوں سے جوڑنے میں کوئی ہرج نہیں۔ جو اس خطے کی تقسیم نو پر مبنی ہیں اور علانیہ منظر عام پر لائے جا چکے ہیں۔

یہ سوال اپنی جگہ معنی خیز ہے کہ وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے محترمہ کی شہادت کے بعد کبھی اچانک دل بند ہونے اور کبھی کنپٹی پر لیور لگنے کی تھیوریاں کیوں پیش کیں جنہیں نجی ٹی وی چینلوں نے گولی چلانے کے مناظر دکھا کر ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ اس سانحہ کی سنگینی کم کرنا مقصود تھی تو بڑی آسانی سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ خدا کو یہی منظور تھا یا ہمارے اس عقیدے کا حوالہ دیا جا سکتا تھا کہ موت کا دن مقرر ہے اور اس سے بچا نہیں جا سکتا۔ سامنے نظر آنے والی چیزوں کو کنفیوژ کرنے کا خدا جانے کیا مقصد ہے۔ صرف یہی کیا جا سکتا ہے۔ اُمور مملکت خویش خسرواں دانند (اپنی مملکتوں کے معاملات اُن کے حکمران ہی بہتر جانتے ہیں)

محترمہ بے نظیر کی وصیت سامنے آنے سے پہلے ان کی جانشینی کے معاملے کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی اور ابھی تک جاری ہے۔ یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ یہ پارٹی، جو وفاق کی علامت ہے، مختلف حصوں میں بٹ جائے لیکن اس معاملے کو زیر بحث لانے سے پہلے میں جانشینی کے حوالے سے کچھ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اُن کا سیاسی ورثہ اندرا گاندھی کو منتقل ہوا۔ وہ قتل ہوئیں تو اُن کے بیٹے سنجے گاندھی حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے راجیو گاندھی کو جو ائرلائن پائلٹ تھے اور جن کا سیاست سے تعلق نہیں تھا۔ اپنے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جانشین کے طور پر سامنے لا چکی تھیں۔ اندرا کا سیاسی ورثہ راجیو کو منتقل ہوا۔ پھر راجیو بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ سنجے اور راجیو دونوں نہرو خاندان کے نہیں فیروز گاندھی کے بیٹے تھے۔ جو اپنی زندگی میں ہی اندرا گاندھی سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ کانگریس نے راجیو گاندھی کو نہرو خاندان کا تسلسل تسلیم کیا اور پھر یہ وراثت اطالوی نژاد سونیا گاندھی کو منتقل ہو گئی، جہاں سے یقیناً راجیو کی اولاد کو منتقل ہو گی۔ سیاسی ورثے کسی قانون وراثت کے تحت تقسیم نہیں ہوتے۔ عوامی جماعتوں اور عوام کے جذبات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ کانگریس سونیا گاندھی کی قیادت میں اقتدار میں واپس آئی، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوامی جذبے وراثت کے اُصول خود وضع کرتے ہیں اور سیاست میں جانیں دینے والوں کے وارثوں یا جانشینوں کا انتخاب جذباتی وابستگیوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ فلپائن کی فوج نے مسٹر اکینو کو ائر پورٹ پر قتل کر دیا تھا۔ فلپائنی عوام نے اُن کی غیر سیاسی بیوی کوری اکینو کو اپنا لیڈر چن لیا۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل ضیاء الرحمٰن کی سیاسی وراثت بالترتیب بیگم حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیاء کو منتقل ہوئی حالانکہ دونوں کا اپنی اپنی پارٹیوں میں کوئی مقام تھا نہ انہوں نے پہلے کبھی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ سری لنکا میں وزیراعظم بندرانائیکے کے قتل کے بعد اُن کی بیٹی سیاسی وارث بنی۔ انڈونیشیا میں صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر انہیں نظر بند کر دیا گیا تھا اسی حالت میں وہ دنیا سے رُخصت ہو گئے لیکن سہارتو کے تین عشروں کے اقتدار کے بعد انڈونیشیا کے عوام اُن کی بیٹی سوئیکارنو پتری کو اقتدار میں لے آئے۔ برما میں آنگ سانگ سوچی اپنے والد کی سیاسی وارث ہیں اور ظلم کا مقابلہ کیے جارہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ نوبل انعام پا چکی ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں خان عبدالولی خان کا سیاسی ورثہ اسفندیار ولی کو، عبدالصمد اچکزئی کا محمود اچکزئی کو، اکبر بگٹی کا طلال بگٹی کو، عطاء اللہ مینگل کا اختر مینگل کو اور چودھری ظہور الٰہی کا چودھری پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت حسین کو منتقل ہوا۔ اسی طرح ہمارے بابائے جمہوریت کے سیاسی وارث اُن کے صاحبزادے منصور علی خان ہیں۔

وراثتی سیاست ہمارے خطے میں کوئی نئی بات نہیں، بیویاں اور بیٹے موجود ہوں تو براہ راست اُن کو منتقل ہو جاتی ہے اور بیٹیوں کی صورت میں وہ اُن کی اولاد کی طرف چلی جاتی ہے۔ محترمہ بے نظیر کی شہادت تک پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کی وراثت تھی۔ جسے بے نظیر صاحبہ نے 1979ء میں بیگم نصرت بھٹو کے سائے میں سنبھالا اور پھر بلاشرکت غیرے اپنے دائرہ اختیار میں کر لیا۔ مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے بعد بھی یہ وراثت تقسیم ہو کر بھٹو کے بیٹے کی طرف نہیں گئی۔ مرتضیٰ کے قتل کے بعد غنویٰ بھٹو نے محترمہ اور زرداری کو بالواسطہ طور پر قتل کا ملزم قرار دے کر بھٹو کی سیاسی وراثت کی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

طرف راستہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اُن کی صاحبزادی فاطمہ بھٹو اپنے مضامین میں بے نظیر صاحبہ کو مسلسل ہدف ملامت بھی بناتی رہیں لیکن اب سانحہ لیاقت باغ پر غنویٰ بھٹو نے بلاول کی بھٹو قبیلے میں شمولیت اور چیئرمین پارٹی بننے پر اعتراض ختم کر دیا ہے۔ اُن کے بچے بھی پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہے، رہے ممتاز بھٹو تو وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے کھلے مخالف ہیں اور اس خاندان میں شمار ہی نہیں ہوتے جو ذوالفقار علی بھٹو سے آگے چلا اور محترمہ بے نظیر سے گزرتا ہوا آصف زرداری اور بلاول بھٹو زرداری تک پہنچا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا ورثہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو منتقل ہوا تھا۔ حالات بہت بُرے تھے لیکن پیپلز پارٹی کی اصل طاقت قائم رہی۔ تقریباً 28 سال کے عرصے میں محترمہ کو تقریباً 4 سال کا اقتدار ملا۔ اس کے باوجود پیپلز پارٹی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بھٹو صاحب کے دور کے بڑے بڑے نام عبدالحفیظ پیرزادہ، ڈاکٹر مبشر حسن، غلام مصطفیٰ جتوئی، آفتاب احمد شیر پاؤ، فاروق لغاری (صدارت حاصل کر کے بے نظیر حکومت توڑنے کے بعد) غلام مصطفیٰ کھر (کبھی راضی ہوئے، کبھی ناراض ہوئے) اور دوسرے چند لیڈر محترمہ کے ''انکل شکن'' رویے کی وجہ سے پارٹی چھوڑ گئے۔ مرتضیٰ بھٹو کی اہلیہ غنویٰ بھٹو سمیت پیپلز پارٹی کے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی بنے۔ لیکن 2002ء کے الیکشن تک بھی صورت حال یہ تھی کہ پیپلز پارٹی سب سے زیادہ ووٹ لے گئی۔ نشستوں کی تعداد بھی اتنی تھی کہ راؤ سکندر اقبال کی قیادت میں ایک بڑا گروپ فلور کراس نہ کرتا تو میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت نہ بن سکتی۔

ہر بحران میں بھٹو فیکٹر پارٹی کا سہارا بنتا رہا۔ محترمہ بے نظیر کی شہادت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بھٹو فیکٹر کس طرح قائم رکھا جائے۔ مرتضیٰ بھٹو کا خاندان پہلے ہی الگ ہو چکا تھا۔ صنم بھٹو صاحبہ نے کبھی اپنی ذاتی زندگی پر سیاست کو ترجیح نہیں دی۔ ممتاز بھٹو یا کوئی بھی دوسرا بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے خاندان سے ایسا کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ سیاسی وراثت پر دعویٰ کر سکے۔ صورت حال کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ 20 سالہ جدوجہد کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کا سیاسی ورثہ محترمہ بے نظیر کی ذات میں اس طرح مدغم ہو چکا تھا کہ کوئی دوئی نہ رہی تھی۔ قانون وراثت سیاسی وارثوں پر لاگو نہیں ہوتا لیکن اس کے مطابق بھی محترمہ بے نظیر کی وراثت ان کے بیٹے، دونوں بیٹیوں اور خاوند کے سوا کسی کے پاس نہیں جاتی۔

محترمہ نے اپنی وصیت میں آصف زرداری کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آصف زرداری حکومتوں اور اپوزیشن کے ادوار میں محترمہ بےنظیر کے ہر سیاسی عمل اور راز میں شریک رہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران زرداری صاحب نے وہاں کے حکمران حلقوں میں ایک مؤثر لابی بنائی جو محترمہ کی وطن واپسی کی بنیاد بنی۔ برطانیہ میں رحمان ملک نے بےنظیر صاحبہ کی قبولیت کا راستہ ہموار کیا۔ یہ بین الاقوامی جوڑ توڑ بنیادی طور پر آصف زرداری کے ''کمال فن'' کا نتیجہ تھا۔ جو کارگر ثابت ہوا۔

آصف زرداری نے مجموعی طور پر 8 سال جیل کاٹی۔ اس طویل قید میں انہوں نے بہت کچھ پڑھا اور سیکھا۔ جیل کے اندر رہتے ہوئے ، 2002ء کے انتخابات کے بعد امین فہیم کو وزیراعظم بنانے کی پیش کش اور بعد میں صدر مشرف کے ساتھ مفاہمت کے بالواسطہ مذاکرات میں بھی آصف زرداری کو بنیادی کردار حاصل رہا اور صدر مشرف کے بعض اہم مشیر جیل میں جا کر اُن سے بات چیت کرتے تھے۔

اگر موجودہ پیپلز پارٹی کی رگ رگ سے کوئی واقف ہے تو وہ صرف آصف زرداری ہیں اور پارٹی کی قیادت انہی کے پاس جانی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے بلاول زرداری کا نام تبدیل کر کے انہیں پارٹی چیئرمین نامزد کرا دیا اور خود شریک چیئرمین کا عہدہ سنبھال کر آئندہ وزیراعظم کے لیے مخدوم امین فہیم کو اُمیدوار نامزد کر دیا۔

ہمارے ملک کی ایک رسم ہے کہ جب لڑکے والے لڑکی کا رشتہ مانگنے جاتے ہیں تو گزارش یوں کی جاتی ہے کہ آپ ہمارے بیٹے کو اپنی ''فرزندی'' میں قبول کرلیں۔ بڑی بہنوں کے خاوند عام طور پر خاندان میں بھائیوں سے برتر سمجھے جاتے ہیں اور ان کے سسرالی خاندان انہیں معتبر اور بڑا تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی یہ بات لکھی تھی کہ 27 دسمبر کو محترمہ بےنظیر کے جس سیاسی ورثے کا سوال اُٹھا، اس میں بھٹو صاحب کے خون کے ساتھ محترمہ کا تازہ خون بھی شامل تھا اور یہ ورثہ محترمہ کے خاندان کو ہی جانا چاہیے تھا۔ جس اُصول کی بنیاد پر راجیو گاندھی کا ورثہ سونیا گاندھی کو منتقل ہوا، اسی اُصول کے حوالے سے محترمہ کے بچے کم عمر ہونے کی وجہ سے آصف زرداری کے اس سیاسی ورثے کے مالک بنتے تھے۔ سیدھے الفاظ میں اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ''حق بہ حقدار رسید''۔

پیپلز پارٹی کی نئی قیادت کے فیصلے سنٹرل کمیٹی نے متفقہ طور پر کیے ہیں۔ الیکشن ملتوی ہونے کے باوجود سر پر ہے اس لیے پارٹی میں کسی پھوٹ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ آصف زرداری بلوچ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سندھی ہیں۔ وہ روانی سے اُردو بولتے ہیں، انگریزی زبان انگریزوں جتنی جانتے ہیں۔ سندھی ان کی مادری زبان ہے اور پنجابیوں سے زیادہ ٹھیٹھ پنجابی بول لیتے ہیں۔ تدفین کے بعد اپنی پریس کانفرنس میں انہوں نے بھٹوز کے متحدہ پاکستان سے متعلق نظریے پر اپنے ایمان کا اظہار یوں کیا تھا کہ پنجاب کی وکالت کرتے ہوئے اس حد تک آگے گئے کہ یہ بھی کہہ دیا کہ محترمہ بےنظیر کی حفاظت کرتے ہوئے جن نوجوانوں نے اپنی جانیں قربان کیں وہ سارے کے سارے ایسے پنجابی نوجوان تھے جن کو انہوں نے پنجاب کی جیلوں میں اپنی قید کے دوران دوست بنایا تھا۔

آصف زرداری ذاتی طور پر ایک بہادر آدمی ہیں۔ انہوں نے طویل قید کاٹی لیکن اپنی رہائی کے لیے محترمہ بےنظیر بھٹو کو کسی ایسی مفاہمت پر مجبور نہیں کیا جو پیپلز پارٹی کی سیاست کو درہم برہم کر سکتی ہو یا انہیں ہمیشہ کے لیے سیاسی میدان سے باہر کر سکتی۔ بھٹوز کی طرح آصف زرداری ایک جنگ جو انسان ہیں اور میدان میں کھڑا ہو کر لڑنا جانتے ہیں۔ سانحہ لیاقت باغ کے بعد انہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ اتنے بڑے سانحے کے نتیجے میں ٹوٹنے کے بجائے مزید مضبوط ہو کر اُبھرے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ایک نسل کا دور تمام ہوا لیکن ''نئے بھٹوز'' نے اُن کا علم زمین پر نہیں گرنے دیا۔ یہ علم بلاول بھٹو زرداری کے سیاست میں آنے تک آصف علی زرداری کے ہاتھ میں آیا ہے اور کئی سال بعد سہی لیکن بالآخر محترمہ بےنظیر بھٹو کی اولاد کو منتقل ہوگا۔ پچھلے 28 سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بھٹوز سیاسی طور پر فنا نہ کیے جاسکیں تو جسمانی طور پر ملیا میٹ کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ''نئے بھٹوز'' نے اس یقین کی بنیاد پر یہ چیلنج قبول کیا ہے کہ

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

الوداع بے نظیر

ارشاد احمد حقانی

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی شہید بیٹی بے نظیر بھٹو جب دو ماہ نو دن پہلے وطن واپس آئیں تو اُن کی سلامتی کے بارے میں سخت خدشات پائے جاتے تھے۔ دوسروں سے بڑھ کر خود انہیں ان خطرات کا احساس تھا لیکن انہوں نے اپریل 1979ء میں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو سے جیل میں آخری ملاقات کے وقت جو وعدہ کیا تھا: ''بابا! میں آپ کے مشن کو آگے لے کر چلوں گی۔'' اس وعدے کی لاج رکھنے کے لیے انہوں نے ہر طرف سے ظاہر کیے جانے والے خطرات اور خدشات کو پس پشت ڈالتے ہوئے 8 جنوری 2008ء کے انتخابات کی مہم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کی پہلی ہی عوامی ریلی میں خوفناک بم دھماکے ہوئے جن میں ڈیڑھ سو کے قریب لوگ شہید اور کئی سو زخمی ہوئے جبکہ محترمہ خوش قسمتی سے محفوظ رہیں۔ اُس وقت بہت سے لوگوں نے جن میں اُن کے دوست اور دشمن دونوں شامل تھے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب محترمہ کے لیے اپنی پارٹی کی انتخابی مہم زور شور سے چلانا ممکن نہیں ہو سکے گا اور وہ اپنی جان اور ذات کو لاحق خطرات کی وجہ سے پبلک جلسے کر سکیں گی نہ ریلیوں کی قیادت کر سکیں گی لیکن انہوں نے ان اندازوں کو غلط ثابت کر دیا اور جمہوریت، قانون کی حکمرانی، عدل اجتماعی اور ملک کی ترقی کے لیے جو عزم انہوں نے کر رکھا تھا اس کی تکمیل کے لیے وہ بے دھڑک باہر نکل آئیں اور ملک کے چاروں صوبوں میں جلسوں اور ریلیوں سے خطاب کیا اور اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اُمید کی یہ کرن روشن ہونے لگی کہ یہ خدشات بے بنیاد ثابت ہوں گے اور بے نظیر الیکشن میں اپنی پارٹی کی قیادت کر سکیں گی لیکن 27 دسمبر کی شام روشنی کی یہ کرن بجھ گئی اور بے نظیر بھٹو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

بے نظیر بھٹو کے ناقدین اور مخالفین کی بھی کمی نہیں لیکن اُن کے چاہنے والوں اور اُن کے مداحوں کی تعداد اُن کے ناقدین سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ ایک دلیر، جری اور ایک بہادر خاتون تھیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اور اپنی شہادت سے صرف چند روز پہلے انہوں نے کہا تھا کہ گیدڑ کی طرح ڈر کر لمبی عمر حاصل کرنے کے بجائے شیر کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھتے ہوئے جان دینا میرے لیے باعث فخر ہوگا۔ بے نظیر نے 4 اپریل 1979ء کے روز اپنے باپ سے جو وعدہ کیا تھا وہ اس کی لاج رکھنے میں کامیاب رہیں۔ اُس وقت کے ظالموں نے بے نظیر اور اُس کے باپ کو اس آخری ملاقات میں بھی ایک دوسرے کے گلے لگ جانے کی اجازت نہ دی اور سلاخوں کے پیچھے کھڑے باپ کو بے نظیر سوجی ہوئی آنکھوں اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھتی رہی۔ بے نظیر کی المناک شہادت پاکستان کی تاریخ کے بڑے المیوں میں سے ایک ہے۔ پاکستان پہلے ہی کچھ کم مشکلات، مصائب، بے یقینی اور پُر خطر حالات سے دو چار نہ تھا۔ بے نظیر کی اچانک شہادت نے ان تمام خدشات اور بے یقینی کی حالت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے، بے نظیر کو بجا طور پر چاروں صوبوں کی زنجیر کہا جاتا تھا آج وہ زنجیر ٹوٹ گئی ہے اور میرے عزیز وطن پاکستان کا وفاق کمزور تر ہو گیا ہے۔ بے نظیر نے اپنی شہادت سے چند روز پہلے بلوچستان میں بلوچوں کو یقین دلایا تھا کہ میں اقتدار میں آ کر تمہارے تمام حقوق تمہیں لوٹا دوں گی۔ میں تمہیں اپنے صوبے کے وسائل کا مالک بنا دوں گی۔ تمہیں پاکستان کے محترم، باعزت اور برابر کے شہریوں کا مقام دوں گی جس سے مایوس بلوچوں کے دلوں میں اُمید کی ایک شمع روشن ہوئی تھی۔ آج پاکستان کا ہر باشعور شہری غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے بے نظیر کی شہادت کا جتنا دکھ ہے اتنی ہی فکر اس بات کی بھی ہے کہ وطن عزیز پر اُن کی شہادت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ بے نظیر اور اُس کے باپ نے غریبوں کے لیے مادی حوالے سے شاید بہت کچھ نہ کیا ہو لیکن بھٹو خاندان سے اُن کا رومانس قائم تھا۔ پاکستان کے لاکھوں کروڑوں مرد عورتیں اور نوجوان بے نظیر پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے تھے لیکن قدرت کو شاید ابھی اُن کا مزید امتحان مطلوب تھا۔ کل تک بلکہ چند گھنٹے پہلے تک پاکستان کے محروم اور پسماندہ دبے ہوئے اور مفلوک الحال عوام کو اُمید کی جھلک دکھانے والی بے نظیر بھٹو کی لحد اس وقت تیار ہو چکی ہے اور چند گھنٹوں کے بعد اس کا جنازہ پڑھا جائے گا اور اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا جائے گا۔ ہائے! کل اس وقت کون یہ اندازہ کر سکتا تھا، کون یہ کہہ سکتا تھا، کون یہ سمجھ سکتا تھا، کون یہ مان سکتا تھا کہ 24 گھنٹے نہیں گزریں گے اور بے نظیر اُن کے درمیان سے اُٹھ جائے گی۔ وہ اقتدار میں آ کر اپنے کروڑوں پروانوں کے لیے کچھ کر سکتی یا نہ کر سکتی لیکن وہ اُن کی امید تھی، اُن کا سہارا تھی انہیں اس سے عشق تھا، انہیں اُس سے پیار تھا۔ وہ اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں اُس کے جلسوں میں آ رہے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ بے نظیر کا آخری دیدار کر رہے ہیں۔ دل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اب بھی نہیں مانتا کہ بے نظیر ہم میں نہیں رہیں۔ میرا قلم انہیں مرحوم اور شہید لکھتے ہوئے کانپتا ہے لیکن اللہ کی قضا اور رضا کے سامنے سب بے بس ہیں۔

راقم نے پہلی دفعہ بے نظیر کو لندن کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اُس وقت دیکھا جب وہ اپنے چھوٹے بھائی شاہنواز کی پُراسرار موت پر پُرسہ دینے کے لیے آنے والے ہزاروں پاکستانیوں اور جانثاروں سے ملنے کے لیے دو روز کے لیے لندن آئی تھیں۔ میں اُس وقت اتفاق سے لندن میں تھا۔ میں اُن کے فلیٹ پر گیا۔ کمرہ چھوٹا تھا، ہجوم بہت زیادہ تھا۔ ہدایت یہ تھی کہ جو لوگ دعا مانگ لیں کمرے سے چلے جائیں تاکہ دوسرے لوگ اُن کی جگہ آسکیں۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں نے کسی نہ کسی طرح اس حکم، ہدایت کی خلاف ورزی کی اور میں اس چھوٹے سے کمرے کے ایک کونے میں تادیر دبک کر بیٹھا رہا۔ بے نظیر زاروقطار رو رہی تھیں۔ وہ بہت نحیف و نزار اور کمزور نظر آرہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں ایک متجسس مبصر کی حیثیت میں اُن کی شخصیت کے پہلوؤں کا گہرائی میں جا کر جائزہ لینے کا خواہش مند تھا۔ میں جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا اُن کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا لیکن وہ آنکھوں کے اشاروں سے تعزیت کے لیے آنے والوں کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو جب کراچی میں اُن کے گھر کے باہر قتل کیا گیا تو دو دن کے بعد محترمہ وزیراعظم ہاؤس میں واپس آئیں۔ انسانوں کا ایک سمندر اُن سے اظہار افسوس کے لیے وزیراعظم ہاؤس میں پہنچا ہوا تھا۔ یہاں بھی وہ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں جو اگرچہ کافی بڑا تھا لیکن سب آنے والوں کو ملاقات کا موقع دینے کے لیے یہاں بھی یہی فیصلہ تھا کہ جو لوگ بی بی سے اظہار افسوس کرلیں وہ دوسروں کے لیے جگہ خالی کردیں۔ میں جس گروہ کے ساتھ وزیراعظم کے اس کمرے میں گیا تھا جب وہ اظہار تعزیت کے بعد وہاں سے جانے لگا تو میں بھی اپنی نشست سے اُٹھا اور باہر جانے کے لیے دروازے کا رُخ کیا۔ میں ابھی ایک آدھ قدم ہی چلا تھا کہ بی بی کا پیغام آیا: ''حقانی صاحب! آپ اور اعتزاز احسن ٹھہر جائیں۔ آپ کمرے سے نہ جائیں۔ مجھے آپ کی موجودگی سے حوصلہ ملتا ہے۔'' اس پر جناب اعتزاز احسن اور میں ایک طرف رکھی ہوئی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جب لوگوں کا ہجوم تھما۔ کمرے میں کچھ خاموشی ہوئی تو بڑی دیر تک کسی نے خاموشی کی اس مہر کو نہ توڑا۔ غم زدہ لوگ اپنا دکھ دل میں لیے خاموش بیٹھے رہے پھر چند منٹ کے بعد محترمہ خود بولیں اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''حقانی صاحب! یہ سب کیا ہوا ہے؟ کیسے ہوا ہے؟ کیوں ہوا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی۔'' اس وقت بی بی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے کے نقوش بدلے بدلے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے گزشتہ دو دنوں میں شائع ہونے والی خبروں کی روشنی میں اپنی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

سوچ کے مطابق صورت حال کا مختصر تجزیہ پیش کیا۔ بی بی نے کچھ سوال کیے جن کا جواب میں نے بھی دیا اور دوسروں نے بھی۔ بی بی کا چہرہ معمول کے مقابلے میں پر بہت زیادہ بدلا ہوا تھا، اس پر اس گہرے اور عمیق زخم کے اثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مجلس میں شریک کوئی بھی آدمی قطعیت سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا کہ یہ حادثہ کس طرح رُونما ہوا ہے۔

بی بی کی المناک اور اچانک شہادت اُن بڑے صدمات میں سے ایک ہے جو پاکستان نے پچھلے 60 سال میں برداشت کیے ہیں۔ ملک ہمیشہ سے بڑھ کر داخلی عدم استحکام کی گرفت میں ہے۔ اہل پاکستان بالخصوص اہل سندھ و اہالیان لاڑکانہ سکتے کی حالت میں ہیں۔ ایسے وقت میں بے نظیر کے مداحوں سے یہی درخواست کی جاسکتی ہے کہ وہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور بے نظیر سے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیں کہ ملک کو مزید غیر مستحکم ہونے سے بچانے کی کوشش کریں نیز اُن کے مشن، اُن کے کاز کے ساتھ اپنی وابستگی نہ صرف کمزور نہ ہونے دیں بلکہ اسے مضبوطی سے تھام لیں۔ انتخابات کا کیا ہوگا؟ کب ہوں گے؟ ہو بھی سکیں گے یا نہیں اور ان کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ بڑے بڑے سوالات ہیں جن کے دور رس اثرات اور نتائج ہیں لیکن وقت انہیں کسی نہ کسی طرح حل کرے گا لیکن بے نظیر نہیں ہوں گی۔ اُن کا کوئی بدل ابھی سامنے نہیں ہے۔ اُن کی پارٹی اس صدمے سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی یہ بھی ابھی معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس شر سے پاکستان کے لیے خیر برآمد کرے۔ میں یہ سطور حضور ﷺ کی سکھائی ہوئی دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں:

''اے میرے رب! تو مرحومہ کو بخش دے اور اس پر رحم کر۔ وہ اپنی زندگی میں جتنی نیکیاں کر سکی ہے اُن کے اجر میں اضافہ فرما اور اس سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہوں اُن سے درگزر فرما۔'' آمین۔ الوداع بی بی! الوداع محترمہ بے نظیر بھٹو!!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

روزنامہ جنگ، 29 دسمبر 2007ء

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کہانی ختم

عباس اطہر

محترمہ بے نظیر بھٹو کی کہانی تمام ہوگئی۔

ساری سیاستیں، مخالفتیں، حمائتیں، نفرتیں اور محبتیں۔ وہ سب کچھ جو اُن کی زندگی کا حصہ تھا ماضی کا حصہ بن گیا۔ زندگی اور اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ کوئی نہیں جانتا اگلے لمحے نے اپنے دامن میں کیا سمیٹ رکھا ہے۔

محترمہ کی 54 سالہ زندگی کے ابتدائی 24 سالوں کو چھوڑ کر باقی 30 برس ایک چار سالہ اقتدار کے سوا سیاسی اور ذاتی دکھوں کی مسلسل کہانی تھے۔ مجموعی طور پر اسے ایک دکھ بھری زندگی ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ 21 جون 1953ء میں پیدا ہوئیں اور 4 جولائی 1977ء تک یقیناً ایک شاندار زندگی گزاری۔ پہلے کراچی میں تعلیم حاصل کی پھر آکسفورڈ چلی گئیں۔ دوران تعلیم انہوں نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ دیکھا۔ وہ انہیں اپنے جانشین کے طور پر تیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ پاکستان ٹیلی ویژن پر خارجہ اُمور پر گفتگو کے ایک پروگرام میں شرکت کرتی رہیں۔ شملہ مذاکرات کے موقع پر بھٹو انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ وہ آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے 24 جون 1977ء کو واپس آئیں۔ 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ اُلٹ کر بھٹو صاحب کو وزیراعظم ہاؤس سے حراست میں لے لیا۔ چند دن بعد وہ رہا ہو کر کراچی چلے گئے اور پھر انتقام کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بھٹو قتل کیس میں گرفتار کیے گئے۔ ضمانت پر رہا ہو کر کراچی واپس آئے تو ایک رات 70 کلفٹن پر دھاوا بول کر پورے گھر کو اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد انہیں مارشل لاء ضابطے کے تحت گرفتار کرلیا۔ مقدمہ چلا، لاہور ہائی کورٹ سے سزائے موت ہوئی۔ پھر سپریم کورٹ سے اس کی توثیق عمل میں آئی۔ 4 اپریل کی رات کو وہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند تھیں۔ جبکہ چند میل کے فاصلے پر اُن کے عالیشان باپ کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی جارہی تھی۔ انہیں تدفین سے پہلے اپنے باپ کا منہ دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

باپ کے قتل کے بعد ہتھیار ڈالنے کے بجائے انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہادر باپ کی بہادر بیٹی ثابت کیا اور بیگم نصرت بھٹو کی معیت میں انتخابی مہم شروع کر دی۔ انتخابی جلسوں میں پیپلز پارٹی صاف جیتتی نظر آتی تھی۔ جس کی وجہ سے ضیاء الحق کو انہیں ملتوی کرنا پڑا۔

جس سیاسی زندگی کا خاتمہ 27 دسمبر کی شام کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ہوا اس کی ابتداء یہ تھی کہ ''میں چھوٹے جیلر کے سامنے بے بس کھڑی تھی اور میرے ہاتھوں میں بچے کھچے سامان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اور بس۔ کولون شالیمار کے عطر کی خوشبو اُن کے کپڑوں سے ابھی تک آرہی تھی۔ میں نے اُن کی قمیض کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور مجھے اچانک کینتھلین کینیڈی یاد آگئی۔ جس نے ریڈ کلف میں اپنے سینیٹر والد کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا۔''

انہوں نے باپ کا لباس تو نہیں پہنا لیکن اُن کا پرچم اُٹھا کر اپنی جنگ جاری رکھی۔ چھ مرتبہ نظر بندی کاٹی، جس میں مچھ جیل کی قید سخت بھی شامل تھی۔ ظلم کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر وہ وطن چھوڑ گئیں لیکن لندن میں بیٹھ کر پارٹی کی قیادت کرتی رہیں۔ 9 اپریل 1986ء کو وہ جلاوطنی ختم کر کے لاہور واپس آئیں اور اُن کا شاندار استقبال ملک کی تاریخ کا حصہ تھا۔ 1988ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں لینے والی پارٹی کی سربراہ کے طور پر انہیں وزارت عظمیٰ مل گئی۔ یہ اقتدار 18 ماہ بعد ختم ہوگیا۔ 1993ء میں وہ زیادہ طاقت سے منتخب ہو کر دوبارہ اقتدار میں آئیں لیکن یہ دوسری حکومت صرف ڈھائی سال چل سکی اور انہیں کرپشن کے ان گنت مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مقدمے میں سزا سنائے جانے سے ایک دن پہلے وہ ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ یہ جلاوطنی 18 اکتوبر کو ختم ہوئی اور انہوں نے اس طرح کراچی میں لینڈ کیا کہ مزار قائداعظم تک لاکھوں لوگ اُن کے استقبال کے لیے جمع تھے۔ جلاوطنی کے زمانے میں بے نظیر کے سب سے چھوٹے بھائی شاہنواز بھٹو کی پُراسرار موت ہوئی، دوسرے اقتدار کے خاتمے سے پہلے دوسرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی کی سڑک پر قتل کر دیا گیا۔

سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی نے اپنے دو بڑے بھائیوں کے قتل کے بعد امریکی صدارت کی خواہش ہمیشہ کے لیے ترک کر دی تھی لیکن بے نظیر کی بہادری اس کے باوجود برقرار رہی کہ کراچی کے استقبال کے دوران دو بم دھماکوں میں وہ بال بال بچی تھیں۔ موت کا خوف سر پر مسلسل منڈلاتا رہا لیکن اُنہوں نے اپنی انتخابی مہم جاری رکھی۔ وہ ووٹوں کی طاقت پر جیتنے اور تیسری بار اقتدار میں آنے کے لیے پُر امید تھیں۔ اقتدار شاید اس لیے ہمیشہ اُن کی سیاست کا ہدف رہا کہ وہ اپنے مقتول باپ کے مشن سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ پاکستان کے حوالے سے ذوالفقار

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

چار قبریں، ایک کہانی

حامد میر

سندھ کی روایات کے مطابق شادی شدہ عورتوں کو موت کے بعد سسرال والوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی شادی کے بعد سندھی عورتوں کی طرح آصف علی زرداری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرنے کے بعد اس قبرستان میں دفن ہوں گی جہاں اُن کے شوہر کو دفن ہونا ہے۔ اس وعدے کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو کو زرداری خاندان کے نواب شاہ میں واقع پانچ سو سال پرانے قبرستان میں دفن ہونا تھا۔ موت سے چند دن پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت دے دیں۔ شوہر نے اپنی بیوی کی یہ التجا سن کر اُسے کہا کہ وہ موت کی باتیں نہ کرے لیکن بیوی نے شوہر سے پھر کہا کہ وہ ہاں یا ناں میں جواب دے۔ آصف زرداری نے بیوی کو اپنے والد کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت دے دی لیکن اس کے بعد وہ اپنی بیوی کی زندگی کے بارے میں پریشان رہنے لگے۔ 16 اکتوبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے صدر پرویز مشرف کے نام خط لکھا اور اس خط میں اپنی زندگی کو درپیش خطرات کے بارے میں انہیں آگاہ کیا۔ اسی دن انہوں نے اپنی آخری وصیت تحریر کی اور اسے بلاول کے حوالے کر دیا۔

دو دن کے بعد وہ پاکستان پہنچیں تو 18 اکتوبر کو کراچی میں اُن کے جلوس پر بم سے حملہ ہوا جس میں ڈیڑھ سو سے زائد لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد آصف زرداری فوری طور پر پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو نے انہیں روک دیا۔ آصف زرداری نے دنیا کے سامنے ابھی تک آنسو نہیں بہائے، شاید وہ مخالفوں کے سامنے کمزور نظر نہیں آنا چاہتے لیکن نوڈیرو کے بھٹو ہاؤس میں اس خاکسار کے سامنے اپنی بیوی کی باتیں کرتا ہوا یہ شوہر کئی مرتبہ آبدیدہ ہو گیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور تھکا ماندہ آصف علی زرداری مجھے بتا رہا تھا کہ 25 جنوری کو اُن کی بیٹی بختاور کی 18 ویں سالگرہ ہے۔ بختاور کی ماں کو پتہ تھا کہ 25 جنوری 2008ء کو وہ زندہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

علی بھٹو کے کچھ خواب تھے جس میں ہمارا ایٹمی پروگرام شامل ہے۔ انہی خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں محترمہ نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کا تحفہ دلوایا۔

بھٹو، پیپلز پارٹی اور بے نظیر کے لیے میں نے اپنے عقیدت بھرے جذبات کبھی نہیں چھپائے۔ میں بے نظیر صاحبہ پر نکتہ چینی بھی کرتا رہا ہوں۔ خاص طور پر اس حوالے سے کہ انہوں نے موجودہ حکمران سے مفاہمت کو اپنی سیاست اور زندگی کی مجبوری سمجھ لیا تھا اور ایک عالی خاتون ہونے کے باوجود وہ اندازہ نہیں لگا سکیں کہ ملک کے اندر موجود بھٹو کی مخالف طاقتیں اُن کا وجود برداشت نہیں کرتیں اور اُن کا آخری سیاسی سفر ایک ناگہانی موت پر آکر ختم ہو سکتا ہے۔

میں بہت کچھ لکھنا اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن قلم ساتھ دے رہا ہے نہ دماغ۔ میرے سامنے ٹیلی ویژن سکرین پر محترمہ بے نظیر کا بند تابوت باہر لایا جا رہا ہے جو دنیا سے اس طرح رخصت ہوئیں کہ گردن اور سر پر گولیوں کے دو زخم تھے اور دل پر باپ کا اور دو بھائیوں کے قتل کے داغوں کے علاوہ ایک ایسی ماں کا بوجھ تھا جو مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ایک چلتی پھرتی لاش میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دی۔ ہم نے اس کے خاندان کا آخری سیاسی چراغ بھی گل کر دیا۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

روزنامہ ایکسپریس، 28 دسمبر 2007ء

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نہیں ہوگی لہٰذا ماں نے بیٹی کی سالگرہ سے کئی ہفتے قبل ہی اسے سالگرہ کی نیک تمنائیں بلکہ سالگرہ کا تحفہ بھی پہنچا دیا۔ بیٹی کافی حیران ہوئی کہ اس کی ماں سالگرہ سے کئی دن پہلے ہی اسے سالگرہ کا تحفہ کیوں دے رہی ہے لیکن ماں نے بیٹی کو سوال کرنے کا موقع دیئے بغیر ہدایت کی کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ دے اور چھوٹی بہن آصفہ کا خیال رکھے۔ آصف زرداری بتا رہے تھے کہ موت سے چند دن قبل محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے کچھ قریبی ساتھیوں کو اس قسم کے اشارے دیئے کہ وہ اپنے والد کی 80 ویں سالگرہ کے موقع پر 5 جنوری کو اُن کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ اُن کی اس قسم کی گفتگو سے آصف زرداری مسلسل پریشان تھے اور 26 دسمبر کو پشاور میں ہونے والے بم دھماکے نے اس پریشانی کو مزید بڑھا دیا۔ اسی شام آصف زرداری نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو فون کیا اور کہا کہ وہ پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک دفعہ پھر انہیں روکا لیکن اس مرتبہ آصف زرداری واپسی کے لیے ضد کر رہے تھے لہٰذا طے پایا کہ آصف زرداری 28 دسمبر کو پاکستان واپس آئیں گے۔ وہ 28 دسمبر کو پاکستان واپس آ گئے لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ انتخابی مہم میں شامل ہونے کے لیے نہیں بلکہ (شاید) انہیں اُن کی خواہش کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں دفن کرنے کے لیے واپس آئے۔

آصف علی زرداری جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کا شریک چیئرمین بنائے جانے پر تحفظات رکھتے ہیں۔ آصف زرداری کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ بھٹو نہیں ہیں لیکن اُن کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی پارٹی کی سربراہی میرے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اس لیے کہ میں نے گیارہ سال جیل میں گزارے اور اس دوران پارٹی کے کارکنوں سے میرا مسلسل رابطہ رہا، شاید اس لیے بھی کہ مستقبل میں پاکستان کی سلامتی کو درپیش خطرات کا محترمہ بے نظیر بھٹو کو اندازہ تھا، وہ جانتی تھیں کہ اُن کی شہادت سے ایک دفعہ پھر صوبائی منافرت کو ہوا ملے گی اور انہیں میری صورت میں وہ شخص نظر آیا جو پنجابیوں، بلوچوں اور پختونوں کی دوستی پر ناز کرتا ہے۔ آصف زرداری کہتے ہیں کہ انہوں نے 20 سالہ ازدواجی زندگی کے گیارہ سال جیل میں گزارے، پانچ سال اقتدار میں اور چار سال اپوزیشن میں گزارے اور اُن کا آئندہ کردار وزارت عظمیٰ کے اُمیدوار کا نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کے رکھوالے کا ہے۔ وہ وفاق کی سیاست قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری کے ساتھ تعزیت کے بعد اگلی صبح میں نوڈیرو سے کچھ فاصلے پر واقع گڑھی خدا بخش پہنچا اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ یہاں پر عجیب وغریب مناظر دیکھنے کو ملے۔ کچھ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

لوگ قرآن خوانی کر رہے تھے، کچھ لوگ زاروقطار رو رہے تھے اور چوہدری اعتزاز احسن کی اہلیہ بشریٰ اعتزاز گم سم بیٹھی قبر پر ڈالے جانے والے پھولوں کے پیچھے سے محترمہ بے نظیر بھٹو کا چہرہ تلاش کر رہی تھیں۔ حبیب اللہ شاکر کی سربراہی میں آنے والا ملتان بار ایسوسی ایشن کا وفد جئے بھٹو کے ساتھ ساتھ عدلیہ کی آزادی کے حق میں نعرہ بلند کر رہا تھا۔ پیپلز پارٹی پشاور ڈویژن کے صدر ظاہر علی شاہ گلوگیر لہجے میں بتا رہے تھے کہ کس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو نے 18 اکتوبر کو کراچی میں چارسدہ کے رہنے والے خوانچہ فروش دیار خان کی بیوہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، کس طرح چارسدہ میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے دیار خان کی بیوہ کے ساتھ دو گھنٹے ملاقات کی، اس بے گھر عورت کی چھ بچیوں کے لیے مکان کا انتظام کیا اور ظاہر علی شاہ کو اس کا ہمیشہ خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ نے کوتاہی کی تو روز قیامت آپ کا گریبان پکڑوں گی۔ ظاہر علی شاہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو گڑھی خدا بخش کے ایک مقبرے میں واقع چار قبروں کی کہانی سنا رہے تھے۔ یہ کہانی جمہوریت کے لیے دی جانے والی قربانیوں کے گرد گھومتی ہے۔ ان چاروں قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے والوں کا تعلق پاکستان کے چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات سے نظر آتا ہے۔ ان قبروں میں دفن دو سابق وزرائے اعظم بعد از شہادت بھی وفاق کی علامت ہیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کی بڑی اکثریت بدستور وفاق کی سیاست پر یقین رکھتی ہے۔

پیپلز پارٹی کے امیر وغریب کارکن اپنی لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کی ہر ممکن میزبانی میں مصروف ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ مہمانوں کی زیادہ تعداد بڑے صوبے پنجاب سے آ رہی ہے۔ میں نے سیّد خورشید شاہ اور اُن کے ساتھیوں کو سارا سارا دن پنجاب سے آنے والوں کی خدمت کرتے دیکھا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسی خورشید شاہ سے کئی سندھیوں نے پوچھا کہ اُن کے لیڈروں کی لاشیں بار بار پنجاب سے کیوں آتی ہیں تو وہ صبر کی تلقین کرتے رہے اور جب سوال کرنے والوں کے لہجے سخت ہو گئے تو شاہ صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اللہ کے واسطے شہید بھٹو اور شہید بے نظیر کا راستہ مت چھوڑو، ان دونوں نے پاکستان کے لیے جان دی اور ہمیں بھی پاکستان کے لیے جان دینی ہے۔ مخدوم امین فہیم سے نثار کھوڑو تک اور آفتاب شعبان میرانی سے صفدر عباسی تک پیپلز پارٹی کے تمام سندھی لیڈروں کو روزانہ ایسے کئی نوجوان ملتے ہیں جو پوچھتے ہیں کہ انہیں انصاف کب ملے گا؟ سکھر، نوڈیرو اور لاڑکانہ میں گزارے گئے تین دنوں میں مجھے کچھ ایسے نوجوان بھی ملے جو پنجابیوں کے حق میں بیان دینے پر آصف زرداری سے ناراض تھے۔ ان نوجوانوں نے مجھے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی لوٹ مار اور ہنگاموں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کچھ سوکھے ہوئے آنسو

نذیر ناجی

مجھے شعور کی آنکھ کھولے 55 سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس دوران کیسے کیسے سانحے نہیں ہوئے ہوں گے؟ مجھے نہیں یاد کہ پوری پاکستانی قوم اور عالمی برادری کسی بھی ایک سانحے پر اتنے گہرے صدمے سے دو چار ہوئی ہو۔ بے نظیر بھٹو انسانی حیثیت سے بہت اُوپر چلی گئی تھیں۔ سیاسی تقسیم کی دیواریں ان کے آگے ٹوٹ چکی تھیں۔ ملکوں کی سرحدیں اُن کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں اور قوموں کے فاصلے اُن کی ذات کے لیے مٹ چکے تھے۔ تیسری دنیا میں اور کسی خاتون کو یہ سربلندی نصیب نہیں ہوئی۔ اندرا گاندھی ہم سے پانچ گنا بڑے ملک کی لیڈر اور وزیراعظم تھیں۔ انہیں بھی گولیوں کا شکار بنایا گیا تھا۔ اُن کی موت بھی ایک بڑا سانحہ تھی۔ لیکن اس سانحہ پر بھارت تین دن کے لیے اس طرح سوگ میں نہیں ڈوبا جیسے بے نظیر کے لیے پاکستان اور نہ ہی عالمی میڈیا میں مسلسل کئی دنوں تک اس سانحہ کی خبر اس طرح چھائی رہی جیسے بی بی کی شہادت کی خبر یہ بے نظیر کی عظمت کا ایک ایسا اعتراف تھا جو غیر معمولی شخصیتوں کے حصے میں آتا ہے۔ پاکستان میں یہ سانحہ بجلی کی طرح گرا اور پورا ملک سکتے کی حالت میں آ گیا۔ کسی نے ہڑتال کی اپیل نہیں کی۔ کسی نے سوگ منانے کا اعلان نہیں کیا۔ کسی نے ماتمی تقریب نہیں کی لیکن گلی گلی صف ماتم تھی اور گھر گھر بین ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شہر، ہر گلی اور ہر گھر میں کسی اپنے کی موت ہوئی ہو۔ شہادت بھٹو صاحب کو بھی نصیب ہوئی تھی لیکن بے نظیر کی شہادت بے نظیر تھی۔

بھٹو صاحب کی شخصیت میں تیزی اور طراری کے ساتھ ساتھ جارحانہ انداز بھی تھا۔ وہ اپنی بے پناہ ذہانت کا اظہار ایسے انداز میں کرتے کہ دوسرے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتے اور بھٹو صاحب اس کیفیت سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ انہیں دوسرے کا ذہن پڑھنے کا بھی کمال حاصل تھا۔ مخاطب ابھی ابتدائیہ بھی مکمل نہ کرتا کہ بھٹو صاحب خود بتا دیتے کہ وہ کیا کہنے آیا ہے اور اُن کا قیافہ عموماً درست ہوتا۔ یہی خوبیاں بے نظیر میں بھی تھیں۔ انہیں اپنی ذہنی سبقت سے لطف اندوز ہونا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کے متاثرین سندھیوں سے ملوایا۔ ان میں سے کئی سندھی پیپلز پارٹی کے کارکن تھے لیکن مشتعل مظاہرین کو روکنے کی کوشش میں اپنی املاک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ شکار پور سے نوڈیرو جانے والی سڑک کے دونوں اطراف مسلم لیگ (ق) کے اُمیدوار برائے قومی اسمبلی غوث بخش مہر کے بینر اور بورڈ بھی سلامت ہیں لیکن انہیں میڈیا نے اہمیت نہیں دی اور صرف جلاؤ گھیراؤ دکھایا۔ سندھی نوجوانوں کا غصہ اور شکوے شکائتیں ایک سیاسی حقیقت ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرنے کے لیے پنجاب کے صحافیوں کو اندرون سندھ کا دورہ ضرور کرنا چاہیے۔ اندرون سندھ کے دورے سے احساس ہوتا ہے کہ جس پیپلز پارٹی کے مخالفین اس پر پاکستان توڑنے کا الزام لگاتے رہے آج پاکستان بچانے کے لیے وہ پیپلز پارٹی کتنی ضروری ہو چکی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی سندھیوں کے لیے ایک گہرا زخم تھا۔ بے نظیر صاحبہ اس زخم کا مرہم تھیں۔ اب یہ مرہم بھی نہیں رہا اور زخم مزید گہرا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ زخم بگڑ کر ناسور بن جائے پنجاب کو اس زخم کا مرہم بننا ہوگا۔

روزنامہ جنگ، 7 جنوری 2008ء

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اچھا لگتا۔ نوعمری میں وہ بھی اپنے عظیم والد کی طرح سب سے پہلے کوئی نیا نکتہ پیش کر کے فاتحانہ انداز میں لطف اندوز ہوا کرتیں۔ 1977ء کا واقعہ ہے بھٹو صاحب جیل میں تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے راولپنڈی میں سید اصغر علی شاہ کے گھر ایک پریس کانفرنس بلا رکھی تھی۔ وہ اپنے انداز میں ضیاء الحق پر تنقید کر رہی تھیں۔ بے نظیر انہیں ٹوک کر اپنی بات کرنے لگیں۔ کبھی کہتیں یہ کشمیر کو بیچ دے گا اور کبھی الزام لگاتیں کہ یہ اپنے اقتدار کی خاطر پاکستان کا سودا کر دے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بیگم بھٹو کو یہ مداخلت اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ بے نظیر کے سامنے بزرگانہ برتری دکھانے سے گریز کیا کرتی تھیں۔ بھٹو صاحب بے نظیر کو اپنا پہلا بیٹا کہتے تھے۔ یہ پہلا بیٹا بہت ہی لاڈلا اور سر چڑھا تھا۔ بھٹو صاحب کے مقدمے اور اس کے بعد اپنی قید کے دوران بینظیر کی شخصیت کا جارحانہ عنصر ہمیشہ نمایاں رہا۔ وہ حکومت اور ضیاء الحق پر سخت سے سخت تنقید کیا کرتیں۔ پارٹی کے سینئر لیڈر بے نظیر کے اس انداز پر خوش نہیں تھے لیکن اُن کے سامنے بولنا مہنگا کام ہوتا۔ جس کسی نے اُن پر بزرگی جھاڑنے کی کوشش کی اُسے گھر بیٹھنا پڑا۔ سیاسی مخالفین پر وہ عقاب کی طرح جھپٹتیں۔ 1988ء، 1990ء، 1993ء اور 1997ء کی انتخابی مہمات میں بے نظیر نے اپنے سیاسی مخالفین پر جو حملے کیے اُن کے بعض جملے سن کر بی بی کے اپنے حامی بھی حیرت میں ڈوب جاتے لیکن وہ اپنے اس جارحانہ انداز کو پسند کرتی تھیں۔ 1986ء میں ایک پریس کانفرنس کے دوران وہ مجھ پر بھی برس پڑیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ بعد میں افسوس کا اظہار کریں گی لیکن کئی سال تک ایسا نہ ہوا اور جب ہوا تو یہ میرے لیے ہی نہیں پاکستان بھر سے آئے ہوئے صحافیوں اور دانشوروں کے لیے حیرت انگیز تھا۔ محترمہ پاکستان کی وزیراعظم تھیں۔ ہم اُن کے ڈنر پر مدعو تھے جب وہ ہال میں داخل ہوئیں تو اپنی روایتی بلند آواز میں پوچھا ''ناجی صاحب کہاں ہیں؟'' میں دور کی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ حسین حقانی سیکرٹری اطلاعات تھے، انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے نشاندہی کی۔ تو بی بی نے وہیں سے مخاطب ہو کر مجھے مرکزی میز پر بلایا۔ اُن کے سامنے ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ مجھے اس پر بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر بتایا کہ ''یہ کرسی آصف صاحب کے لیے رکھی تھی جس پر آپ بیٹھے ہیں۔'' یہ خصوصی عزت افزائی کا ایک ایسا انداز تھا جس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو بھٹو خاندان کے مزاج سے واقف ہو۔ اس کے بعد بی بی نے مجھے تقریر نویسی کی دعوت دی۔ یہ غیر معمولی مہربانی اس تلخ کلامی کی تلافی کے لیے تھی جس کا مجھے 1986ء میں ہدف بننا پڑا تھا لیکن تلافی کے اس انداز سے میری وہ عزت افزائی ہوئی جو میرے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کو کم ملتی تھی۔

یہ ذاتی واقعہ برسبیل تذکرہ آ گیا۔ درحقیقت میں اس طویل سفر کا چند جملوں میں احاطہ کرنا چاہتا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہوں جو بے نظیر بھٹو نے پنکی سے بی بی بننے تک طے کیا۔ میرا خیال ہے کہ بی بی کے جارحانہ انداز میں نرمی اس وقت پیدا ہونا شروع ہوئی جب انہیں ماں بننے کا اعزاز ملا۔ مامتا محض اولاد کے لیے نہیں ہوتی یہ ایک جذبہ ہوتا ہے جو اپنے بچے سے شروع ہو کر جب پھیلنے لگتا ہے تو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ جس بی بی کی شہادت پر بلاتفریق ہر خیال کے لوگ دکھ میں ڈوبے ہیں وہ قوم کے لیے ایک ماں اور بہن کی محبت کی علامت بن چکی تھیں۔ گزشتہ چند سال سے بے نظیر کی جارحیت پر مامتا غالب آنے لگی تھی۔ اپنے سیاسی مخالفین پر جس طرح کی وہ تنقید ماضی میں کیا کرتی تھیں وہ ماند پڑنے لگی تھی اور آپ نے دیکھا کہ اُن کے بدترین سیاسی مخالفین بھی اب اُن کے ساتھ کام کرنے کے امکان پر گھبرانا چھوڑ چکے تھے۔ خصوصاً نواز شریف کے ساتھ باہمی تعاون کا جو رشتہ استوار ہوا وہ بے نظیر کی اس تبدیلی کا سب سے بڑا ثبوت ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ آخر میں لڑاکو پنکی کے اندر جنم لینے والی مامتا کا قصہ خود بینظیر کی زبانی سن لیجئے۔ وہ 18 اکتوبر کے سانحے کے حوالے سے اپنا مشاہدہ بیان کر رہی تھیں۔ انہی کے الفاظ میں سنیئے ''میں نے ٹرک کے اُوپر کھڑے ہوئے دیکھا کہ ایک شخص پارٹی کے پرچم میں لپٹے ہوئے بچے کو میری طرف بڑھا رہا ہے اور ہجوم میں وہ آگے نہیں نکل پا رہا تھا۔ میرے اندر کی مامتا جاگی اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے کارکنوں کو کہا کہ وہ اس بچے کو مجھ تک پہنچائیں۔ لیکن کارکن جوش و خروش کے عالم میں تھے۔ کسی نے اُس بچے کی طرف توجہ نہیں دی اور مجھے افسوس رہا کہ میں بچے کو گود میں لے کر باپ کی خواہش پوری نہ کر سکی۔'' جس بچے کو بے نظیر گود میں لینے کے لیے بے تاب تھیں وہ ایک بم تھا۔ جسے ایک بچے کے پتلے میں چھپا کر رکھا گیا تھا تاکہ اسے بے نظیر تک پہنچا کر اُڑا دیا جائے۔ اس وقت بے نظیر کو ممتا کے جذبے کا تقدس بچا گیا۔

روزنامہ جنگ، یکم جنوری 2006ء

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

محترمہ کی شہادت کا ''خون بہا؟''

عطاء الحق قاسمی

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر القاعدہ کا وجود ختم ہو گیا تو ہم قتل کا الزام کس پر عائد کیا کریں گے؟ پاکستان کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو شہید کر دیا گیا اور اگلے ہی لمحات میں ثابت ہو گیا کہ اس کی ذمہ دار القاعدہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ ابھی تک ذوالفقار علی بھٹو، شاہنواز بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو کے قتل کو القاعدہ کے کھاتے میں کیوں نہیں ڈالا گیا اور اکبر بگٹی کو بھی اس سے محروم کیوں رکھا گیا؟ پاکستان میں جو بھی المناک واقعہ رُونما ہوتا ہے اس کی ذمہ دار القاعدہ ہوتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کبھی ان المیوں میں شریک نہیں ہوتی۔ لیکن اس ''حقیقت'' کو تسلیم کرنے کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اُن کی سکیورٹی کا معقول بندوبست کیوں نہ کیا گیا۔ ابھی دو روز قبل رحمان ملک نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ گاڑیوں میں نصب جیمرز ناقص ہیں مگر اس کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ قاتل محترمہ کے اتنے قریب کیسے پہنچ گیا کہ اسے محترمہ کو پستول سے نشانہ بنانے میں بھی کوئی پرابلم نہیں ہوئی جبکہ اسٹیج پر عوام کا اتنا رش بھی نہیں تھا کہ قاتل کو اس بھیڑ میں داخل ہونے کا موقع مل جاتا۔ سوال تو بہت سے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پرویز مشرف کے آٹھ سالہ دور میں حکومتی شخصیتوں کو نشانہ تو بنایا گیا لیکن خدا کا شکر ہے حملہ آور اُن میں سے کسی کی ٹارگٹ کلنگ میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی ملک کے لیے ایک سانحہ ہوتا کہ قتل کسی گناہ گار کا ہو یا کسی بے گناہ کا اپنے پیچھے بے شمار بحران چھوڑ جاتا ہے۔ تاہم ''القاعدہ'' جیسی ''ماڈرن سائنس اور ٹیکنالوجی کی ماہر'' دہشت گرد تنظیم جو امریکہ کے قلب میں نہایت حساس اور نہایت ٹیکنیکل قسم کے آپریشن کے ذریعے ہزاروں امریکیوں کو ہلاک کر سکتی ہے (اگر یہ کام واقعی اُن غاروں میں رہنے والوں نے کیا ہے) تو کیا وجہ ہے کہ وہ آٹھ سالوں کے دوران تمام کوششوں کے باوجود سربراہ مملکت تو کیا کسی وزیر کی ٹارگٹ کلنگ بھی نہیں کر سکی۔ مگر اس کے برعکس صرف چند دنوں میں وہ اپوزیشن کی ایک بہت بڑی شخصیت کو

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مارنے میں کامیاب ہو جاتی ہے؟ پاکستانیوں کے ذہنوں میں یہ سوالات موجود ہیں اور انہیں ان کے جوابات ملنا چاہئیں۔

پرویز مشرف صاحب کی حکومت کی یہ بہت واضح اور برملا خواہش تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف وزیراعظم نہ بنیں کیونکہ مقبول لیڈر اسٹیبلشمنٹ کے لیے قبول نہیں ہوتے چنانچہ آئین میں ترمیم کر کے اُن دونوں کو وزارت عظمیٰ کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا بلکہ میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کے کاغذات نامزدگی بھی مسترد کر دیئے گئے۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پیپلز پارٹی کی جو قیادت بچی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اتنے بڑے سانحہ کو ہضم کر کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے یعنی متوقع اقتدار کی صورت میں اپنی رہنما کے قتل کا خون بہا وصول کر کے پرویز مشرف کو سہارا دیتی ہے یا وہ خوں بہا لینے سے انکاری ہوتی ہے اور عوامی قوتوں کے ساتھ مل کر ملک کو اس دہشت گردی کے نظام سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتی ہے جو اب تک محترمہ بے نظیر بھٹو سمیت ہزاروں بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ چکا ہے؟ اس سوال کا جواب آنے والے دنوں میں مل جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ پیپلز پارٹی کی باقی ماندہ قیادت کی ترجیحات کیا ہیں اور ان ترجیحات کا رُخ جمہوری قوتوں کے اتحاد کی طرف ہے یا وہ اسٹیبلشمنٹ کی خواہشات کی آئینہ دار ہیں؟

گزشتہ روز جب مجھے محترمہ کی شہادت کی خبر ملی تو پاکستان کے کروڑوں عوام کی طرح مجھے بھی ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہو۔ مجھے سانس لینے کے لیے ان ہیلر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں مگر میں خود کو کسی سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں پاتا تھا۔ اس صورت حال میں میرا فوری ردّعمل یہ تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ ابھی صدر پرویز مشرف ٹی وی اسکرین پر نمودار ہوں گے اور وہ اس سانحہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اعلان کریں گے کہ وہ عہدۂ صدارت سے مستعفی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں قومی حکومت کے قیام کی بات کریں گے جو ایک معینہ مدت میں انتخابات کرائے گی مگر اس کے بجائے پرویز مشرف نے اسکرین پر آ کر فرمایا کہ وہ ''دہشت گردی'' کو ختم کر کے دم لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس وقت تک برسر اقتدار رہیں گے جب تک ملک سے ''دہشت گردی'' کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور ظاہر ہے یہ خاتمہ ضروری نہیں کہ اُن کی تازہ صدارتی ٹرم یعنی پانچ برسوں میں ممکن ہو سکے۔ اس کے لیے انہیں ایک اور ٹرم کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ بہرحال مسلم لیگ (ن) کے قائد میاں نواز شریف نے اپنی پریس کانفرنس میں وہی مطالبات کیے ہیں کہ میرے سمیت پاکستان کے کروڑوں عوام کی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پاکستان بچانے کا آخری موقع

جاوید چوہدری

یہ کہانی 1934ء سے شروع ہوتی ہے، سندھ کے مشہور جاگیردار شاہ نواز نے کراچی میں ''سندھ پیپلز پارٹی'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی، یہ سندھ میں مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت تھی اور سر شاہ نواز اس وقت گورنر کے اسسٹنٹ تھے۔ 1936ء میں سندھ بمبئی سے الگ ہو گیا تو پیپلز پارٹی نے سندھ اتحاد پارٹی کی شکل اختیار کر لی۔ شاہ نواز اپنی ذات میں یگانہ تھے۔ انہوں نے 21 برس کی عمر میں سیاست شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی نامور شخصیات میں شمار ہونے لگے۔ وہ بمبئی کی قانون ساز کونسل کے رُکن بنے، انہوں نے انگریز سرکار سے او۔ بی۔ ای خان بہادر اور سر کے خطاب لیے، وہ بمبئی حکومت میں وزیر بنے، وہ گورنر کے اسسٹنٹ رہے، وہ پبلک سروس کمیشن کے رُکن اور چیئرمین رہے اور وہ ریاست جونا گڑھ کے وزیراعظم بنے۔ وہ جونا گڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے لیکن سردار پٹیل، نواب آف جو" گڑھ کے قریبی دوست تھے چنانچہ پٹیل نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ یہ ناکامی سر شاہ نواز کے دل پر داغ بن گئی، وہ جونا گڑھ سے پاکستان آئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ 19 نومبر 1957ء تک زندہ رہے لیکن انہوں نے اس کے بعد کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا۔

ذوالفقار علی بھٹو سر شاہ نواز کے صاحبزادے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بمبئی کے انگریزی سکولوں، کیلی فورنیا کے مشہور کالج برکلے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وہ 1953ء میں کراچی لوٹے اور انہوں نے وکالت کے ساتھ ساتھ ایس ایم لاء کالج میں انٹرنیشنل لاء پڑھانا شروع کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو سیاست میں آنا چاہتے تھے لیکن سر شاہ نواز سیاست کے مخالف تھے۔ سر شاہ نواز کا خیال تھا سیاست ایک ایسا کھیل ہے جس کا اختتام ہمیشہ المناک ہوتا ہے وہ اپنے بیٹے کو خوش، خوشحال اور مطمئن دیکھنا چاہتے تھے لیکن بھٹو سیاست کو اپنا کیریئر سمجھتے تھے۔ سکندر مرزا اور حسین شہید سہروردی سر شاہ نواز کے دوست تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو اُن کے پاس گئے اور یہ دونوں حضرات سر شاہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

خواہشات کے آئینہ دار ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب راہ نجات صرف یہی ہے کہ پرویز مشرف بھی فوری طور پر عہدۂ صدارت سے استعفیٰ دیں اور اس کے بعد قومی حکومت کی نگرانی میں عام انتخابات کا انعقاد کیا جائے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ منتخب کیا گیا تو یہ پاکستانی قوم کو سمندر میں واقع ایک کشش ثقل پر موجود ٹرائی اینگل کے گرد و نواح میں لے جانے کے مترادف ہو گا جو اپنی سطح پر تیرنے والے اور فضا میں اُڑنے والے ہر جہاز کو اپنی طرف کھینچ کر نگل جاتا ہے اور پھر اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔ چنانچہ میرے نزدیک بے نظیر بھٹو کی شہادت کا خوں بہا اگر لینا ہے تو یہ خوں بہا آمریت سے نجات اور جمہوری قوتوں کی فتح کی صورت میں وصول کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جو بھی وصول کیا جائے گا اسے قوم خوں بہا نہیں سمجھے گی بلکہ یہ سمجھے گی کہ شہید کے خون کا سودا کر لیا گیا ہے۔

روزنامہ جنگ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نواز کی مخالفت کے باوجود بھٹو کو سیاست میں لے آئے۔ ذوالفقار علی بھٹو، سکندر مرزا اور ایوب خان کی کابینہ میں وزیر رہے۔ وہ ابتداً معدنیات وقدرتی وسائل، اقلیتی اُمور، قومی تعمیرات اور اُمور کشمیر کے وزیر بنے اور بعد ازاں 1962ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ بنا دیئے گئے۔ وہ جنوری 1966ء میں ایوب خان سے الگ ہوئے۔ انہوں نے 30 نومبر 1967ء کو اپنی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا اور اس پارٹی کے لیے اپنے مرحوم والد کی جماعت پیپلز پارٹی کا نام پسند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''قائد عوام'' بن گئے۔ بھٹو نے پاکستانی سیاست اور پاکستانی تاریخ میں اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ انہوں نے 1971ء کی جنگ میں شکست کے بعد پاکستان کا ہاتھ تھاما اور ایک زخم خوردہ اور ادھورے ملک کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ وہ ملک بھر کے غریبوں، مسکینوں، بے روزگاروں اور ہاریوں کے مسیحا بن کر طلوع ہوئے اور انہوں نے ڈری، سہمی اور خشک زبانوں کو آواز دی لیکن 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے اس بھٹو سے حکومت چھینی اور انہیں 4 اپریل 1979ء کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بعد اُن کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کے مشن کو کندھا دیا، وہ سیاسی کھیل میں شرکت کے فوراً بعد جلا وطن ہوئیں۔

بے نظیر بھٹو نے لندن میں پیپلز پارٹی کی عنان سنبھالی اور طویل جلا وطنی کے بعد 10 اپریل 1986ء کو پاکستان آئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے 20 لاکھ جانثاروں نے اُن کا استقبال کیا اور اس کے بعد زندگی بھٹو کی بیٹی کے لیے دکھوں کی ایک ایسی راہ گزر بن گئی جس کی ایک ایک انچ پر آلام، تکالیف اور اذیت کے کانٹے پیوست تھے اور بھٹو کی بیٹی اس راہ پر برہنہ پا چل رہی تھی۔ اس سفر کے دوران اُن کے ایک بھائی شاہ نواز بھٹو کو فرانس میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور دوسرے بھائی مرتضٰی بھٹو 1996ء میں کراچی میں گولی کا نشانہ بن گئے۔

بے نظیر بھٹو دسمبر 1988ء میں وزیر اعظم بنیں تو ٹھیک 18 ماہ بعد غلام اسحاق خان نے اُن کی حکومت برطرف کر دی، وہ اکتوبر 1993ء میں دوسری بار وزیر اعظم بنیں تو اڑھائی برس بعد اُن کے اپنے صدر اور کارکن سردار فاروق احمد لغاری اُن کے جانی دشمن بن گئے۔ وہ 1999ء میں جلا وطن ہوئیں تو انہوں نے واپسی کی آرزو میں دس برس دیار غیر میں گزار دیئے اور وہ 18 اکتوبر 2007ء کو وطن واپس آئیں تو انہیں آتے ہی ڈیڑھ سو نعشوں کا تحفہ مل گیا۔ الغرض بے نظیر بھٹو کی زندگی کے ہر ورق پر کوئی نہ کوئی دکھ، کوئی نہ کوئی اذیت تحریر تھی۔ 18 اکتوبر کے بعد پوری دنیا نے انہیں ''احتیاط'' کے مشورے دیئے، اُن کے بچے انہیں واپس دبئی بلاتے رہے، اُن کی پارٹی کے عہدیدار انہیں واپسی کا مشورہ دیتے رہے اور میرے سمیت تمام صحافی، دانشور اور لکھاری انہیں الیکشن کے بائیکاٹ کا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

مشورہ دیتے رہے لیکن بے نظیر ڈٹی رہیں۔ بے نظیر کا خیال تھا یہ الیکشن جمہوریت کے لیے ناگزیر ہیں۔ اگر آج انہوں نے پسپائی اختیار کر لی تو پاکستان آمریت کے پنجے سے کبھی آزاد نہیں ہو سکے گا۔ محترمہ کو اپنے اردگرد خطرات کے سائے منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بار بار حکومت سے سیکورٹی کی درخواست کرتی تھیں لیکن حکومت نے انہیں تسلی کے چند بولوں کے سوا کچھ نہ دیا، یہاں تک کہ 27 دسمبر 2007ء کی شام آئی اور جاتے جاتے بھٹو خاندان کا آخری سیاسی چراغ بھی بجھا گئی۔ سر شاہ نواز کی بات سچ ثابت ہوگئی۔ انہوں نے 1953ء میں اپنے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو سے کہا تھا ''سیاست ایک ایسا کھیل ہے جس کا انجام ہمیشہ المناک ہی ہوتا ہے۔'' پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان اس المناک انجام کا شکار ہو گیا۔

میں آج یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں، مجھ سمیت پاکستان کے وہی تمام لکھاری جو محترمہ کی سیاست کو مصلحت، ڈیل، بزدلی اور مفادات کا کھیل قرار دیتے رہے ہیں وہ سب غلط تھے اور محترمہ کے خدشات درست۔ ذرا سوچئے جس خاتون کے والد کو وزارت عظمٰی کی کرسی سے گھسیٹ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہو، جس نے سڑکوں پر ڈنڈے کھائے ہوں، جس کے دو بھائی ہولناک موت کا شکار ہو گئے ہوں، جس کی ماں برسوں سے قومے میں ہو، جو دس برس تک وطن سے دور اپنے بچوں کو گلے لگا کر بیٹھی رہی ہو، جس کے خاوند نے پندرہ برس جیل میں گزار دیئے ہوں اور جسے تین نسلوں کی سیاسی قربانیوں کے بعد دو ٹکڑوں میں صرف 4 سال 8 ماہ اور 18 دن کا اقتدار ملا اور دونوں بار اس کو حکومت 58(2)(b) کا شکار ہوگئی ہو اور جس نے اپنی زندگی کا قیمتی ترین وقت خود کو عدالتوں میں بے گناہ ثابت کرتے گزار دیا ہو، کیا وہ خاتون زندگی کو ٹٹول ٹٹول کر نہیں گزارے گی؟ کیا وہ مصلحت، کوش اور احتیاط پر مجبور نہیں ہو جائے گی؟ ہمیں یہ ماننا پڑے گا محترمہ بے نظیر بھٹو ملک کی واحد وفاقی لیڈر اور پیپلز پارٹی پاکستان کی واحد قومی جماعت ہے، محترمہ بے نظیر بھٹو چاروں صوبوں کی زنجیر تھی، وہ پاکستان کی واحد لیڈر تھیں جنہیں چاروں صوبوں کے عوام تسلیم کرتے تھے اور پیپلز پارٹی پاکستان کی واحد جماعت ہے جس کی جڑیں ملک کے تمام صوبوں میں موجود ہیں اور محترمہ کی شہادت کے بعد یہ زنجیر ٹوٹ چکی ہے اور اب ملک میں کوئی ایسا لیڈر نہیں بچا جو پورے ملک کو سنبھال سکے۔ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا محترمہ کی شہادت کے بعد ہماری اسٹیبلشمنٹ پیپلز پارٹی کو بھی توڑنے کی کوشش کرے گی اور اگر خدانخواستہ یہ سازش کامیاب ہوگئی تو یہ 1971ء سے بڑا سانحہ ہوگا۔ بھٹو صاحب نے 1978ء میں جیل میں کہا تھا اگر میں مر گیا تو میری موت پر ہمالیہ روئے گا۔ ہمیں ماننا پڑے گا بھٹو کی موت پر ہمالیہ نہیں رویا لیکن آج بھٹو کی بیٹی کی شہادت پر پاکستان کی ایک ایک سڑک، ایک

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر کی المناک موت

ڈاکٹر صفدر محمود

محترمہ بے نظیر بھٹو کی ناگہانی موت ساری قوم کو غم واندوہ اور آنسوؤں کے سیلاب میں بہا کر لے گئی۔ بلاشبہ محترمہ وفاق کی علامت تھیں اور مرکز ساری قوم اور چاروں صوبوں کے عوام کو درد کی لڑی میں پروگئیں اور اپنے پیچھے ایسا خلا چھوڑ گئیں جو کبھی پُر نہیں ہوگا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے آمریت کی پھانسی چڑھ کر اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا تھا اسے کسی حد تک بے نظیر نے پُر کر دیا تھا اور اپنے مرحوم والد کی سیاسی میراث کو سنبھال لیا تھا لیکن بے نظیر کی بے وقت موت نے اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا ہے وہ بظاہر پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ بے نظیر کو اپنے والد سے عشق تھا، اس نے اپنے مرحوم والد کے مشن کو اپنی زندگی کی شمع بنا لیا تھا، اپنے والد کی مانند وہ غریبوں کا دکھ محسوس کرتی اور جمہوریت کے لیے لگاتار جدوجہد میں مصروف رہتی تھی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ جمہوریت کے بغیر نہ ملک مستحکم ہوسکتا ہے اور نہ قوم متحد و یک جا ہوسکتی ہے۔ اسے احساس تھا کہ آمریت ملک کو اندرونی طور پر کھوکھلا کر دیتی ہے اور قومی یک جہتی کی بنیادوں کو کمزور کر دیتی ہے چنانچہ آمریت کا خاتمہ ہی بے نظیر کا مشن تھا اور اس نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ پہلے ضیاء الحق کی آمریت اور پھر اس کے جانشین کے آمرانہ نظام کو ختم کرنے میں صرف کر دیا۔ اس راہ میں بھٹو خاندان پر کیسے کیسے مظالم توڑے گئے، یہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک پہلو ہے اور یہی وہ احساس اور درد تھا جس نے بھٹو خاندان کی سیاسی عظمت اور بے نظیر کی مقبولیت کا چراغ روشن رکھا، اسے عوام کے ذہنوں اور دلوں کے قریب رکھا اور اسی درد نے بے نظیر کی موت پر شام غریباں کی یاد تازہ کر دی، ہر آنکھ کو اشکبار اور ہر چہرے کو غم کی تصویر بنا دیا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک طرف اس کے کارکن بے نظیر کی موت پر سینہ کوبی کر رہے تھے تو دوسری طرف اس کے جاں نثار غم میں نڈھال گرتے پڑتے تھے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایسی موت کسے نصیب ہوتی ہے؟ موت زندگی کی تلخ ترین اور اٹل حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ موت کو بہرحال آنا ہوتا ہے اور ہم بحیثیت مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ موت کا وقت اور جگہ بھی مقرر ہوتی ہے لیکن

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ایک شہر، ایک ایک قصبہ، ایک ایک گلی اور ایک ایک گھر رو رہا ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا بے نظیر بھٹو زندگی بھر آمریت، عسکری طاقتوں اور غیر قانونی حکومتوں کے خلاف لڑتی رہیں، وہ زندگی میں تو غیر قانونی حکومتوں اور طاقتوں کو شکست نہ دے سکی لیکن آج اس بے نظیر کے جنازے کے سامنے حکومت بے بس ہوگئی ہے، آج پورے ملک میں آگ لگی ہے اور ملک کے کسی کونے میں حکومت نظر نہیں آرہی۔ ہمیں ماننا پڑے گا آج آمریت اپنے ہی وجود میں سمٹتی چلی جارہی ہے۔

بے نظیر بھٹو کی شہادت اس ملک میں اسٹیبلشمنٹ کا اختتام ہے، اگر ہماری حکومت نے وقت کی آواز نہ سنی تو مجھے ڈر ہے، آنے والے کل اس ملک پر قیامت بن کر ٹوٹیں گے۔ ہم بارود اور خون کی ایک ایسی خوفناک وادی کی دہلیز پر کھڑے ہیں جس سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ بس ہٹ دھرمی، ضد اور انا کا ایک اور قدم اُٹھانے کی دیر ہے اور ہم پر زندگی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس بس ایک آخری چانس ہے اگر صدر پرویز مشرف اپنی صدارت جاری رکھنے کے عزم پر نظر ثانی کریں، اگر ہم عدلیہ کو بحال کر دیں، ہم وزارت عظمیٰ پیپلز پارٹی کو دے دیں، ہم قومی حکومت بنائیں، ملک میں فیئر اینڈ فری الیکشن کرائیں اور جو پارٹی زیادہ نشستیں حاصل کرے ہم اسے حکومت بنانے کی اجازت دے دیں اور یہ حکومت پانچ برس پورے کرے، ہم فیصلہ کر لیں دس برس تک اس ملک میں صدر بلوچ، وزیر اعظم سندھی اور آرمی چیف پشتون ہوگا اور ملک کے تمام ترقیاتی منصوبے بلوچستان سے شروع ہوں گے تو اس ملک کے بچنے کے امکانات ہو سکتے ہیں ورنہ یقین کیجئے بے نظیر بھٹو کی یہ نعش ملک کی نعش ثابت ہوگی اور ہم سب قبر میں اُتر جائیں گے اور ہم پر گورکن حکومت کریں گے۔ خدا کے بندو اب تو سنبھل جاؤ، اب تو معاف کر دو۔

روزنامہ ایکسپریس

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کتنے لوگ ایسی موت مرتے ہیں کہ اپنے پیچھے پُر نہ ہونے والا خلا چھوڑ جائیں اور اپنے ملک وقوم کے علاوہ دنیا بھر میں کروڑوں آنکھوں کو آنسوؤں کے سمندر میں غرق کر جائیں۔ موت برحق ہے لیکن ایسی موت کم کم خوش نصیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آپ پاکستان کی تاریخ پر نگاہ ڈال لیجئے۔ کتنے سیاسی لیڈروں کو ایسی موت نصیب ہوئی ہوگی؟ فقط چند ایک جن کے اسمائے گرامی اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے جب ایسا انسان مرتا ہے تو فرشتے خالق حقیقی کے دربار میں عرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرے اس بندے کے لیے کروڑوں آنکھیں اشکبار ہیں، کروڑوں ہاتھ اس کی بخشش اور روحانی بلندی کے لیے اُٹھ رہے ہیں، کروڑوں دل اس کی یاد میں تڑپ رہے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی بے پناہ دعاؤں اور اَن گنت التجاؤں کے طفیل نہ صرف اسے بخش دیتا ہے بلکہ اس پر اپنے انعامات کی بارش بھی کرتا ہے۔ مسلمان کے لیے بخشش ہی زندگی کی آخری آرزو اور منزل ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں ایسی موت کو مبارک اور بےنظیر موت سمجھتا ہوں۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ بےنظیر کو اپنے والد سے عشق تھا وہ بیرون ملک سے طویل جلا وطنی کے بعد لوٹیں تو اپنے والد کے مزار پر حاضر ہوئیں۔ لیکن ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے بےنظیر تسکین کی بجائے تشنگی لے کر لوٹی ہیں۔ چنانچہ لاڑکانہ کے ایک باخبر شخص کے مطابق بےنظیر نے کہا کہ وہ جلد دوبارہ آئیں گی اور سکون سے تنہا اپنے باپ کی قبر کے پاس بیٹھیں گی۔ وہ 24 دسمبر کو گڑھی خدا بخش گئیں اور مسلسل دو گھنٹے اپنے والد کی قبر کے سرہانے بیٹھی رہیں۔ اس ملاقات کے فقط تین دن بعد بےنظیر بھٹو کو 28 دسمبر کی سہ پہر اسی جگہ پر دفن کیا گیا جہاں سے وہ تین دن قبل اُٹھ کر گئی تھیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بےنظیر کی حادثاتی موت جہاں حکومت کی غفلت اور نااہلی کا نقش ثبت کر گئی ہے وہاں ملک وقوم کو بھی ایک بحران میں مبتلا کر گئی ہے اور وہ بحران ہے بےیقینی، مایوسی، خطرات اور ان گنت خدشات کا۔ اُن کی موت القاعدہ کے ہاتھوں ہوئی یا اُن کی لینڈ کروزر کی چھت سے ٹکرانے کے سبب ہوئی، یہ ایک الگ بحث ہے کیونکہ القاعدہ نے یہ ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے اور حکومتی تاویلات پر کسی کو اعتبار نہیں۔ نہ ہی کسی کو حکومتی انکوائری پر اعتماد ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس موت سے اُٹھنے والا دھواں آسانی سے بند نہیں ہوگا اور یہ پاکستان کے اُفق پر خطرات کے بادل بن کر منڈلاتا رہے گا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اب تک ہنگاموں میں دو درجن سے زیادہ افراد ہلاک ہو چکے ہیں یعنی دو درجن غریب گھر اُجڑ چکے ہیں، سینکڑوں سرکاری و غیر سرکاری عمارات خاص طور پر بینکوں، پٹرول پمپوں، کاروں اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملے ہو چکے ہیں۔ غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ عام طور پر نشانہ بننے والی جگہیں وہ تھیں جہاں سے نقدی لوٹی جاسکتی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بےنظیر بھٹو کی وفات کے صدمے سے فائدہ اُٹھا کر کچھ ایسے عناصر بھی سرگرم ہو گئے ہیں جن کا مقصد لوٹ مار، خلق خدا کو ایذا دینا، جیلوں پر حملے کر کے مجرموں کو چھڑانا اور ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح یہ لوگ بےنظیر بھٹو سے محبت کا ثبوت دے رہے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ معصوم لوگوں کے قتل عام، شہریوں کے نقصان، لاقانونیت کے پرچار اور لوٹ مار پر بےنظیر بھٹو کی روح کو تکلیف پہنچ رہی ہوگی۔ اس لیے پی پی پی کے کارکنوں اور بےنظیر بھٹو کے جاں نثاروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے عناصر پر نگاہ رکھیں، لاقانونیت کی حوصلہ شکنی کریں اور صبر وتحمل کا دامن نہ چھوڑیں۔ اگر انہیں بےنظیر بھٹو سے محبت ہے تو اس کے مشن سے محبت کریں اور اس کے مشن کی شمع لے کر ملک میں اُجالا کریں۔ بےنظیر بھٹو کا مشن تھا، آمریت کا خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی، قومی یک جہتی اور ملکی استحکام، غربت، جہالت اور لاقانونیت کا خاتمہ، عدلیہ کی آزادی اور قانون کی حکمرانی وغیرہ وغیرہ۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے پی پی پی کے کارکنوں کا یہی سیاسی ورثہ ہے اور اسی مشن کو آگے بڑھا کر وہ ذوالفقار علی بھٹو اور بےنظیر بھٹو کی روحوں کو خوش کر سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے عناصر اور ایسی لابی بھی موجود ہے جو ان مواقع کو اپنے ایجنڈے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ محترم آصف زرداری صاحب نے کچھ جوشیلے حضرات کو پنجاب کے خلاف نعرے لگانے سے منع کر کے اعلیٰ فہم وفراست کا ثبوت دیا۔ میرا خیال ہے کہ پی پی پی کے مخلص کارکنان ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بھٹو خاندان کو ہمیشہ جتنی محبت، عقیدت اور سیاسی حمایت پنجاب سے ملی ہے شاید اتنی کسی اور صوبے سے نہیں ملی۔ پی پی پی کی بنیاد بھی لاہور میں رکھی گئی، 1971ء میں پنجاب ہی بھٹو صاحب کو اقتدار میں لایا اور پنجاب نے ہی اُن کی قید و بند اور پھانسی کے خلاف قربانیاں دیں اور 1986ء میں بےنظیر کا تاریخی استقبال کر کے آمریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ عناصر بےنظیر کی موت کے زخم سے فائدہ اُٹھا کر صوبائیت کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں، ملکی استحکام کو داؤ پر لگانا چاہتے ہیں اور پاکستان کے دشمن ممالک کے عزائم کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ یہی عناصر ملک میں بےیقینی، عدم استحکام، لاقانونیت اور لوٹ مار کا پرچار کر رہے ہیں جو بہرحال بےنظیر بھٹو کے مشن کی نفی ہے۔ اس موقعہ پر ہندوستان نے پاکستان سے ریل اور ہوائی رشتے منقطع کر کے اور بارڈر پر فوج کو الرٹ کر کے مثبت پیغام نہیں دیا کیونکہ بےنظیر ہندوستان سے دوستی چاہتی تھی اور موجودہ حکومت اس ضمن میں بہت سے اقدامات کر چکی ہے۔ اس لیے ہندوستان کو پاکستان سے کیا خطرہ لاحق ہوسکتا تھا؟

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پاکستان کی بیٹی

خورشید ندیم

کسے معلوم تھا کہ یہ بے نظیر کا آخری کھانا ہے۔ اس نے دسترخوان سے ایک نان اُٹھایا اور کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے شوربا چاہیے۔'' اس کی آواز سن کر بابر اعوان نے ایک پلیٹ میں چند چمچ شوربا ڈالا اور پلیٹ اسے تھما دی۔ اس نے نان کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ بابر کو دیا اور کہا ''آپ بھی کھائیں۔'' وہ اس دوران میں کھڑکی سے دور تک پھیلے اُفق کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے قرآن مجید لانے کو کہا۔ اس نے قرآن کو سینے سے لگایا، اسے چوما، ساتھیوں کو اشارہ کیا اور سوئے مقتل روانہ ہوگئی۔

بھٹو خاندان کی سیاسی داستان کا آخری باب سناتے سناتے ڈاکٹر بابر اعوان یہیں تک پہنچے تھے کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ میں اُن کی سسکیاں سن رہا تھا اور قلم میرے ہاتھ میں خاموش تھا۔ الفاظ آپ کی گرفت میں ہو سکتے ہیں لیکن جذبات کسی کے قابو میں کہاں آتے ہیں۔ دو دن سے جذبات کسی کے قابو میں نہیں۔ چاہنے والوں کا اضطراب تو سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کی دنیا لٹ گئی، یہ مخالفین کو کیا ہوا کہ اُن کے ہاں بھی صف ماتم بچھی ہے؟ میرے گھر میں بھٹو خاندان کا ذکر خیر کم ہی ہوا ہے لیکن آج میری ماں کو اپنے آنسوؤں پر قابو ہے نہ میری اہلیہ کو۔ وہ دوست جو پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، اُن کے فون آتے ہیں تو سب کی آوازیں بھرائی ہوئی ہیں۔ میں اس سارے عمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر اس کی آخری تقریر، اس کے آخری الفاظ میرے کانوں سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ ان لفظوں میں میرا پاکستان ہے، ان میں میرے پنجاب کے لیے محبت ہی محبت ہے۔ ان میں میرے راولپنڈی کے لیے نیک تمنائیں ہیں، وہ میرے بچوں کے لیے ایک یونیورسٹی بنانے کا وعدہ کر رہی ہے۔ یہی نہیں وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا فخر سے ذکر کر رہی ہے۔ وہ مسرت سے کہہ رہی ہے کہ میزائل پروگرام اس نے شروع کرایا تھا۔ وہ میرے پاکستان کو درپیش خارجی خطرات ہی کی بات نہیں کر رہی، داخلی خطرے سے بچانے کا عزم بھی کر رہی ہے، وہ خطرہ جو

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

میں اس پس منظر میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ہمارے سیاست دانوں کا امتحان شروع ہو چکا ہے۔ انتخابات ہوتے نظر نہیں آتے اور اگر ہوئے بھی تو نئے بحران کو جنم دیں گے اور جلتی پر تیل کا کام دیں گے۔ اس لیے اب سیاست دانوں اور کارکنوں کو نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے میدان میں اُترنا چاہیے۔ حکومت کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ نہ ان مسائل کے حل کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ ہی نئے چیلنجوں سے نپٹ سکتا ہے اس لیے قومی حکومت کا قیام وقت کا اہم تقاضا دکھائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں بے نظیر بھٹو کے انتقال کے بعد دوسرے اہم قومی لیڈر میاں محمد نواز شریف پر یہ ذمہ داری عائد ہوگئی ہے کہ وہ ملک کی سیاسی قوتوں کو یک جا کر کے قوم کو اس سیاسی بحران سے نکالیں، بے یقینی، مایوسی، لاقانونیت اور لوٹ مار کے خاتمے کے لیے حکمت عملی وضع کریں اور ملک بھر میں تمام سیاسی کارکنوں کو متحرک کریں، حکومت پر قومی حکومت کے قیام کے لیے دباؤ بڑھائیں اور صوبائیت کے نام پر اُبھرنے والے فتنے کا قلع قمع کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ میاں صاحب کو چاہیے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے تمام سیاسی جماعتوں اور جمہوری قوتوں کو اکٹھا کریں، اُن کی قیادت سے میٹنگ کر کے ان چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حکمت عملی بنائیں اور ملک بھر کی جمہوری قوتیں مل کر ملکی استحکام اور قومی یک جہتی کے لیے بھرپور مہم کا آغاز کریں۔ میرے نزدیک یہ وقت کا اہم ترین تقاضا بھی ہے اور بے نظیر بھٹو کے مشن کی جانب ایک اہم قدم بھی.....

باقی پھر ان شاء اللہ!

روزنامہ جنگ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

پورے پاکستان کو درپیش ہے لیکن آج بطور خاص اس کے اپنے وجود کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ اب بات میری سمجھ میں آنے لگی ہے۔ میری ماں کے آنسوؤں کا مفہوم مجھ پر واضح ہو رہا ہے۔ دوستوں کے اضطراب کی گرہیں بھی کھل رہی ہیں، مخالفین کا دُکھ بھی اب میں جان سکتا ہوں۔ کسی کے لیے اب یہ راز نہیں رہا کہ اس کا دل صرف سندھ کے لیے نہیں پنجاب کے لیے بھی دھڑکتا تھا، وہ سرحد اور بلوچستان کے لیے بھی پریشان تھی۔ وہ وفاق کی علامت تھی۔ لیکن کیا وہ وفاق کی آخری علامت تھی؟ یہی سوال چاہنے والوں کے سامنے ہے اور مخالفین کے بھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ اُن کے اضطراب میں کمی نہیں آ رہی۔ بے نظیر نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز سرحد کے شہر مردان سے کیا۔ سرحد سے ہوتے ہوئے اس نے بلوچستان کا رُخ کیا۔ اسی دوران میں کوئٹہ چھاؤنی میں خودکش حملہ ہوا اور 21 افراد اس کی نذر ہو گئے۔ سب نے اُسے کوئٹہ جانے سے روکا لیکن اس کا کہنا تھا ''بلوچستان میری زندگی سے زیادہ اہم ہے، سب نے بلوچستان کو اکیلا چھوڑ دیا ہے، میں نہیں چھوڑوں گی۔'' پھر گاما سٹیڈیم میں اس نے ہزاروں افراد کے سامنے پاکستان، قائداعظم اور مکالمے کی بات کی۔ اُس نے کہا ''بلوچستان کے لوگ میرے لیے سب سے زیادہ عظیم ہیں۔ انہیں کسی نے فتح نہیں کیا، یہ اپنی مرضی سے پاکستان کا حصہ بنے ہیں۔'' اس کا کہنا تھا کہ میں نے 1989ء میں بلوچستان کے جلاوطن راہنماؤں کو واپس بلایا اور اُن سے مذاکرات کیے۔ آج میں پھر مکالمے کا دروازہ کھولنا چاہتی ہوں۔ اس نے طلال بگتی کے گھر کا رُخ کیا تو وہاں گرنیڈ پھینکے گئے۔ اس کے باوجود وہ اُس کے گھر پہنچی۔ بے نظیر نے گولیوں کے زخموں پر اپنی محبت کا مرہم رکھا۔ وہ ٹوٹنے والوں کو ایک بار پھر پاکستان کے ساتھ جوڑنے گئی تھی۔ بلوچستان کی آزاد فضاؤں میں کئی برس بعد پاکستان اور قائداعظم کا محبت کے ساتھ ذکر ہوا۔ بلوچستان اور سندھ میں دو دفعہ جب بعض مقررین نے جلسوں میں صوبائیت کی بات کی تو بے نظیر نے انہیں سختی سے روک دیا اور کہا میں اہل پاکستان کو قریب کرنے آئی ہوں، دور کرنے نہیں۔ بے نظیر بھٹو کا یہ کردار جیسے جیسے نمایاں ہو رہا ہے، لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج سارا پنجاب بے نظیر کے لیے افسردہ ہے۔ نواز شریف ہر خطرے کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہسپتال پہنچے اور بے نظیر کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ قاضی حسین احمد نے انہیں شہید قرار دیا۔ گویا اس دُکھ کو پورے پاکستان نے محسوس کیا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ رسمی نہیں ہے۔ یہ دُکھ حقیقی ہے۔ بے نظیر نے دل سے پاکستان کو چاہا اور آج ہر پاکستانی بھی اسی طرح اُس کے لیے افسردہ ہے جیسے اس کے گھر کا کوئی فرد دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ میرے دُکھ کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جب میں اُن کی سیاسی زندگی پر غور کرتا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہوں تو اس میں ایک ارتقا نظر آتا ہے۔ تجربات، دُکھوں اور مطالعہ نے انہیں بالغ نظر بنا دیا تھا۔ آج کی بے نظیر اور دس سال پہلے کی بے نظیر میں ایک نمایاں فرق ہے۔ میرا دُکھ یہ ہے کہ جب بھی کوئی بالغ نظر ہو جاتا ہے، وہ مر جاتا ہے یا ہم اسے مار دیتے ہیں۔ ''بے نظیر کو کس نے مارا؟'' یہ القائدہ ہے یا بابر اعوان کے الفاظ میں کوئی ''القاعدہ'' ہے جس کے سیاسی مفادات کو بے نظیر سے خطرہ تھا۔ شاید ہم کبھی بھی اس سوال کا جواب تلاش نہ کر سکیں۔ تاہم ایک بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ پاکستان کی واحد سیاسی راہنما تھیں جنہوں نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کو پاکستان کے استحکام کے لیے سنگین خطرہ قرار دیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس معرکے میں اُن کی جان جا سکتی ہے، وہ اس کے خلاف میدان میں نکلیں۔ اُن کے بعد کوئی ایک سیاست دان ایسا نہیں ہے جو اُن کی طرح یہ جرأت رکھتا ہو کہ وہ اس انتہا پسندی کے خلاف برسر پیکار ہو جس نے مسلمان معاشروں بالخصوص ہمیں برباد کر دیا اور سولہ کروڑ عوام کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ بے نظیر اپنے نامہ اعمال کے ساتھ دنیا سے رُخصت ہو گئی۔ میری اور ہر عام آدمی کی طرح اس میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔ تاہم اپنی موت سے اس نے ایک بات آخری درجے میں ثابت کر دی ہے کہ وہ پاکستان کی بیٹی تھی اور اندر سے ایک عام پاکستانی کی طرح تھی، جو شوربے کے ساتھ نان کھاتا اور قرآن کو اپنے سینے سے لگاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جانتے بوجھتے سوئے مقتل کوئی کوئی جاتا ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

روزنامہ جنگ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو..... کچھ یادیں کچھ باتیں

شیری رحمٰن

اس بات کو 40 دن گزر چکے ہیں جب راولپنڈی کے لیاقت باغ کے باہر دن کی روشنی میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو سرعام قتل کر دیا گیا۔ بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح میرے لیے بھی یہ ناقابل یقین اور ناممکن بات ہے کہ اس دنیا کو بے نظیر بھٹو کے بغیر دیکھوں، گڑھی خدا بخش ان کی قبر پہ جاؤں لیکن یہ حقیقت ہے اور ایسا ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی پرچھائیاں ہمارے آس پاس ہیں۔ ان کا خواب، ان کا پیغام پاکستان پیپلز پارٹی، بلاول، بختاور، اور آصفہ میں محترمہ بے نظیر بھٹو مجسم ہیں۔ وہ یقینی طور پر زندگی سے بالاتر ہیں اس لیے وہ ہم سے جدا نہیں ہوئیں اور ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ 18 اکتوبر کو وطن واپسی کے چند ہفتے بعد ان کی تصویریں دیکھیں تو یہ ہی واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ان کا چہرہ پاکستان کے متعلق، ان کے عزم اور خواب سے چمک رہا تھا۔ ان کا خواب اب ہمارے پاس ایک اثاثہ ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی زندگی میں بھی بہت اہم تھیں اور اپنی شہادت کے بعد بھی اہم ہیں۔

جب میں پہلی مرتبہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملی تو اس وقت وہ وزیر اعظم تھیں اور ایسی بے نظیر بننے کے عمل سے گذر رہی تھیں جس سے اسٹیبلشمنٹ نفرت کرتی تھی۔ وہ اپنے شہید والد کے چیلنج کو لیکر آئیں تھیں اور ایسی خاتون کے روپ میں ڈھل گئیں تھیں جسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

1980ء کی ہنگامہ خیز دہائی میں ایک صحافی کے طور پر مجھے ذاتی طور پر اس طاقتور، جمہوریت دشمن مافیا کا تجربہ ہوا جو ہمیشہ پاکستان پیپلز پارٹی کو نیچا دکھانے میں پیہم پیکار رہتا تھا۔ 1986ء میں ان کی وطن واپسی کے موقع پر میں ہیرلڈ انگریزی رسالہ کی ایڈیٹر تھی۔ ہم نے ٹائٹل سٹوری شائع کی کہ بے نظیر بھٹو سے کون خوف زدہ ہے۔ یہ ٹائٹل ان تمام قوتوں کے لیے تھا جو بے نظیر سے خوفزدہ تھیں اور ان کے قتل تک ان کے خلاف کام کرتی رہیں۔ یہ قوتیں بے نظیر بھٹو سے اس لیے خوفزدہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تھیں کہ وہ پاکستان کی واحد سیاستدان تھیں جس کی قوت ڈرائنگ روم کی بجائے عوام میں تھی وہ گلیوں اور بازاروں میں اپنے عظیم والد کی طرح عوام کے خوابوں کو متحرک کرنے کی قوت رکھتی تھی ان کے پاس جو وراثت تھی وہ اور کسی کے پاس نہیں تھی۔ انہیں عوام کی جو محبت حاصل تھی اس کے لیے کسی سرکاری فنڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ عوام دشمن قوتوں کی بدصورتی ظاہر کرنے والا آئینہ تھیں اور طاقتور سرکاری مافیا کے لیے طاقتور چیلنج تھیں۔ بے نظیر بھٹو کے دشمنوں نے انہیں قتل کر کے بلند و بالا کر دیا۔

اپنی تمام زندگی میں پہلی جلاوطنی سے دوسری جلاوطنی تک اپنے دونوں حکومتوں میں بے نظیر بھٹو کو نئے سے نئے چیلنج درپیش رہے۔ اسٹیبلشمنٹ کے ہاکس ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے تھے۔ بے نظیر بھٹو ہمسایہ ممالک کے ساتھ امن و استحکام کی بنیاد رکھنے والی خارجہ پالیسی کی معمار تھیں۔ تمام جنوبی ایشیا کو نگلنے والی سرد جنگ کے خاتمہ کی بانی تھیں اور آج محترمہ بے نظیر بھٹو کو سیکیورٹی رسک کہنے والے بھارت کے ساتھ کمپوزٹ ڈائیلاگ میں گول پتھر کی طرح گھسیٹ رہے ہیں۔ انہوں نے نجی شعبہ کے اتحاد کے ساتھ اپنی حکومت میں پاکستان کو دنیا کی 10 تیزی کے ساتھ ترقی کرتی معیشتوں میں شامل کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنا زندگی میں ملنے والے ایک انعام کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ نئے تصورات پیش کرتی تھیں اور نئے اصول ضوابط وضع کرتی تھیں۔ ہم سب بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جمہوریت کی خاطر کس طرح جنگ لڑ رہی تھیں۔ یہ سب بہت اچھی طرح جانتے ہیں ان کے پاس دیوتاؤں جیسی طاقت، حوصلہ اور استحکام تھا۔ اپنی ہر تقریر پر پالیسی بیان کرتیں وہ خواتین، بے گھر، لاچار، بے روزگاروں، محنت کشوں اور کسانوں کے لیے لڑتی تھیں۔ پارٹی کا آخری منشور بھی انہیں خوابوں پر مشتمل تھا۔ پارٹی منشور کی تیاری کے دنوں میں ایک روز انہوں نے مجھے دوبئی سے علی الصبح دو بجے فون کیا۔ وہ غریب بچوں کے ''بورڈنگ سکول'' اقامتی تعلیمی اداروں کے تصور پر بات کر رہی تھیں اور سرکاری تعلیمی اداروں میں بچوں کو بنیادی غذا فراہم کرنے کی خواہاں تھیں۔ ایک اور رات وہ دو گھنٹہ تک اس بات پر بحث کرتی رہیں کہ ترقیاتی فنڈز کو روزگار کی فراہمی کے لیے کیوں نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ یہ بحث اس فیصلہ پر ختم ہوئی کہ سالانہ ترقیاتی پروگرام میں کم آمدن والے خاندانوں کو روزگار فراہم کیا جائے گا۔ وہ پاکستان کو ویلفیئر ریاست بنانا چاہتی تھیں۔ سیکنڈے نیوین ممالک کی طرح وہ ریاست کو سماجی بہبود روزگار کا ذمہ دار بنانا چاہتی تھی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

یادیں

سینیٹر ڈاکٹر بابر اعوان

غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزارنے والی قوم کے سیف برائٹ احتساب سیل کا ''یک نکاتی'' ایجنڈا بھٹو احتساب کا ایجنڈا عروج پر تھا۔ وقت کے منصفوں نے جلد اور فوری انصاف کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ ایس جی ایس ریفرنس میں شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کے ٹرائل میں، بالی کے جوتوں اور اٹلی کے سوٹوں، سونے کی زنجیروں سے لدھے پھندے بیورکریٹ پر میں بی بی شہید کے وکیل کی حیثیت سے تین ماہ سے جرح کر رہا تھا۔ تقریباً چار بجے شام عدل کا تقاضا پورا ہوا، ہم عدالت سے باہر نکلے تو سینیٹر آصف علی زرداری نے ہوا اور روشنی سے محروم خصوصی طور پر بنائی گئی بیرک میں بیٹھتے ہوئے مجھے کہا "See you good looking in jail now" پھر واقعی اگلی رات وکیل اور موکل دونوں اڈیالہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے اکٹھے تھے۔ محترمہ میرے گھر پہنچ گئیں۔ پریس کانفرنس بلائی، میرے بیٹوں عبداللہ اور عبدالرحمن کو گود میں بٹھایا اور کہا ''جب تک میرا وکیل رہا نہیں ہوتا میں روزانہ یہاں آؤنگی''۔ رہائی والے دن پھر تشریف لائیں، رات کے وقت تک صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی رہیں۔ پاکستانی سیاست اور انصاف کے ایوانوں میں اسٹیبلشمنٹ کے کردار کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے ایک سوال کیا جس کے جواب میں پہلے وہ کھلکھلا کر ہنسیں پھر کہنے لگیں..... بہت سادہ اور وہ اس طرح کہ اگر ان کی بات سننا شروع کر دیں تو وہ آپ کو اپنی پوزیشن کو کمزور کرنے کے طریقے بتلاتے ہیں..... اور اگر ان کی بات نہ سنی جائے تو پھر وہ آپ کے سیاسی مخالفین کو آپ کی پوزیشن کمزور کرنے کے طریقے بتلانے لگتے ہیں..... یہ 1988ء کا ذکر تھا۔ آج 2008ء میں کئی عدد بظاہر اہل دانش، بظاہر پاکستان پیپلز پارٹی کے ہمدرد اور بظاہر جمہوریت کے نوحہ گر پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کے حوالے سے بالکل ایسا ہی کردار ادا کر رہے ہیں۔ دانش کے ان پتلوں کو 18 اکتوبر کے سانحہ کارساز میں پی پی پی کی ساری قیادت کو ملکی سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے صرف اس بات پر حیرانی تھی کہ شہید بی بی صاحبہ اتنے بڑے قتل عام سے کس طرح بچ نکلی ہیں ان کا کہنا تھا کہ یہ خون

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو بروقت فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ ان کی بصیرت دور تک دیکھ لیتی تھی۔ بالکل اس طرح جس طرح ان کی بصیرت انہیں اپنی وصیت لکھنے پر اُکسا رہی تھی۔ پاکستان کو تبدیل کرنے کے مشن پر بھی ان دنوں عجلت میں نظر آتی تھیں۔ انہوں نے ہمیں سودن کا ایکشن پروگرام تیار کرنے کو کہا تھا تا کہ پیپلز پارٹی حکومت میں رہے تو اس پروگرام پر عمل درآمد کیا جا سکے لیکن تقدیر کا کلہاڑا پہلے ہمارے سروں پر آن گرا۔ وہ مسلسل کام کرتی تھیں اور اس بات کو یقینی بناتی تھیں کہ ان کے تصورات ہمارے کمپیوٹر میں آ چکے ہیں اور اب ہم نے اُن پر کام کرنا ہے۔ وہ اپنے آخری دن تک مسلسل کام کرتی رہیں بالکل اپنے والد کی طرح 18-18 گھنٹے۔ ان کے اسٹاف کو ملنے والی آخری ای میل ساڑھے تین بجے علی الصبح بھیجی گئی تھیں جب کہ صبح کا آغاز ساڑھے چھ بجے تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو دوسرے رہنماؤں سے اس لیے مختلف تھیں کیوں کہ وہ اپنے وقت سے آگے تھیں۔ وہ اپنی دوربین نگاہوں سے دیکھ چکی تھیں کہ اگر انتہا پسندوں کو آگے بڑھ کر نہ روکا گیا تو وہ پاکستان کو گہری کھائیوں میں دھکیل دیں گی۔ یہ چیلنج انہیں راتوں کو جگائے رکھتا تھا۔ وہ سیاست کے سمندر میں کھیلتی تھیں۔ ہر حکومت کے ساتھ ان کی بات چیت کا نکتہ مثالی ہوتا تھا کہ مقابلہ کے لیے یکساں مواقع مل سکیں۔ وہ شفاف انتخابات کی خواہاں تھیں تا کہ عوام کے اصل نمائندے پاکستان کو بحران سے نکال سکیں۔ ان کے شہید والد نے بھی عوام کے لیے جان قربان کی۔ انہیں اس بات کا خوف نہیں تھا کہ انہیں زندگی کے بہترین دور میں زندگی سے محروم کیا جا رہا ہے۔ انہیں صرف اس بات کا خوف تھا کہ پاکستان اس کے بچوں کے لیے محفوظ نہیں رہے گا۔ وہ پاکستان کی واحد رہنما تھیں جنہوں نے مذہبی انتہا پسندی اور عسکریت پسندی کے خلاف جنگ کو ملک کا اندرونی چیلنج سمجھا اور زمین پر واضح لکیر کھینچی۔ عورتوں کی آزادی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور ان لوگوں سے بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جو فوجی جوانوں کو اغوا کر لیتے ہیں، سکولوں کی بسوں کو جلا دیتے ہیں۔ وہ اصلاحات اور سیکیورٹی اقدامات کے ذریعے اس چیلنج سے نمٹنا چاہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ کسی اور ملک کی جنگ نہیں بلکہ پاکستان کے بقاء کی جنگ ہے۔ میں اپنی تحریر ان کے اس اقتباس سے ختم کرتی ہوں جو انہوں نے ایک عالمی فورم میں کی:

''میں صرف مسلمان عورتوں اور مردوں کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر کی عورتوں اور مردوں کی ترقی کے نئے مواقع کی خواہاں ہوں۔ میرے ذہن میں پاکستان کے لیے خواب ہے صرف دنیا کی دیگر خواتین کی طرح میرے ایک ہاتھ میں مواقع اور دوسرے ہاتھ میں چیلنج ہے''

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آشام حملہ محض دھمکانے کے لیے ہوسکتا ہے یا عوام کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے کیا گیا کوئی ڈرامہ..... قوم کے 181 شہیدوں اور 800 کے قریب بم خوردہ جاں نثاران بے نظیر کا لہو بھی انہیں متاثر نہ کرسکا اور نہ ہی وہ تین ملین عوام کا سمندر جو دخترِ مشرق کے گیارہ سالہ دورِ اپوزیشن کے بعد بھی 1986ء والی جگہ پر ہی کھڑا رہا اور پیچھے نہیں ہٹا تھا۔

شہید بی بی سانحہ کارساز سے بچ نکلیں تو ان ''متاثرین جمہوریت'' نے NRO کا تازیانہ پکڑ لیا۔ چنانچہ 12 اکتوبر 1999ء کے عسکری انقلاب کی جانب سے نافذ کردہ LFO کے تحت حلف اُٹھا کر مشرف سے ذاتی وفاداری کا تحریری اور دستخطی عہد کرنے والے مجاہد صفت منصفوں نے NRO کے خلاف مقدمہ عدالت ''بلوانے'' کے لیے تمام عدالتی آداب کو پاؤں تلے روند کر ان الفاظ میں ایڈوانس فیصلہ دے دیا کہ..... یہ کیسا آرڈیننس ہے؟؟؟ ہم اسے خلاف قانون اور ماورائے آئین سمجھتے ہیں.... ان ریمارکس کے میڈیا میں آتے ہی NRO کے خلاف پیٹشنوں کی بھرمار ہوگئی مگر پھر بھی نہ پی پی پی لڑکھڑائی اور نہ شہید بی بی میڈیا ٹرائل سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹیں۔ چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ اس عرصے میں زخموں سے چور پیپلز پارٹی کے خلاف احساس شکست کے مارے ہوئے مایوسیوں کے مسافر ایک اور ہتھیار تراش لائے، شہید بی بی کے ذاتی طور پر قریبی لوگ جانتے ہیں کہ وہ اسے ہمیشہ ''تھرڈ آپشن گیم'' قرار دیتی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ شہید بی بی کے علاوہ پیپلز پارٹی کے نام پر ایک بظاہر آزادی پسند اور فرضی جمہوری قیادت تراشی جائے۔ درحقیقت یہ وہی سازشی ''گنڈاسا'' تھا جسے 2002ء کے انتخابات میں عوام نے مردِ حر آصف علی زرداری کی سالہا سال سے مسلسل قید تنہائی اور بی بی شہید کی جلاوطنی کے باوجود 88 لاکھ ووٹوں تلے دفنا دیا تھا۔ اس گنڈاسے کو نیا رنگ و روغن کر کے پھر نکالا گیا اور شہید بی بی کے فیصلوں کے خلاف بغاوت کی ''علامت'' اور مزاحمت کے ہتھیار کے طور پر آزمایا گیا۔ اس دوران اس ملک کی فقیرنی محبتوں کے گجرے ہاتھوں میں لے کر وطن کی گلیوں پہ نثار ہونے کے لیے عوام میں نکل آئی۔ جس کے نتیجے میں ''تھرڈ آپشن'' اپنی موت آپ مر کر ہاٹ چاکلیٹ سے باسی کڑہی میں تبدیل ہو کر اپنی افادیت اور لذت دونوں کھو بیٹھا۔ 27 دسمبر کی سرد شام کے بعد اسی باسی کڑہی کو پھر مواقع کے چولہے پر چڑھایا گیا اور وہ جنہوں نے نہ کبھی شہید بی بی اور ان کے جیون ساتھی کے حق میں کلمہ خیر کہا تھا اور نہ ہی کبھی ان کے قافلے میں شامل ہونے کی جرأت کی تھی اور نہ ہی ان کے سیاسی وژن اور فیصلوں سے اتفاق کیا تھا۔ انہیں یک دم پھر یہ خیال ''پیش'' کیا گیا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت ان کی پسند کے ہاتھوں میں جانی چاہئے۔ بالکل ویسے ہی ہاتھ جیسے درجن پیپلز پارٹی بنا بنا کر عاجز آچکے ہیں، جنہیں پاکستان کے پے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہوئے عوام اور محروم طبقات ان کے ''پیش کاروں'' سمیت اچھی طرح سے پہچانتے ہیں۔ شاید انہی ہاتھوں کو پہچاننے والے کسی مزدور نے ملک بھر کی ویگنوں اور بسوں کے پیچھے یہ عوامی اعلان لکھ دیا ہے (خرچہ مالکاں دا..... نخرہ نوکراں دا) یعنی خرچ مالک کرتا ہے اور نخرہ نوکر دکھاتا ہے۔ مگر دوسری طرف پاکستان کے ہاری، مزدور، طلبہ، اقلیتیں اور خواتین وحضرات یہ سمجھتے اور جانتے ہیں کہ شہید بی بی کی سیٹ اپنے شہید بابا کی طرح ''نشست شہادت'' ہے۔ حضرت اقبال کے بقول شاہینوں کا نشیمن زاغوں کے تصرف میں کبھی نہیں آسکتا۔ جس دن بی بی شہید نے کوئٹہ کے گاما سٹیڈیم میں خطاب کرنے جانا تھا اس دن ان کو شدید **Lingitus** اور بخار تھا، ہمارے جلسۂ عام میں پہنچنے سے پہلے انہیں بے شمار جگہ سے کہا جاچکا تھا کہ عوامی جلسے میں نہ جائیں۔ جلسے کے اسٹیج پر ان کے دائیں طرف کی نشست پر نوابزادہ لشکری رئیسانی اور بائیں طرف والی نشست پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹیج کے سامنے بلوچستان کے غیرت مندوں کا طوفان ''چاروں صوبوں کی زنجیر بے نظیر'' کے نعروں سے کوہ سلیمان میں زلزلہ برپا کر رہا تھا۔ بی بی شہید نے مجھے مخاطب کیا اور کہا.....

''سیاست دان اور لیڈر میں فرق ہوتا ہے، سیاست دان جان بچاتا ہے، سہولت دیکھتا ہے، ہوا کے ساتھ رُخ بدلتا ہے اور ڈر کر کبھی قبلہ کبھی موقف بھی تبدیل کرتا ہے مگر لیڈر کی جان عوام میں ہوتی ہے۔ اُسے عوام سے دور کر دیا جائے تو اس کی جان نکل جاتی ہے، میں عوام سے دور نہیں رہ سکتی، میں عوام کی لیڈر ہوں..... سیاست دان عوام سے قربانی مانگتا ہے اور لیڈر عوام کے لیے خون کی قربانی پیش کرتا ہے۔''

وہ تقریر کے لیے اُٹھتی تھیں تو اپنی تسبیح مجھے پکڑا دیتی تھیں، تقریر کے بعد وہ مجھ سے تسبیح ضرور لے لیتی تھیں..... لیاقت باغ میں بھی انہوں نے ایسا ہی کیا تھا مگر نہ جانے کیوں 27 دسمبر کی شام انہوں نے یہ تسبیح مجھ سے واپس نہیں مانگی تھی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

قاتل کون؟

قیوم نظامی

پاکستان کی تاریخ سیاسی قتلوں سے بھری پڑی ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو لیاقت باغ راولپنڈی میں قتل کیا گیا۔ آج تک اُن کے قاتل بے نقاب نہیں ہو سکے۔ قتل کے جن کیسوں میں قاتل بے نقاب نہ ہوں اُن کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ اُن کے پیچھے ''خفیہ ہاتھ'' کارفرما تھے۔ جنرل ایوب خان 1951ء میں شاید بریگیڈیئر تھے انہوں نے لیاقت علی کی شہادت کے بارے میں اپنی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' میں تحریر کیا:۔

''میں نے کراچی میں کابینہ کے کئی ارکان سے ملاقات کی۔ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین اور دوسرے افراد سے ملا۔ اُن میں سے کسی نے لیاقت علی خاں کا ذکر تک نہ کیا۔ اور نہ ہی میں نے اُن سے ہمدردی اور خوف کا کوئی لفظ سنا۔ گورنر جنرل غلام محمد کو بھی احساس نہیں تھا کہ ملک ایک ممتاز اور اہل وزیراعظم سے محروم ہو گیا ہے۔ میں حیران تھا یہ لوگ اس قدر سنگ دل، بے حس اور خودغرض بھی ہو سکتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کو ترقی مل گئی۔ یہ میرے لیے نفرت انگیز اور بغاوت پر آمادہ کرنے والا رویہ تھا۔ مجھے واضح طور پر یہ تاثر ملا کہ وہ سب سکون محسوس کر رہے تھے کہ واحد شخصیت جو اُن کو کنٹرول کر سکتی منظر سے ہٹ گئی ہے۔''

عوامی مقبولیت ہی شاید کسی لیڈر کا سب سے بڑا ''جرم'' ہوتا ہے۔ اس ''جرم'' کی پاداش میں اسے سیاسی منظر سے ہٹا دیا جاتا ہے تاکہ وہ ''مخصوص ٹولے'' کے مفادات کے لیے رکاوٹ نہ بن سکے۔ مقبول لیڈر کے قتل کے بعد عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بیرونی ممالک سے ٹیمیں بلا کر تفتیش کرائی جاتی ہے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد بھی سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم پاکستان آئی مگر قاتل بے نقاب نہ ہوئے۔ امریکہ اور برطانیہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کو اولین ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے مفادات سانجھے ہیں لہٰذا عالمی طاقتیں اپنے ''محسنوں'' کو کمزور نہیں کر سکتیں۔ البتہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جب محسن اُن کے لیے بے کار ہو جائے تو اسے بدقسمت طیارے میں سوار کر دیا جاتا ہے۔

حسین شہید سہروردی مقبول عوامی رہنما تھے وہ سول عسکری اسٹیبلشمنٹ کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ جنرل ایوب نے انہیں ایبڈو کر دیا اور انہیں جیل میں قید رکھا۔ ذوالفقار علی بھٹو جب تک ایوب کابینہ میں شامل رہے وہ اسٹیبلشمنٹ کے لیے محبوب رہے۔ انہوں نے جب جنرل ایوب سے تعلق توڑ کر پاکستان کے عوام سے رشتہ جوڑ لیا تو اسٹیبلشمنٹ نے انہیں اپنا دشمن تصور کر لیا۔ بھٹو شہید کی عوامی مقبولیت سے خوف زدہ ہو کر اُن پر 8 قاتلانہ حملے کرائے گئے۔ بھٹو شہید نے 1970ء میں انتخابات جیت کر اقتدار حاصل کیا تو اسٹیبلشمنٹ نے اُن کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازشیں پکڑی گئیں۔ آرمی چیف جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم کی گفتگو ریکارڈ کی گئی۔ خفیہ ٹیپ کے مطابق دونوں آرمی آفیسر یہ گفتگو کر رہے تھے کہ اُن کا خیال تھا کہ بھٹو کو دو سال تک اقتدار میں برداشت کرنا پڑے گا مگر حالات بتا رہے ہیں کہ چھ ماہ کے اندر ہی بھٹو کو اقتدار سے رخصت کر دیا جائے گا۔ بھٹو شہید نے جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم کو زبردستی ریٹائر کر دیا۔ 1977ء کے انتخابات میں پی پی پی کے مقابلے میں پی این اے کا اتحاد کھڑا کیا گیا تاکہ بھٹو شہید کو انتخابی شکست دی جا سکے۔ پی پی پی انتخابات جیت گئی تو ایجی ٹیشن کے لیے پی این اے کو وسائل مہیا کیے گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کو بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ 4 اپریل 1979ء کو پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم کو پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا۔ گوہر ایوب خان نے اپنی کتاب ''اقتدار کے ایوانوں میں'' میں تحریر کیا ہے کہ ''ایک حاضر سروس میجر جنرل نے گوہر ایوب کو کہا کہ اگر سپریم کورٹ نے بھٹو کو قتل کے مقدمے سے بری کر دیا تو وہ خود اپنے ہاتھ سے بھٹو کو گولی مار دے گا۔'' بھٹو شہید اسٹیبلشمنٹ کا براہ راست اور بلا واسطہ شکار ہوئے۔

جنرل ضیاء الحق اور اُن کے رُفقاء کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ بھٹو کی شہادت کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو عوام میں مقبولیت حاصل کر لیں گی۔ جنرل ضیاء الحق نے پی پی پی کو ختم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا۔ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر کو جیلوں میں بند کیا تاکہ اُن کے حوصلے پست ہو جائیں اور وہ سیاست ترک کر دیں۔ 1988ء کے انتخابات میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا راستہ روکنے کے لیے آئی ایس آئی نے آئی جے آئی تشکیل دی جس کا اعتراف جنرل (ر) حمید گل نے کیا۔ محترمہ پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہو گئیں مگر اُن کو چیف ایگزیکٹو کے پورے اختیار نہ دیئے گئے۔ اُن کو قتل کرنے کی کئی کوششیں ہوئیں۔ فوج کے اندر سے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ہوئی۔ 1990ء کے انتخابات میں جنرل (ر) اسد درانی کے حلفیہ بیان کے مطابق پی پی پی کے مخالف اُمیدواروں میں مہران بنک کے چودہ کروڑ روپے تقسیم کیے گئے۔ اسٹیبلشمنٹ نے کبھی بے نظیر بھٹو کو قبول نہیں کیا۔ ان کا ''جرم'' یہ تھا کہ وہ عوام کی مقبول لیڈر تھیں۔

جنرل پرویز مشرف نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف خصوصی قوانین جاری کیے اور انہیں آٹھ سال تک جلاوطن رہنے پر مجبور کیا۔ محترمہ 2002ء کے انتخابات میں پاکستان واپس آ کر اپنی پارٹی کی انتخابی مہم کی قیادت نہ کرسکیں۔ جنرل پرویز مشرف کی خواہش تھی کہ محترمہ 2008ء کے انتخابات میں بھی پاکستان سے باہر رہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو علم تھا کہ اگر 2008ء کے انتخابات میں بھی وہ ملک سے باہر رہیں تو پاکستان، پی پی پی اور جمہوریت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاکستان اور جمہوریت کی خاطر وطن واپسی کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی آمد سے قبل صدر پرویز مشرف کے نام ذاتی خط لکھ کر اُن افراد کی نشاندہی کی جن سے محترمہ کی جان کو خطرہ تھا۔ جنرل پرویز مشرف نے محترمہ کے خط کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی اُتریں تو اُن کی ریلی پر خودکش حملہ ہوا جس میں 180 کارکن شہید ہوئے۔ محترمہ اور اُن کے رُفقاء معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ حکومت اس سانحہ کے ذمہ داروں کا تعین نہ کرسکی اور نہ ہی حکومت نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو اُن کے اطمینان کے مطابق سیکیورٹی مہیا کی۔ محترمہ نے مارک سیگل کو ایک خفیہ ای میل ارسال کی جس میں تحریر کیا کہ حکومت اُن کی سیکیورٹی کا تسلی بخش انتظام نہیں کررہی لہٰذا اُن کے قتل کی ذمہ داری صدر پرویز مشرف پر عائد ہوگی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو لیاقت باغ راولپنڈی میں گولی مار کر اور خودکش حملہ کر کے قتل کیا گیا۔ محترمہ کی شہادت کے وقت پولیس اور کمانڈوز اُن کی گاڑی کے اردگرد موجود نہیں تھے۔ محترمہ کے ساتھ جو 22 نوجوان شہید ہوئے وہ پی پی پی کے کارکن تھے۔ اُن میں ایک بھی پولیس کا اہل کار یا کمانڈو شامل نہیں تھا حالانکہ 18 اکتوبر کراچی کے شہداء میں پولیس کے اہل کار بھی شامل تھے۔ محترمہ کی شہادت کے سانحہ نے بہت سے سوالات کو جنم دیا ہے۔ جن میں چند یہ ہیں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو فول پروف سیکیورٹی کیوں فراہم نہ کی گئی۔ سانحہ والی جگہ کو عجلت میں پانی سے صاف کیوں کیا گیا۔ جنرل ہسپتال سے میڈیکل ریکارڈ کیوں غائب کیا گیا۔ واقعاتی شہادتیں ختم کرنے کی کیوں کوشش کی گئی۔ محترمہ کی سیاست اور مقبولیت سے کون لوگ خوف زدہ تھے اور انہیں اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ حکومت اقوام متحدہ کی نگرانی میں تفتیش کرانے سے کیوں گریز کررہی ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

وزارت داخلہ کے ترجمان نے محترمہ کے قتل کے بارے میں عجلت میں پریس کانفرنس کر کے عوام کے ذہنوں میں کنفیوژن پیدا کرنے کی کوشش کیوں کی۔

سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم تفتیش میں مصروف ہے۔ خدا کرے وہ محترمہ کے اصل قاتلوں تک پہنچ سکے۔ جہاں تک پاکستان کے عوام کا تعلق ہے اُن کو علم ہے کہ اُن کے مقبول سیاسی قائدین کا دشمن کون ہے۔ قاتلوں کے چہرے، اقدامات اور بیانات اُن کے جرم کے گواہ ہیں۔ معروف مصنف رون سسکند (Ron Suskind) نے اپنی کتاب "The way of the world" میں تحریر کیا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی اور سانحہ کراچی کے بعد جنرل پرویز مشرف نے بے نظیر شہید کے خون پر بات کی اور کہا۔ ''آپ کی سیکیورٹی کا انحصار میرے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر ہے'' جنرل مشرف نے جب 3 نومبر کو مارشل لا نافذ کر کے عدلیہ کے خلاف کارروائی کی تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے سخت احتجاج کیا اور لانگ مارچ کی کال دے دی۔ غیر آئینی اقدامات کے بعد بے نظیر شہید کے جنرل پرویز مشرف کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھٹو کی بیٹی بھی گئی!

عرفان صدیقی

اپنے باپ کے پھانسی گھاٹ سے کوئی دو کلو میٹر دور، بھٹو کی بیٹی بھی قتل کر دی گئی۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اس عہد کو ''عہدِ خوں رنگ'' کا نام دیا تھا. لہو پینے والا یہ عفریت آٹھ برس سے دندنا رہا ہے۔ بلوچستان سے وزیرستان تک کی وادیاں اور گھاٹیاں قتل گاہیں بنا دی گئیں۔ کبھی کسی خفیہ مقام سے آنے والا میزائل نیک محمد نامی خونبرو دہشت گرد کے پرخچے اُڑا گیا۔ کبھی نواب اکبر بگٹی کسی پہاڑ کی کھوہ میں پُراسرار دھماکے کی نذر ہو گیا۔ کبھی ڈمہ ڈولہ کی مٹی گارے والی بستی کے بوریا نشین، خاک و خون میں نہلا دیئے گئے۔ کبھی باجوڑ مدرسے کے تہجد کی نماز میں مصروف طلبہ کے چیتھڑے اُڑ گئے، کبھی لال مسجد کے در و دیوار لہو میں رنگ دیئے گئے، کبھی جامعہ حفصہ کی عفت مآب بیٹیاں فاسفورس کی بھٹیوں میں بھسم کر دی گئیں۔

بے نظیر بھٹو کا قتل اس عہدِ خوں رنگ کا وہ المیہ ہے جس نے ہر پاکستانی کا دل چھلنی کر دیا ہے۔ ہر محبِ وطن کو خون کے آنسو رُلا دیا ہے۔ یہ کس نے کیا؟ قاتل کون ہے؟ کس نے گولیوں کی بوچھاڑ کی؟ کس نے خودکش حملہ کیا؟ شاید اس کا سراغ کبھی نہ لگایا جا سکے لیکن قاتل صرف ایک ہے۔ وہ عہدِ خوں رنگ، جس نے پورے ملک کو قتل گاہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ جس نے آئین اور جمہوریت ہی کو نہیں، تمام اخلاقیات و اقدار کو بھی پامال کر دیا ہے۔ جس نے سارے ملک کو درندوں کی چراگاہ بنا کے رکھ دیا ہے، جس نے خونخواری اور درندگی کو بھی ''عوامی طاقت کے مظاہرے'' کا نام دے دیا ہے، جس نے طاقت کی زبان کو رواج دیا، جس نے طاقت کو آئین و قانون سے بالاتر بنا دیا، جس نے طاقت کو بالاتر اُصول حکمرانی کی شکل دے دی، جس نے طاقت کے زور پر آئین و جمہوریت کو قتل کیا۔ طاقت کے زور پر ہی عدلیہ کا سر قلم کیا۔ طاقت کے زور پر ہی اپنے جواز کا عدالتی فتویٰ لیا۔ طاقت کے زور پر ہی اپنے حریفوں کو کچلا اور طاقت ہی کے زور پر اپنی بادشاہت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کا سکہ جما لیا۔

بھٹو پھانسی چڑھ گیا۔

شاہنواز بھٹو قتل ہو گیا۔

مرتضیٰ بھٹو کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔

اور بھٹو کے لہو کی ایک اور نشانی بے نظیر کو بھی نابود کر دیا گیا۔

یہ اس دن ہوا جب نواز شریف کے استقبالی جلوس پر ایک گھر سے براہ راست فائرنگ کر کے نصف درجن سے زائد کارکنوں کو قتل کر دیا گیا۔ سارا میڈیا دیکھ رہا تھا کہ گولیاں برسانے والے کہاں سے آئے؟ کون تھے؟ انہوں نے براہ راست نشانہ لے کر گولیاں چلائیں۔ پنجاب پولیس کھڑی تماشہ دیکھتی رہی اس لیے کہ گولیاں برسانے والے ''ق'' کے تعلق دار تھے اور گولیوں کا نشانہ بننے والے نواز شریف کے ہم نوا۔ تب نواز شریف کا کارواں وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ قاتل اسی دھڑلے کے ساتھ نواز شریف کو بھی نشانہ بناتے اور پولیس تماشہ کرتی رہتی۔

لگ بھگ ایک عشرہ پاکستان سے باہر گزارنے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر کو اپنے وطن پہنچیں تو بھی اُن کا جلوس خوں آشام دھماکے کا نشانہ بنا۔ دو سو کے لگ بھگ افراد جاں بحق ہو گئے۔ تب بھٹو کی بیٹی بچ گئی لیکن شاید ''دست قاتل'' اُس کے تعاقب میں رہا۔ بینظیر بھٹو نے تحفظ کے کئی سامان کیے۔ بُلٹ پروف گاڑیوں کا اہتمام کیا۔ سکیورٹی کے حصار قائم کیے لیکن قاتل مافیا کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ سالہا سال بعد وطن واپس آنے والی بے نظیر صرف دو ماہ نو دن زندہ رہنے دی گئی۔

27 دسمبر کا دن، ایک ناسُور کی طرح پاکستان کے جسدِ سیاست میں زہر بوتا رہے گا۔ ابھی تک قوم بھٹو کی پھانسی کے المیے سے نہیں سنبھل سکی تھی۔ تازہ سانحے نے تقسیم کی ایسی لکیر ڈالی ہے کہ سندھ آنے والے کئی سالوں تک لہو روتا رہے گا۔ ایک بات طے نظر آتی ہے کہ مشرف بندوبست، آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مسلم لیگ (ق) آمریت کی گود میں پلنے والا ایسا عفریت بن چکی ہے جو عوامی تائید سے حقیقتاً محروم ہے لیکن جسے نہ صرف مشرف بلکہ تمام ایجنسیوں کی سرپرستی حاصل ہے اور جس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ ایک بار پھر اقتدار پر قبضہ جما کے دم لے گی۔ کوئی بتائے کہ جب 2002ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والی پارٹی کی سربراہ، دوبار ملک کی وزیراعظم رہنے والی خاتون اور پاکستان کی مقبول رہنما کو اس بیدردی کے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ساتھ قتل کردیا جائے اور تمام بین الاقوامی سروے رپورٹس کے تحت پاکستان کے مقبول ترین رہنما نواز شریف کے جلوس پر وحشیانہ فائرنگ کر کے کئی کارکنوں کو قتل کردیا جائے تو کون سے انتخابات؟ کس طرح کی عوامی رائے؟ کیسا پُرامن انتقال اقتدار؟ چنگل گاڑے ہوا مافیا طے کر چکا ہے کہ کسی بے نظیر، کسی نواز شریف کو سر نہیں اُٹھانے دیا جائے گا۔ عوام کی ترجمانی کرنے والے کسی رہنما کو عوام کی نمائندگی نہیں کرنے دی جائے گی۔ یہاں وہی زندہ رہیں گے، وہی جلسے جلوس کریں گے، وہی وزیراعلیٰ اور وہی وزیراعظم بنیں گے، جو ملک پر قابض مافیا کے ہاتھ پر بیعت کہہ چکے ہیں۔ جو باوردی جرنیل کو دس دس بار منتخب کرنے کا اعلان کریں گے اور جو اُونچے ایوانوں کی چاکری کو اپنے لیے سرمایہ اعزاز سمجھتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد اُن کی پارٹی کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا وہ ان حالات میں بھی الیکشن لڑے گی؟ میرے خیال میں ایسا سوچنا بھی پرلے درجے کی خودفریبی ہوگی۔ بے نظیر کو منظر سے ہٹا دینے کے بعد ''مافیا'' پیپلز پارٹی کو لقمہ تر کی طرح ہڑپ کر جائے گا۔ کم از کم اب جنوری 2008ء کے انتخابات پیپلز پارٹی کے لیے نہیں ہیں۔ نواز شریف مسلسل کہتے رہے ہیں کہ اگر بے نظیر بھٹو انتخابات کا بائیکاٹ کردیں تو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ بھی بائیکاٹ کردیں گے۔ اگر پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) دونوں انتخابات سے باہر ہوجاتی ہیں تو مقامی اور بین الاقوامی طور پر انتخابات کی کوئی ساکھ نہیں رہے گی۔ مولانا فضل الرحمٰن کو بھی اب اپنی خودسری سے باز آجانا چاہیے۔ اے این پی بھی یہیں رُک جائے۔ انتخابات اب بے معنی ہو کے رہ گئے ہیں۔ تمام جماعتوں کو فوری طور پر اِک جگہ جمع ہو کر کوئی بڑا فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر اب مسلم لیگ (ق) اور ایم کیو ایم کو اپنے حال پر چھوڑ کر ساری جماعتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ صدر پرویز مشرف کی موجودگی میں انتخابات میں حصہ نہیں لیا جائے گا تو منظر بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

فوج کی حکمرانی، جب بھی آئی، قوم کو عذاب اور اضطراب دے گئی۔ پرویز مشرف کچھ بھی کہتے رہیں، اُن کا آٹھ سالہ عہد پاکستان کے وقار، پاکستان کی سلامتی، پاکستان کی یک جہتی اور پاکستان کے استحکام کو پارہ پارہ کر چکا ہے۔ انہوں نے صرف امریکی مقاصد کی آبیاری کی اور اپنے ذاتی اقتدار کو توانا بنایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے 12 مئی 2007ء کو اپنے حامیوں کی طرف سے معصوم افراد کے بہیمانہ قتل کو بھی ''عوامی قوت کا مظاہرہ'' قرار دیا اور یوں اس تشدد کو تھپکی دی۔ اب حل ایک ہی ہے کہ موجودہ غیر جمہوری اور ناکام حکومتی ڈھانچہ رخصت ہو۔ چیئرمین سینیٹ آئین

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کے مطابق صدارتی منصب سنبھال کر اتفاق رائے کی حکومت قائم کریں اور پھر ایک نئے سفر کا آغاز کیا جائے۔

آج کسی وقت بھٹو کی بیٹی، گڑھی خدا بخش میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن کردی جائے گی۔ ایک بار پھر ثابت ہوگیا کہ یہ ملک عوام کے مقبول و محبوب رہنماؤں کے لیے نہیں، وردی اور بوٹوں کے پجاریوں کے لیے بنا ہے۔ کیا ہماری آنکھیں کبھی وہ دن بھی دیکھیں گی کہ جب ملک کے وجود کو چاٹنے والا یہ مافیا بھی کسی گہری قبر میں دفن ہوجائے گا؟

روزنامہ نوائے وقت، 28 دسمبر 2007

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بینظیر بھٹو۔ 1970ء تا 2007ء۔ کچھ یادیں

محمود شام

1970ء۔ 70 کلفٹن کا تاریخی ڈرائنگ روم۔ ''یہ بے نظیر ہیں۔ چھٹیوں میں آئی ہوئی ہیں۔ اُن سے موجودہ حالات پر انٹرویو کرلیں۔'' پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرپرسن، سابق وزیر خارجہ پاکستان، جناب ذوالفقار علی بھٹو اپنی عزیز ترین صاحبزادی کو میرے ساتھ بٹھا کر باہر اپنے سیاسی جم گھٹ میں چلے گئے ہیں، جہاں جے اے رحیم، محمود علی قصوری، غلام مصطفیٰ کھر، عبدالحفیظ پیرزادہ، غلام مصطفیٰ جتوئی، حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن سب ہی موجود ہیں۔ لندن میں زیر تعلیم، 17 سالہ پاکستانی طالب علم، یحییٰ خان کا مارشل لاء، موضوع دائیں اور بائیں بازو کی کش مکش۔ خاص طور پر نوابزادہ نصراللہ کے بیانات پر اظہار خیال۔ انکل کو اس طرح ڈیڈی کے خلاف بیانات نہیں دینے چاہئیں۔ Facts کو سامنے رکھنا چاہیے۔ پاکستان کا مستقبل ترقی پسندی سے وابستہ ہے۔ تاریخ کا پہیہ آگے بڑھتا ہے۔ میری پہلی یادمحترمہ بے نظیر بھٹو سے اس طرح وابستہ ہے۔ روسی قونصل خانے میں اُن کے ویزے کے لیے ہمراہ جانا بھی ذہن کے اوراق پر دھندلا دھندلا موجود ہے۔ وہ لندن واپسی پر ماسکو میں رکنا چاہتی ہیں۔

1972ء۔ شملہ۔ صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو اپنی صاحبزادی کو جواہر لعل نہرو کی صاحبزادی اندرا گاندھی سے ملوانے لے گئے۔ 1977ء۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء۔ 24 سالہ بے نظیر بھٹو کو تعلیم سے فارغ ہوتے ہی عملی سیاسی زندگی کا آغاز کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسی راہ، جو کانٹوں سے بھری ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ کب تک جدوجہد جاری رہے گی۔ اپنی پارٹی کے بہت سے لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ آج کے بڑے بڑے جمہوری چیمپئن، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پہلو میں بیٹھے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ انتخابی مہم۔ مخدوم خلیق الزماں اور دوسرے جواں سال اپنے قائد کی بیٹی کو لے کر سندھ میں سرگرم ہیں، انتخابات ملتوی۔ غیر یقینی مستقبل۔ 70 کلفٹن میں اپنے صحافیانہ فرائض کے سلسلے میں اکثر ملاقات ہوتی ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

1978ء۔ ایک رات مجھے اطلاع ملتی ہے کہ ایوان صدر میں چیف جسٹس پاکستان، چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ فیصلہ، پھانسی کی سزا۔ میں بے تاب ہوں کہ صبح ہو تو میں ایک بیٹی کو بتاؤں کہ اس کے عظیم والد کے لیے کیا فیصلہ ہو رہا ہے۔ 70 کلفٹن۔ لابی۔ ایک قوم پرست سندھی رہنما۔ ایک پی پی پی کے رہنما جو بعد میں سینیٹر بنے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ''فیصلہ بھٹو صاحب کے حق میں آنے والا ہے۔ پی این اے والے ہنگامہ کریں گے۔ اس لیے فوج لگا رہے ہیں۔'' میں سوچ رہا ہوں کیسے لوگ ہیں؟ ''کتنی غلط بیانی۔'' وہ چلے جاتے ہیں تو میں اُن سے کہہ رہا ہوں (اس وقت کسے خبر تھی کہ شہادت بالآخر اُن کی بھی منزل ہے) کہ انتہائی باوثوق ذرائع کی اطلاع ہے کہ 18 مارچ کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی۔ ایک بیٹی کو اس کے والد کے لیے ایسی بات بتانے سے پہلے میں نے سو بار سوچا۔ لیکن مصدقہ اطلاع ہے۔ ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ بین الاقوامی شخصیات سے رابطہ کریں، اپنے لوگوں سے ملیں، یہ بھی اطلاع ہے کہ آپ کو نظر بند کرلیا جائے گا۔'' میں اپنی ذمہ داری پوری کر کے آ گیا ہوں، 18 مارچ کو میری اپنی پیشی بھی ہے۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کی اطلاع آتی ہے۔ 70 کلفٹن کے پاس گزرتا ہوں۔ وہ سب جیل بن چکا ہے۔

1979ء۔ نظر بندی کے بعد سہالہ سے کراچی واپس۔ 70 کلفٹن، کچن کے ساتھ میٹنگ روم۔ بیگم نصرت بھٹو۔ عدت میں ہیں۔ اُن سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ بے نظیر بھٹو پریس کانفرنس کر رہی ہیں۔ اندرون سندھ ریل سے جا رہی ہیں۔ بھٹو صاحب کی شہادت کا غم آپ کے پاس بہت بڑی طاقت ہے۔ اسے فوری طور پر اسٹیشنوں، جلسوں میں نہ بکھیریں، وقت پر اس کا استعمال کریں۔ چو این لائی نے کہا تھا ''اپنے دکھ کو طاقت میں بدل لو۔'' 14 اگست 1979ء۔ پھانسی کا دن 4 اپریل۔ عدّت کے ایام پاکستان کے یوم آزادی پر ختم ہوتے ہیں۔ پاکستان بھر سے اظہار تعزیت کے لیے رہنما و کارکن آ رہے ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو، تصویر غم، بے نظیر بھٹو، ایک عزم مصمم، سیاہ لباس، ماں، بیٹی، سیاسی قوت، سیاسی رہنما۔ ان سے اتحاد کے لیے سرگرم۔ نظر بندیوں کا سلسلہ وقفوں وقفوں سے جاری۔ بیگم نصرت بھٹو اپنی صاحبزادی پر فخر کرتی ہیں کہ وہ اپنے باپ کی تصویر ہے۔ وہی ارادے، استقامت، مستقبل کا شعور، پھانسی کے بعد پہلے بلدیاتی انتخابات، حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ بے نظیر حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ عوام دوست اُمیدوار کامیابی بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں سے بے نظیر کے بڑے فیصلے لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو علاج کے لیے بیرون ملک جا رہی ہیں، بے نظیر نظر بند ہیں۔ اُن سے مختلف ذرائع سے اطلاعات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہیں اور جنرل ضیاء سے ملنے والوں کو پارٹی سے نکالنے کے نوٹس دے رہی ہیں۔ 1983ء۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اُن کے کان کا عارضہ شدید ہو جاتا ہے۔ اُن کے معالج سے ہم خبروں کے لیے ملتے رہتے ہیں۔ 1984ء۔ حکومت انہیں خاموشی سے ایئرپورٹ پہنچانے اور ملک سے روانگی میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔ 1985ء۔ انتخابات، ایم آر ڈی بائیکاٹ کا اعلان کرتی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ لیڈیز (بیگم نصرت بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو، دونوں ملک سے باہر ہیں) نے منع کیا ہے، جو بعد میں غلط ثابت ہوتا ہے۔ اپریل 1986ء۔ وطن واپسی، عظیم استقبال، اُن کا وعدہ ہے کہ پہلا انٹرویو جنگ کے لیے ہمیں دیں گی۔ لندن میں بلایا گیا تھا۔ جانہیں سکتے تھے۔ وعدہ پورا ہوتا ہے۔ ملتان میں انٹرویو تفصیل سے۔ پھر اُن کے ساتھ ہی 3 مئی 1986ء کو کراچی واپسی۔ دوپہر سے ٹرک پر اُن کے ساتھ، قائداعظم کے مزار کے پاس جلسۂ عام سے خطاب۔ 3 مئی حکومت گئی۔ لیکن حکومت اپنی جگہ۔ مستقبل کی منصوبہ بندی۔ پارٹی قیادت میں تبدیلیاں۔ پی پی پی اب بھی سرفہرست سیاسی پارٹی ہے۔ طاقت کا سرچشمہ بے نظیر بھٹو کی شخصیت۔ بیگم بھٹو رفتہ رفتہ پیچھے ہوتی ہیں۔ 1987ء۔ منگنی، شادی کا سال۔ جونیجو افغان معاہدے پر دستخط سے پہلے سیاسی قائدین سے مشورے کرتے ہیں۔ بے نظیر کی وزیراعظم ہاؤس سے واپسی پر وزیراعظم بھٹو کی وزیراعظم ہاؤس سے وابستہ یادوں پر بات چیت۔ 1988ء ۔ جونیجو حکومت کی برطرفی، انتخابات کا اعلان۔ 17 اگست 1988ء۔ پاکستان CI تباہ ہونے کی اطلاع۔ 4 بجے شام کے آس پاس۔ فون پر 70 کلنٹن رابطہ۔ پہلی اطلاع۔ پریس کانفرنس۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انتخابات پی پی پی کی کامیابی۔ پہلی مسلمان خاتون وزیراعظم کا اعزاز۔ اکثر غیر ملکی دوروں میں ساتھ جانے کا اتفاق۔ امریکی کانگریس سے خطاب۔ ہر جملے پر تالیاں۔ ایک پسماندہ ملک کی روشن خیالی کا ثبوت۔ خاتون کا انتخاب بطورِ وزیراعظم جس کا نظارہ امریکہ و یورپ بھی نہ کر سکے۔ اگست 1990ء میں حکومت کی برطرفی، شوہر کے خلاف مقدمات، عدالتوں میں پیشیاں۔ کبھی کبھی اداسی، مایوسی۔ پھر 1993ء میں لانگ مارچ کی دھمکی اور ڈرامائی مناظر۔ دوبارہ وزیراعظم۔ اپنے صدر کا انتخاب۔ اپنے صدر کے ہاتھوں معطلی۔ دبئی۔ کیا صورت حال ہے۔ حکومت میں پھر ضیا اسٹ بیٹھے ہیں، کیسے روشن خیالی ہوگی۔ 18 اکتوبر 2007ء ۔ وطن واپسی۔ عظیم الشان استقبال۔ خودکش بم دھماکہ۔ تمام حفاظتی انتظامات بے نتیجہ۔ افراتفری۔ چار پانچ روز بعد ''جنگ'' کے لیے خصوصی انٹرویو۔ وطن واپسی کے بعد کسی اخبار کے لیے پہلا اور شاید آخری باقاعدہ انٹرویو۔ نومبر 2007ء۔ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس سے پہلے پانچ چھ ایڈیٹرز سے آف دی ریکارڈ صلاح مشورے۔ الیکشن میں حصہ لیں یا نہیں۔ ناہید خان، صفدر عباسی، فہمیدہ مرزا۔ الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔ میں ساتھ والی کرسی پر ہوں۔ کسے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

خبر تھی کہ تین دہائیوں میں ملاقاتوں کے سلسلے میں انہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ شخصیت میں پہلے سے کہیں زیادہ ٹھہراؤ، تامل، تحمل، مشاورت کا اہتمام، جلسے، ریلیاں، خودکش حملوں کا خطرہ، امریکی سفیر سے ملاقاتیں، جیو کے دفاتر کا اظہار یک جہتی کے لیے دورہ۔ تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی کیسے ختم ہوگی؟ کسی کو دو تہائی اکثریت نہیں ملے گی۔ صدر پرویز مشرف۔ اپنی ماورائے آئین ترامیم کو پارلیمنٹ سے منظور کروانے کے لیے پی پی پی سے مذاکرات کریں گے۔ اسی میں تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی پر بات چیت ہوگی۔ جمعرات کی رات انتہا پسند ایک اعتدال پسند اور مسلم خاتون رہنما کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب۔ اور کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن۔ کیا پی پی پی ختم ہو جائے گی، کیا پاکستان کا سیاسی مستقبل بھی قتل ہو گیا۔ بھٹو جب تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنگاموں میں دن گزارتے ہیں۔ اُن کی مختصر زندگی میں سارے سال بہت سرگرم ہوتے ہیں۔ سیاسی اُفق پر چھائے رہتے ہیں۔ اُن کی موت بھی انہیں سیاسی اُفق سے نہیں ہٹا سکتی۔ 1929ء میں پیدا ہونے والا بھٹو 1957ء سے پاکستان کے سیاسی اُفق پر چمکا۔ 1979ء تک وہی تب و تاب رہی۔ بھٹو کا اقتدار 1977ء میں ختم ہوا۔ بھٹو کا دور آج تک ختم نہیں ہوا۔ بے نظیر بھٹو 1953ء میں پیدا ہوئیں۔ 1977ء سے سیاسی اُفق پر طلوع ہوئیں۔ 2007ء تک مسلسل چمکتی رہیں۔ 1979ء سے بھٹو صاحب اب تک پاکستانی سیاست کا محور ہیں۔ اب اُن کے ساتھ ساتھ بے نظیر بھٹو بھی سیاسی حوالہ بن کر زندہ رہیں گی۔

روزنامہ جنگ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

الوداع گلاب پوش بی بی۔ الوداع!

کشور ناہید

وہ گہرا اور کھلتا ہوا سبز رنگ اور رائل بلیو کو بہت پسند کرتی تھی۔ جب اُس نے سب سے کم عمری میں پاکستان کی وزیراعظم کی حیثیت سے حلف لیا تو اُس وقت بھی اُس نے پسندیدہ رنگ پہنا ہوا تھا۔ دوسری دفعہ جب وزیراعظم بنی تو بھی اپنے پسند کے رنگ میں ملبوس تھی۔ اُسے گلاب کی خوشبو پسند تھی۔ داتا صاحب جانا اُسے پسند تھا، جب اُس کو کسی شداد نے گولیاں ماریں اُس وقت بھی وہ سبز پوش تھی۔ گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا۔ بازو پر ہر موقع پر سینکڑوں لوگ اس کو امام ضامن باندھتے تھے۔ اُس کے سر سے دوپٹہ ڈھلک جاتا تو احتیاط سے پھر سر ڈھک لیتی تھی۔ بہت لوگ کہتے تھے بی بی بڑے بدشکل رنگ کے کپڑے پہنتی ہے مگر وہ تو طبیعتاً قلندر تھی۔ مجھے یاد ہے جب مسز کلنٹن آئی تھیں تب بھی اس نے نیلے رنگ کی قمیض، سفید دوپٹہ اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھے۔ جب موت نے اُس کے دروازے پر دستک دی اُس وقت بھی وہ سفید دوپٹہ، سفید شلوار اور ہرے رنگ کے چولے میں جمہوریت کی دیوانی خوش تھی، ہنس رہی تھی یونہی ہنستے ہنستے قہر آلود ہاتھوں نے اُس کی شہ رگ میں ایسے دو گولیاں ماریں کہ وہی ہنسی، مرتے وقت بھی اُس کے چہرے پر مرتسم تھی۔ جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی اور اُس سے دو سال پہلے جگہ جگہ جلسہ کرتی پھری۔ اُس کے سر پر دوپٹے کو پورے یورپ نے نئے اور خوبصورت فیشن کے طور پر قبول کیا۔ میں اُس سال وینس میں تھی۔ ہم بہت سے سیاح کشتی میں سیر کے لیے جا رہے تھے۔ میرا دوپٹہ دیکھ کر سب نے پوچھا تم کس ملک سے ہو۔ جب میں نے بتایا کہ ''میں پاکستان سے ہوں، بےنظیر کے ملک سے ہوں۔'' ساری عورتوں نے آگے بڑھ کر میرے دوپٹے کو بےنظیر کے دوپٹہ اوڑھنے کے انداز میں اوڑھایا۔ پھر باقی عورتوں نے مفلر کی شکل کے دوپٹوں کو میرے ساتھ اپنے سروں پر لیا۔ یہ تھی مقبولیت عورت کی جس کو متشددانہ طریقے پر کسی شقی القلب نے دو گولیاں شہ رگ پہ اور ایک گولی ماتھے پہ یہ یقین کرنے کے لیے ماریں کہ وہ جری خاتون بچ نہ جائے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی تو چونکہ بہت کم عمر تھی۔ اُس لیے اس کو مشورہ دینے والے، کبھی بتاتے تھے کہ اس سوٹ کے ساتھ یہ عینک پہنیں، اس سوٹ کے ساتھ یہ بیگ لیں، اس شام یہ لہنگا پہنیں اور اس شام غرارہ پہنیں۔ کبھی کبھی غیر ملکی عشائیہ میں اُس نے لہنگا پہنا بھی تو بھی وہی سبز رنگ اس کا لباس تھا۔ جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی تو چند مصری اور دیگر مفتیوں نے فتویٰ دیا کہ عورت وزیراعظم نہیں ہو سکتی ہے۔ کچھ نے یہ بھی شوشہ چھوڑا کہ عورت کو سلامی دینا مردانگی کے خلاف ہے، اس زمانے میں فاطمہ وینسی نے قرآن اور خلفاء کے حوالے سے ثابت کیا کہ خاتون، پہلے بھی سربراہ مملکت رہی ہے اور بےنظیر کا وزیراعظم ہونا بالکل قانون اور اسلامی فقہ کے مطابق ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے اُس خاتون کو علم تھا کہ ہر روز اُس کو دھمکیاں ملتی تھیں کہ تم مار دی جاؤ گی۔ وہ خاتون پھر بلٹ پروف واسکٹ پہننے لگی تھیں۔ وہ جیکٹ، اکثر قمیض کے ہم رنگ ہوتی تھی، پر شلوار اور دوپٹہ وہی سفید ہوتے تھے۔ کیا خبر تھی کہ یہی سفید رنگ اس کا آخری ملبوس بنے گا۔ اس پر ہر لباس پھبتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب وہ شملہ معاہدے کے لیے بھٹو صاحب کے ساتھ گئی تھیں اُس دن شاید پہلی مرتبہ ساڑھی پہنی تھی۔ سلیولیس بلاؤز، کٹے ہوئے بکھرے بال ایسے جیسے نوجوان لڑکی کے ہو سکتے ہیں۔ معصوم مسکراہٹ اور باپ کی پسندیدہ بیٹی، ہر جگہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

باپ کو یہ بیٹی اتنی پسند تھی کہ آخری ملاقات کے دوران پنڈی کوٹھڑی میں باپ اور بیٹی پلنگ پر لیٹے، کانوں میں باتیں کئی گھنٹے تک کرتے رہے تھے۔ وہ ساری باپ کی ہدایتیں، اُس خاتون نے اپنا زیور بنا لی تھیں۔ لہجہ اس قدر شفاف اور بیان اس قدر واضح کہ سننے والے کو قائل کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ وزیراعظم بنی تو سارے سینئر پارٹی رہنماؤں کو اُس نے انکل تو کہا مگر جب انہوں نے اُسے بچہ سمجھ کر اپنے مشوروں سے نوازنا شروع کیا تو وہ سمجھ گئی کہ اب تو اپنی ہی عقل پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ اُس کے اعتماد نے، اُس کے اپنے ہی بنائے ہوئے صدر کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ اُس کو بی بی کا یہ رنگ اچھا نہیں لگا۔ آخر اُس نے بے وفائی اس ڈھٹائی کے ساتھ کی کہ بی بی کی حکومت کو ہی برطرف کر دیا۔ ہم لوگ جو بھٹو صاحب کے چاہنے والے تھے، وہ بھٹو صاحب کی بیٹی کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر جز بز ہوتے تھے۔ جب وہ مزاروں پر حاضری دینے جاتی، صدق دل سے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتی تھی۔ ہم جیسے لبرل لوگ اُس سے ناراض ہو جاتے مگر وہ یہ سب کچھ مصنوعی طریقے پر نہیں کرتی تھی۔ اُس کے اندر کوئی پیر طریقت بیٹھا تھا وہ اچھی بھلی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ موت نے اُس کے کان میں کہا ارے کھڑی ہو، ونڈ و کھولو اور کھڑی ہو کر،

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اور زنجیر ٹوٹ گئی

قیوم نظامی

4 اپریل 1979ء کو جب ایک آمر نے ذوالفقار علی بھٹو کو شہید کیا اس وقت میں کوٹ لکھپت جیل لاہور میں قید تھا۔ سیاسی قیدیوں کے لیے یہ غم اذیت ناک تھا کیونکہ جیل کے اندر وہ اپنے غم کو دوسروں کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی رُفقاء اُن سے اظہار ہمدردی کر سکتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو پی پی پی کے کارکنوں اور حامیوں کے لیے اُمید کی کرن کے طور پر سیاسی میدان میں موجود تھیں۔ دونوں عظیم خواتین نے نہ صرف اس صدمے کو بہادری سے برداشت کیا بلکہ عوام کو قیادت بھی فراہم کی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کی طویل آمریت کا بڑی جرأت سے مقابلہ کیا۔ ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں اور پی پی پی کو متحد رکھنے میں کامیاب رہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کی المناک خبر میں نے اس وقت سنی جب میں اپنی بیگم کشور اور بیگم یاسمین رحمٰن (ایم این اے) کے ساتھ اسلامیہ پارک میں ایک کارنر میٹنگ سے خطاب کرنے کے بعد بسطامی روڈ سمن آباد کی جانب جا رہا تھا۔ راستے میں ٹریفک جیم تھی۔ بیگم یاسمین رحمٰن کو موبائیل فون پر اطلاع ملی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو لیاقت باغ میں خودکش دھماکے میں شہید ہو گئی ہیں۔ ہم نے گاڑی سے باہر نکل کر چیخ و پکار شروع کر دی۔ سکتے کے عالم میں اپنے گھر واپس پہنچے۔ موبائل فون اور لینڈ لائن فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ رُفقاء اور احباب صدمے اور تعزیت کا اظہار کرتے رہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت ایک قومی سانحہ ہے جس نے پورے پاکستان کو سکتے میں مبتلا کر دیا ہے۔ پی پی پی کے سیاسی مخالفین نے بھی اس المیے کو محسوس کیا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو راولپنڈی میں شہید ہونے والی تیسری قومی سیاست دان ہیں۔ اُن سے پہلے لیاقت علی خان اور ذوالفقار علی بھٹو بھی راولپنڈی میں شہید ہوئے۔ یہ تینوں قومی رہنما پاکستان کے وزیراعظم رہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان واپسی سے پہلے حکمرانوں کو خبردار کرتی رہیں کہ اُن

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

استقبال کرو میرا۔ وہ جو روحانیت میں لپٹی تسبیح پکڑے کھڑی ہوئی تو موت دو گولیوں کی شکل میں اُس کی شہ رگ کو اور ایک گولی کی شکل میں اُس دماغ کو کھا گئی۔ جس کی تعریف میں سکیورٹی کونسل کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تعزیتی ریفرنس ہوا۔ سی این این اور بی بی سی پورے چوبیس گھنٹے مسلسل پروگرام اس بی بی کے لیے نشر کرتے رہے جو دنیا بھر میں بہت بڑا دماغ تھیں۔ اُس کو یاسر عرفات بھی پیار کرتے تھے۔ النہیان نے وہ محبت دی کہ جسے پناہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بی بی کو ہر دوسرے مہینے لیکچر دینے کے لیے امریکہ، یورپ اور برطانیہ میں بلایا جاتا تھا۔ اب ہے ہمارے پاس کوئی ایسا جس کو یوں بلایا جائے جس پر ہم فخر کر سکیں۔

مگر اسلامی ممالک کو عورت کی لیڈری پسند ہی نہیں ہے یہ سارے خلیجی ممالک اُس کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہ ممالک محترمہ فاطمہ جناح کو بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ فاطمہ جناح کو بھی بہت پُراسرار طریقے سے مار دیا گیا تھا اب یہی حال کرنا تھا بی بی کا۔ بھٹو صاحب نے تو لکھ دیا تھا "If I am Assassinated"، بی بی نے بھی آنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ اُس کو مارنے کے منصوبے ہیں۔ اُس نے تو نام بھی دے دیئے تھے کہ مروانے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ کوئی ہے جو اُن کا نام لے، کوئی ہے جو اس المیے کی ذمہ داری لے۔ محرم سے پہلے ہی عزاداری کا ماحول دے کر جانے والی، پلٹ کے تو دیکھ جیسا تیرے باپ کا ماتم گھر گھر تھا، لوگ ایک دوسرے سے رو کر تعزیت کر رہے تھے تو نے بھی باپ کی طرح ہماری قوم کو بے بس، بن لیڈر، یتیم چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں گلاب پسند تھے۔ اب ہمیشہ تمہاری لحد پر گلاب کھلا کریں گے۔

روزنامہ جنگ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کی جان کو خسرہ ہے لہٰذا اُن کی سیکورٹی کا فول پروف انتظام کیا جائے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے صدر پرویز مشرف کے نام خفیہ ذاتی خط لکھ کر اُن افراد کی نشاندہی کی جو اُن کی جان کے دشمن تھے۔ افسوس صدر پرویز مشرف محترمہ بےنظیر بھٹو کی جان کی حفاظت نہ کر سکے۔ 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں محترمہ بےنظیر بھٹو پر حملہ ہوا جس میں پارٹی کے 180 غریب کارکن شہید اور 500 زخمی ہوئے۔ محترمہ معجزانہ طور پر محفوظ رہیں۔ اس حملے کے بعد بھی حکومت نے محترمہ کی حفاظت کے لیے فول پروف انتظامات نہ کیے حالانکہ محترمہ اور اُن کے قریبی رُفقاء بار بار حکمرانوں کو خدشات سے آگاہ کرتے رہے۔ حکومت کی غفلت، کوتاہی اور بےحسی کی بناء پر بےنظیر بھٹو کے دشمن اُن کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کی شہادت کے پاکستان کی سیاست جمہوریت، معیشت اور سالمیت پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو محفوظ و مامون رکھے اور بھٹو خاندان اور پی پی پی کے کارکنوں کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔ (آمین)

میں محترمہ بےنظیر بھٹو کے کورگروپ کا حصہ بن کر اُن کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں اور اُن سے مسلسل رابطے میں رہا ہوں۔ ہم ای میل کے ذریعے تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ محترمہ پاکستان کے ساتھ گہری محبت سے سرشار ہو کر جلاوطنی ختم کر کے پاکستان واپس تشریف لائیں۔ اگر اُن کی پہلی ترجیح پاکستان کا اقتدار ہوتا تو وہ 18 اکتوبر کے سنگین ترین حادثہ کے بعد پاکستان سے باہر چلی جاتیں مگر انہوں نے پاکستان میں رہ کر جدوجہد کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان بھر سے 30 لاکھ عوام اپنی قائد کا استقبال کرنے کے لیے کراچی پہنچے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو عوام سے ہی تقویت حاصل کرتی تھیں۔ عوام کی محبت نے ہی محترمہ کو آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا۔

محترمہ بےنظیر بھٹو پاکستان کی مقبول ترین لیڈر تھیں وہ واحد سیاست دان تھیں جن کی بصیرت اور دانش مندی کو پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ جمہوریت میں لازوال یقین رکھتی تھیں۔ انہوں نے مخالفت کے باوجود جمہوریت اور مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور ایجی ٹیشن سے گریز کیا۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے کہا تھا کہ حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کے باعث پاکستان دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال بن چکا ہے، لہٰذا وہ پاکستان کو انتہاپسندی اور دہشت گردی سے بچانے کے لیے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔ محترمہ نے حقیقی جمہوریت کی بحالی، دہشت گردی کے خاتمے اور عوام کے بنیادی حقوق کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

محترمہ بےنظیر بھٹو نے لیاقت باغ راولپنڈی میں اپنے خطاب میں کہا ''آپ کا اور میرا ملک خطرے میں ہے۔ 8 جنوری کو عوام کی فتح کا سورج طلوع ہوگا اور آمریت کا سورج غروب ہو جائے گا۔ پی پی پی عوام کی جماعت ہے، عوام کی بات کرتی ہے اور عوام کے بارے میں سوچتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کو ایٹم بم دیا۔ میں نے ایٹمی میزائل دیئے۔ پارٹی کے کارکنوں نے آمریت کے دور میں کوڑے کھائے اور جیلیں کاٹیں۔ مسلمان غیرت مند قوم ہیں اور ماؤں بہنوں بیٹیوں کی عزت کرتے ہیں۔''

محترمہ بےنظیر بھٹو نے بڑی بہادری سے موت کا سامنا کیا۔ وہ بھٹو شہید کی طرح بہادری کی علامت بن گئی ہیں جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ محترمہ بےنظیر بھٹو سندھ کی واحد بااثر اور مضبوط آواز تھیں جو وفاق کی سیاست کرتی تھیں۔ صدر پرویز مشرف نے اپنی مہم جویانہ پالیسیوں کی وجہ سے وفاق کو انتہائی کمزور کر دیا ہے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو وفاق کو بچانے کی آخری اُمید تھیں۔ اُن کے چاروں صوبوں کے عوام سے رشتے بڑے گہرے تھے۔ اُن کو چاروں صوبوں کی زنجیر کہا جاتا تھا۔ محترمہ کی شہادت کے بعد یہ زنجیر ٹوٹ گئی ہے۔ پاکستان کے وفاق کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں ایسی کوئی شخصیت موجود نہیں ہے جو عالمی طاقتوں سے مذاکرات کر کے پاکستان کے قومی مفادات کا تحفظ کر سکے۔

محترمہ بےنظیر بھٹو کی شہادت پی پی پی کے لیے ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ قیادت شہید ہو چکی ہے۔ پی پی پی میں ایسی کوئی قدآور شخصیت موجود نہیں ہے جو محترمہ بےنظیر بھٹو کا متبادل بن سکے۔ پی پی پی اپنی تاریخ کے شدید ترین بحران کا شکار ہو چکی ہے۔ بھٹو دشمن پی پی پی کو تقسیم کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ جنہوں نے محترمہ کو شہید کیا ہے وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ پارٹی متحد رہے۔ پی پی پی کی قیادت کو سیاسی بلوغت کا مظاہرہ کرنا ہے اور بھٹو شہید اور بےنظیر بھٹو شہید کے سیاسی ورثہ پی پی پی کو محفوظ اور متحد رکھنا ہے۔ پی پی پی کے کارکنوں نے بھٹو کی شہادت کے بعد حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا وہ باشعور ہیں اور محترمہ کی شہادت کے غم کو بھی صبر اور حوصلے سے برداشت کریں گے اور اس پاکستان کو بچانے کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے جس کے لیے بھٹو خاندان نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آصف زرداری، بیگم نصرت بھٹو، بلاول، بختاور، آصفہ اور صنم بھٹو نیز بھٹو خاندان کے دوسرے افراد کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ محترمہ بےنظیر بھٹو شہید ہیں وہ باری تعالیٰ کے سایہ عاطفت میں رہیں گی۔ پارٹی کے عظیم کارکن بھٹو اور محترمہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔

یہ بازی خوں کی بازی ہے
یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا
تم کتنے بھٹو مارو گے

زندہ بھی بے نظیر مر کر بھی بے نظیر

قیوم نظامی

بے نظیر کو اپنا نام پسند نہیں تھا۔ انہیں اُن کی کلاس فیلوز 'پنکی' کہہ کر پکارتیں تو وہ خوش ہوتیں۔ بے نظیر کو علم نہیں تھا کہ زندگی میں بھی بے نظیر ہونا اور مر کر بھی بے نظیر ہونا اُن کے مقدر میں لکھا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بے مثال زندگی گزاری۔ وہ آکسفورڈ یونین کی پہلی ایشیائی خاتون صدر منتخب ہوئیں۔ یہ ایک منفرد اعزاز تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر خارجہ اور وزیراعظم رہے۔ وہ عالمی شہرت یافتہ لیڈر تھے اُن کی ذہین (talented) بیٹی ہونے کی بناء پر بے نظیر بھٹو کو زمانہ طالب علمی کے دوران پذیرائی ملتی رہی۔ بے نظیر بھٹو شملہ معاہدہ کے لیے اپنے پاپا کے ساتھ بھارت گئیں تو بھارت کے شہریوں نے اُن کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ انفرادی طور پر جہاں بھی جاتیں بھارتی نوجوان اُن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جوق در جوق جمع ہو جاتے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران بھی بے نظیر لاہور میں موجود تھیں۔ مسلمان ملکوں کے سربراہ بھٹو کی بیٹی کو بڑے شوق سے ملتے۔

جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں شب خون مار کر بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹا اور بھٹو کو قتل کے مقدمے میں گرفتار کر لیا تو بے نظیر اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پاکستان واپس آ گئیں۔ انہوں نے اپنے باپ کے مقدمے میں ذاتی دلچسپی لینی شروع کی۔ لاہور ہائی کورٹ نے بھٹو کو موت کی سزا سنائی اور وہ موت کی کوٹھڑی میں قید ہوئے تو بھٹو کے رُفقاء، گورنر، وزیراعلیٰ، وزیر، مشیر اور سفیر انہیں چھوڑ گئے۔ اس نازک مرحلے پر ایک ایسی شخصیت نے مایوس کارکنوں اور عوام کو قیادت فراہم کی جو نہ وزیر تھی نہ سفیر تھی اور نہ ہی مشیر تھی ہاں البتہ وہ بے نظیر تھی۔ جیالوں نے اُن کی قیادت کو بڑی محبت اور عقیدت سے قبول کیا۔ راقم نے بے نظیر بھٹو کی بہادری اور جرأت سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی کا نام بے نظیر رکھا۔ پاکستان کے نوجوانوں نے ''بھٹو کی تصویر بے نظیر بے نظیر'' کے نعرے لگائے۔

ذوالفقار علی بھٹو کوٹ لکھپت جیل میں تھے۔ بھارت کے وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ بے نظیر بھٹو نے واجپائی کے دورے کے بارے میں انگریزی میں ایک آرٹیکل

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

لکھا جو روز نامہ مساوات میں شائع ہوا۔ بھٹو صاحب نے یہ آرٹیکل پڑھا تو کہا ''بے نظیر تم واقعی بے نظیر ہو تم پاکستان کی بے نظیر ہو''۔ بھٹو صاحب نے راولپنڈی جیل کی موت کی کوٹھڑی سے ''مائی ڈیرسٹ ڈاٹر'' کے نام سے ایک طویل تاریخی خط لکھا جو ایک وصیت نامہ تھا جس میں ایک باپ نے اپنی بیٹی کو سیاست کے گُر سکھائے تھے اور خط میں یہ بھی تحریر کیا ''آخرت کی جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے اور دنیا کی جنت عوام کے قدموں کے نیچے ہے۔'' 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کی شہادت کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو نے پاکستان میں رہ کر جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنے کا اعلان کر کے جنرل ضیاء الحق اور اُس کے رفقاء کو حیران کر دیا۔ بے نظیر بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ سخت گرمی میں سکھر جیل میں قید رہیں۔ بے نظیر بھٹو 1986ء میں اپنی جلاوطنی ختم کر کے لاہور آئیں تو دس لاکھ پُر جوش عوام نے اُن کا والہانہ استقبال کیا۔ بھٹو ایک بار پھر بے نظیر کی شکل میں زندہ ہو چکا تھا۔ جنرل ضیاء الحق اور اُس کے حواری بے نظیر سے ڈرنے لگے تھے۔ حبیب جالب مرحوم نے بے نظیر کے بارے میں ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمت کے اُجالے ایک نہتی لڑکی سے

محترمہ بے نظیر بھٹو 1988ء کے انتخابات کے بعد پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ انہوں نے پوری دنیا کے میڈیا کو اپنے سحر میں مبتلا کر لیا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے بے نظیر بھٹو کو اس قدر اہمیت دی کہ بھٹو شہید کو اتنی کوریج نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایک مسلمان ملک میں ایک لبرل خاتون کا منتخب ہونا معجزے سے کم نہ تھا۔ بے نظیر بھٹو وزیراعظم کی حیثیت میں امریکہ کے دورے پر گئیں اور امریکن کانگریس سے خطاب کیا تو کانگریس کے تمام ارکان نے کھڑے ہو کر دیر تلک تالیاں بجائیں۔ کانگریس کی تاریخ میں اس قدر پُر جوش استقبال کسی لیڈر کا نہ ہوا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو 1993 میں دوبارہ پاکستان کی وزیراعظم منتخب ہو گئیں۔ وہ ایشیا کی واحد خاتون تھیں جنہیں دنیا بھر کی یونیورسٹیاں لیکچر کے لیے دعوت دیتی تھیں۔ بے نظیر بھٹو نے پاک فوج کو میزائل ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کر کے پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنایا۔ انہوں نے خواتین اور نوجوانوں پر خصوصی توجہ دی اور پی پی پی کو متحد رکھا۔ انہوں نے سندھی قوم پرست لیڈروں کے دباؤ، اپنے پاپا اور دو نوجوان بھائیوں کی شہادتوں کے باوجود وفاق کی سیاست کی۔ انہیں ''چاروں صوبوں کی زنجیر'' قرار دیا گیا۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

محترمہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی ایئرپورٹ پر اُتریں تو 30 لاکھ عوام نے ان کا فقید المثال استقبال کیا۔ برصغیر کی تاریخ میں ایسا استقبال کسی شخصیت کا نہیں ہوا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے لیے اُن کی زندگی کا یہ یادگار دن تھا۔ عوام دشمنوں نے اس یادگار دن کو خودکش دھماکے سے سیاہ دن بنا دیا۔ پی پی پی کے 180 کارکن شہید اور 500 زخمی ہو گئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو محفوظ رہیں۔ عوام دشمن محترمہ بے نظیر بھٹو کا تعاقب کرتے رہے اور 27 دسمبر 2007ء کو اس وقت محترمہ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے جب محترمہ بے نظیر بھٹو لیاقت باغ کے تاریخی جلسہ سے تاریخی خطاب کے بعد زرداری ہاؤس واپس روانہ ہو رہی تھیں۔ پاکستان، عوام اور جمہوریت کے دشمنوں نے 54 سالہ نوجوان خاتون رہنما کو گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ خودکش دھماکے سے پارٹی کے 22 کارکن بھی شہید ہوئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت سے پورا پاکستان بلکہ پوری دنیا سوگ میں ڈوب گئی۔

درد کو اشکوں کی لڑیوں میں پرونا ہے مجھے
رات خاموش ہے تیرے لیے رونا ہے مجھے
اے وطن تیری محبت کا صلہ دار و رسن
ابھی سنگسار تیری گلیوں میں ہونا ہے مجھے

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہونے کے بعد بھی بے نظیر ہیں۔ اُن کی شہادت پر پاکستان اور دنیا کا پریس کئی روز تک انہیں خراج تحسین پیش کرتا رہا۔ اُن کی شخصیت کے بارے میں آرٹیکل لکھے گئے۔ پاکستان کے ہر گھر میں اُن کے غم کو محسوس کیا گیا۔ اُن کی شہادت پر پورے ملک میں بے مثال احتجاج ہوا۔ احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ درجنوں افراد صدمے سے موت کی وادی میں چلے گئے۔ ہر شہر میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ پوری دنیا کے لیڈروں نے تعزیت کا اظہار کیا۔ سیکیورٹی کونسل نے تعزیتی قرارداد منظور کی۔ الیکٹرانک میڈیا کئی روز تک بے نظیر بھٹو کے بارے میں خصوصی پروگرام نشر کرتا رہا۔ پاکستان کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے بلا امتیاز محترمہ کی قبر پر حاضری دی اور پھولوں کی چادریں چڑھائیں۔ محترمہ زندہ بھی بے نظیر تھیں اور مر کر بھی بے نظیر رہیں گی۔

دل روئے زباں روئے قلم روئے بیاں روئے
بی بی تیری تربت پر اب سارا جہاں روئے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

لاہور سے نوڈیرو تک

قیوم نظامی

محترمہ بےنظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پی آئی اے کی پروازیں متاثر ہوئیں۔ بذریعہ طیارہ نوڈیرو پہنچ کر محترمہ کی آخری رسومات میں شرکت ممکن نہ تھی۔ لاہور سے نوڈیرو کا زمینی سفر چودہ گھنٹے کا ہے۔ میں چونکہ ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن کرا چکا ہوں اس لیے طویل سفر کے قابل نہیں رہا لہٰذا شدید خواہش کے باوجود محترمہ بےنظیر بھٹو شہید کے جنازے اور رسم قل میں شرکت سے محروم رہا۔

میں نے رسم چہلم میں شرکت کا ارادہ کر لیا۔ بیگم عابدہ حسین نے مشورہ دیا کہ محترمہ کے چالیسویں پر بہت رش ہوگا لہٰذا قبر پر حاضری اور آصف علی زرداری صاحب سے اظہار تعزیت کے لیے پہلے جانا مناسب ہوگا۔ میں نے لاہور سے سکھر، موہنجوڈارو کراچی لاہور کی ریزرویشن کرالی۔ لاہور سے سکھر سیٹ کنفرم نہ ہو سکی اور مجھے چانس لینے کے لیے لاہور ایئرپورٹ جانا پڑا۔ پی آئی اے کے ایک افسر نے مجھے پہچان لیا اور بڑی محبت سے بورڈنگ کارڈ میرے حوالے کر دیا۔ فلائٹ اڑھائی گھنٹے لیٹ ہوگئی یہ تاخیر خوشگوار رہی اور مجھے گوجرانوالہ کے پارٹی ٹکٹ ہولڈروں اور سجاد بخاری سے تفصیلی تبادلہ خیال کا موقع مل گیا۔ ہماری گفتگو کی مرکز و محور محترمہ بےنظیر بھٹو کی شخصیت تھی۔ ہر کوئی اپنی خوشگوار یادیں سنا رہا تھا۔ سجاد بخاری نے کچھ ایسے آف دی ریکارڈ واقعات سنائے جن سے محترمہ بےنظیر بھٹو شہید کی عظمت اور بصیرت مزید آشکار ہوئی۔ اخبارات کے مالکان سی پی این ای کا ایک وفد بھی آصف علی زرداری صاحب سے تعزیت کے لیے اسی فلائیٹ سے نوڈیرو روانہ ہوا۔ اس وفد میں عارف نظامی، مجیب الرحمٰن شامی اور خوشنود علی خان شامل تھے۔ پی پی پی گوجرانوالہ کے وفد میں میاں اظہر حسن ڈار، خواجہ کلیم الرحمٰن، لالہ قدیر اور دیگر شامل تھے۔

پی آئی اے کی فلائیٹ لاہور سے سکھر رات 8 بجے پہنچی۔ سکھر سے نوڈیرو رات کو سفر سے گریز کیا جاتا ہے لہٰذا رات کو رائل پیلس گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ یہ گیسٹ ہاؤس اچھا ہے اور کمرے کا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کرایہ 1200 روپے ہے۔ جمعہ کے روز بارہ بجے دوپہر ایک پرائیویٹ کار کرایہ پر لی اور نوڈیرو کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں کچے دیہات دیکھ کر دل افسردہ ہوا۔ بچوں کے پاؤں ننگے تھے جو غربت اور پس ماندگی کی گواہی دے رہے تھے۔ پاکستان کے ظالمانہ استحصالی نظام نے شہریوں سے ان کے بنیادی حقوق بھی چھین رکھے ہیں۔ سندھ کے جاگیردار عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں جب کہ ان کے مزارعوں اور محنت کشوں کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہے۔ ڈیڑھ بجے نوڈیرو پہنچا۔ پی پی پی کے جیالوں کے قافلے بھٹو ہاؤس نوڈیرو پہنچے ہوئے تھے۔ گھر کے اندر دو سو افراد برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے جو آصف علی زرداری صاحب سے تعزیت کے انتظار میں تھے۔ میں بھی عوام کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا میرا خیال تھا کہ آصف صاحب مجھے نہیں پہچان سکیں گے کیونکہ میری ان سے ملاقاتیں بہت کم رہی تھیں۔ آصف زرداری اپنے کمرے سے باہر آئے سندھی میں مختصر تقریر کی اور اجتماعی دعا کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ آصف صاحب نے مجھے نہیں پہچانا کہ اسی لمحے ایک سندھی جوان میرے قریب آیا اور کہنے لگا کہ ''نظامی صاحب زرداری صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں'' میں ڈرائنگ روم کے اندر گیا اور آصف صاحب سے گلے مل کر ان سے اظہار تعزیت کیا۔ ان کو اپنی دو کتب ''جو دیکھا جو سنا'' اور ''جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں'' پیش کیں۔ آصف زرداری صاحب پہاڑ جیسے غم اور کربلا جیسے صدمے کے باوجود بڑے صبر اور حوصلے کا مظاہرہ کر رہے ہیں محترمہ بےنظیر بھٹو شہید نے ان پر جو بھاری ذمے داری عائد کی اسے نبھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں تین گھنٹے تک ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بڑی ہمت سے تعزیت کے لیے آنے والے مردوں اور خواتین سے الگ الگ مختصر خطاب اور فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ انہوں نے ٹی وی چینلز کو انٹرویوز بھی دیئے۔ گوجرانوالہ کے ٹکٹ ہولڈرز سے باتیں کرتے ہوئے آصف زرداری صاحب نے کہا ''محترمہ بےنظیر بھٹو نے اپنی شہادت سے پہلے لیاقت باغ راولپنڈی میں جو آخری خطاب کیا تھا، اسے پمفلٹ، کیسٹ اور سی ڈی کے ذریعے عوام تک پہنچائیں اور محترمہ کے چالیسویں تک دعائیہ محفلیں منعقد کریں۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے پی پی پی کی تاریخ کا پورا ریکارڈ ہمارے لیے محفوظ کیا ہوا ہے۔ اس میں یہ بھی موجود ہے کہ جب پی پی پی کے راستے میں کوئی مشکل مرحلہ آیا تو اسے کیسے حل کیا گیا۔ محترمہ کا یہ ریکارڈ ہماری رہنمائی کرے گا محترمہ نے جس اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی جان قربان کی ہم سب کو وہی مقصد عزیز ہونا چاہیئے اور اس کے لیے جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔'' فرحت اللہ بابر، فاروق ایچ نائیک، رخسانہ بنگش، فوزیہ حبیب، خورشید جونیجو اور احمد سولنگی آصف زرداری صاحب کی معاونت کر رہے ہیں۔ پروفیسر اعجاز

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اُلحسن نے مجھے بتایا کہ چیئرمین پی پی پی نے انہیں ایک ہفتہ سے نوڈیرو میں روک رکھا ہے۔ یہ ایک خوشگوار فیصلہ ہے اگر پی پی پی سول سوسائٹی سے رابطے بڑھا سکے تو پاکستان کے شہروں میں پی پی پی ایک بار پھر سیاسی قوت بن سکتی ہے۔

خورشید جونیجو بھٹو خاندان کے دیرینہ قابل اعتماد رفیق ہیں۔ وہ بختاور ٹرسٹ کے انچارج ہیں۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کے انتخابی حلقہ کے نگراں ہیں اور گڑھی خدا بخش میں بھٹو خاندان کے قبرستان کی دیکھ بھال اور مزار کی تعمیر بھی انہی کی سپرد ہے۔ خورشید جونیجو نے محترمہ کے بارے میں کئی مشاہدات میرے ساتھ شیئر کئے جن میں کئی آف دی ریکارڈ تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ''محترمہ نے پاکستان واپسی کے بعد گڑھی خدا بخش قبرستان کا معائنہ کیا۔ بیس سال میں پہلی بار ہر قبر کو دیکھا۔ محترمہ نے پوچھا کہ کچھ قبریں کچی کیوں ہیں۔ پرانے خاندانی ملازم نے بتایا کہ عورتوں کی قبریں کچی رکھی جاتی ہیں۔ محترمہ نے کہا ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے۔ محترمہ نے کہا کہ خورشید، بھٹو شہید کے بھائیوں اور بیٹوں کی قبروں سے تاریخ وفات دیکھ کر بتاؤ۔ جب ان کو عمریں بتائی گئیں تو کہنے لگیں بھٹو خاندان کے افراد 50 سے 55 سال کی عمر میں وفات پا جاتے ہیں۔ بھٹو شہید کی قبر کے ساتھ خالی جگہ کے بارے میں محترمہ نے اشارہ کیا جسے میں سمجھ نہ سکا کیونکہ میرے ذاتی علم میں تھا کہ محترمہ نے آصف زرداری صاحب کے ساتھ شادی کے بعد وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ نواب شاہ میں زرداری خاندان کے قبرستان میں دفن ہوں گی۔ محترمہ کی شہادت کے بعد آصف زرداری صاحب نے بتایا کہ بی بی نے ان سے ایک ماہ پہلے بھٹو شہید کی قبر کے ساتھ دفن ہونے کی اجازت لے لی تھی۔ میں نے محترمہ سے پوچھا کہ 5 جنوری کو بھٹو شہید کے جنم دن پر کس نوعیت کی تقریب منعقد کی جائے۔ محترمہ نے کہا میں تو نہیں ہوں گی آپ خود ہی کر لینا۔''

پاکستان بھر میں ایسے لاکھوں افراد موجود ہیں جن کے پاس محترمہ کی خوشگوار یادیں موجود ہیں۔ میں آصف زرداری صاحب سے اجازت لے کر موہنجوڈارو ایئرپورٹ روانہ ہوا۔ راستے میں بیگم ڈاکٹر اشرف عباسی کے گھر پر محترمہ کی شہادت کا افسوس کرنے کے لیے رکا ڈاکٹر اشرف عباسی کا گھر واحد گھر تھا جہاں پر پنجاب اور دوسرے صوبوں سے آنے والے پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو ٹھہرایا جاتا تھا اور ان کی مہمان نوازی کی جاتی تھی۔ میں نے سندھی نوجوانوں کے جذبات جاننے کے لیے ان سے گفتگو کی۔ ماتو جتوئی کے ایک نوجوان نے پُر تاثیر اور دانش مندانہ باتیں کیں۔ یہ نوجوان سرکاری ملازم ہے اس لیے اس کا نام تحریر نہیں کر رہا۔ مڈل پاس ہے مگر اس کی گفتگو کا معیار ایم اے پاس سے کم نہیں تھا۔ کہنے لگا ہمیں پنجاب کے بھائیوں سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ وہ

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھی ہماری طرح مسائل کا شکار ہیں۔ پاکستان ہم سب کا وطن ہے اور ہمیں متحد ہو کر پاکستان کو محفوظ اور مستحکم بنانا ہے۔ سندھی عوام محبت اور پیار کرنے والے لوگ ہیں۔ گھر میں آگ لگی ہو تو اسے بجھانا چاہیئے۔ یہ تاثر غلط ہے کہ سندھی پنجابیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ خیر پور کے ممتاز علی اور سکھر کے غلام نبی نے بھی اس تاثر کو بے بنیاد قرار دیا کہ سندھ کے عوام پنجاب کے خلاف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا گلہ اسٹیبلشمنٹ سے ہے جو چاروں صوبوں کے عوام کا استحصال کر رہی ہے اور جو عوام کے مقبول رہنماؤں کو قتل کر دیتی ہے۔ نوڈیرو میں میری آغا سراج درانی سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے والد نے شکار پور میں ذوالفقار علی بھٹو شہید کے بارے میں تمام کتابوں اور رسائل کا نایاب ذخیرہ جمع کیا ہوا ہے۔ آغا صاحب نے مجھے یہ لائبریری دکھانے کی پیش کش بھی کی۔ اگر آغا صاحب یہ نادر ذخیرہ کراچی منتقل کر سکیں تو تاریخ اور سیاست کے طلبہ ان کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ گڑھی خدا بخش میں ذوالفقار علی بھٹو شہید، محترمہ بےنظیر بھٹو شہید، مرتضیٰ بھٹو شہید اور شاہنواز بھٹو شہید کی قبروں پر حاضری دی، پھول نذر کئے اور پاکستان کی سلامتی، اور شہداء کے مشن کی تکمیل کی دعا کی میں نے بلاول ہاؤس کراچی میں ڈاکٹر صفدر عباسی سے اظہار تعزیت کیا۔ ڈاکٹر صفدر نے کہا کہ کاش ہم بھی محترمہ کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتے۔ انہوں نے بتایا کہ بیگم ناہید خان محترمہ سے پہلے گاڑی کے سن روف سے باہر نکلتی تھیں۔ محترمہ نے کہا کہ سن روف کی جگہ چونکہ صرف ایک شخص کے لیے ہوتی ہے لہٰذا باہر نکلنے میں دقت ہوتی ہے، لہٰذا بیگم ناہید خان اپنی نشست پر بیٹھی رہیں۔ صفدر عباسی نے بتایا کہ لیاقت باغ میں جب محترمہ کو گولی لگی تو وہ بیگم ناہید خان کی گود میں گر گئیں۔ یہ المناک منظر زندگی بھر ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہمارا پیچھا کرتا رہے گا۔ بیگم ناہید خان بلاول ہاؤس میں موجود نہیں تھیں لہٰذا ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

لاہور سے کراچی واپسی پر فلائیٹ میں بیگم ناہید خان بھی سفر کر رہی تھیں۔ میں اپنی نشست سے اٹھ کر ان کے پاس گیا اور ان سے اظہار تعزیت کیا۔ غم کی وجہ ان سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ اس صدمے سے کب باہر نکل سکیں گی۔ بیگم ناہید خان محترمہ بےنظیر بھٹو کی انتہائی قابل اعتماد ساتھی تھیں۔ جو کسی شخصیت کے جتنا قریب ہوتا ہے اس کا غم بھی اتنا ہی گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ پی پی پی کے رہنما اور کارکن تمام اختلافات بھلا کر سب سے بڑی قومی جماعت کو متحد اور منظم رکھنے میں کامیاب رہیں۔ شہیدوں کے لیے سب سے بڑا خراج تحسین یہی ہے کہ ان کے سیاسی ورثہ کو محفوظ رکھا جائے اور ان کے مشن کو پورا کیا جائے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھٹو خاندان کے سیاسی اثرات

فرح ناز اصفہانی

وطن عزیز میں وفاق کی علامت اور جمہوریت کی شہزادی محترمہ بے نظیر بھٹو کو جس سفاکانہ اور بہیمانہ انداز میں قتل کیا گیا ہے اس پر ہنوز صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ ملک بھر میں عوام پر سکتے کی کیفیت طاری ہے۔ البتہ فوجی جرنیلوں، بیوروکریٹس، مالیاتی تجزیہ کار اور دیگر نخوت پسندوں کی حالت مختلف ہے۔ کیونکہ اُن کی تربیت ہی کچھ یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار نہ کریں۔ یہی سبب ہے کہ ان میں سے کوئی بھی عوام کی سیاست کے رُموز سے آگاہی حاصل نہیں کر سکا۔ صرف وہی لوگ جو ''سیاست کے جذباتی پہلوؤں'' کا ادراک رکھتے ہیں اس امر سے آشنا ہیں کہ بھٹو خاندان عوام میں اس قدر مقبول کیوں ہے اور وہ عام شہری کے دل پر کیوں راج کرتے ہیں۔

اشرافیہ نے بھٹو خاندان اور آصف زرداری کے خلاف کئی عشروں تک زہر افشانی کی ہے۔ ان کی مسلسل کوششوں اور مہم جوئی کے باوجود عوام کی اس محبت میں کوئی کمی نہیں آ سکی جو وہ بھٹو خاندان کے لیے اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی المناک موت کے سوگوار مرحلے پر پارٹی کی قیادت بجا طور پر اُن کے لاڈلے بیٹے بلاول بھٹو زرداری اور اُن کے شوہر آصف زرداری کے سپرد کر دی گئی ہے۔ بلاول بھٹو خونی رشتہ اور آصف زرداری اس جوڑے کی عظیم قربانیوں کی علامت ہیں جو اگر جرنیلوں کی بات مان لیتے تو ایک نہایت آسودہ اور خوشحال زندگی بسر کرتے لیکن اپنا راستہ خود منتخب کر کے آگے بڑھنے والے لوگ بے مقصد اقتدار اور اختیارات پر یقین نہیں رکھتے۔ شہید بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری دونوں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ عوام کو ہی انتخاب کا حق حاصل ہے۔ جمہوریت سے وابستگی نے ہی شہید بے نظیر بھٹو کی زندگی کو خطرات لاحق کیے اور آصف زرداری نے بھی اُصولوں کے لیے جدوجہد ترک کرنے کا آسان راستہ چھوڑ کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بھٹو، زرداری خاندان کو اس وقت بھی عوام کی بے پناہ حمایت اور تائید حاصل رہی جب اُن کے بڑے چل بسے یا قتل کر دیے گئے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خوف ایک فطری امر اور انسانی جبلت کا حصہ ہے لیکن بھٹو خاندان شاید انسانوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جو خوف کو اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ بھٹو کے ورثے کے بارے میں آنے والے دنوں میں بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اس خاندان کے بدترین مخالفین اور ناقدین کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بھٹو خاندان کی بے خوفی اور دلیری کو عوام میں بے پناہ پذیرائی حاصل ہے اور اس بات سے ملک کی اسٹیبلشمنٹ خوفزدہ رہتی ہے۔ جرأت مندی اور بے خوفی کا یہ عنصر ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو میں یکساں طور پر پایا جاتا تھا۔ یہ بے نظیر بھٹو ہی تھیں جو بے خوف ہو کر صدر پرویز مشرف کے اقتدار اور دہشت گردوں کی عصبیت کو للکارنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔ عین اس وقت جب بے نظیر بھٹو سے رابطے کیے جا رہے تھے اس سلسلے کو ''ڈیل'' کا نام دے کر بے نظیر کے امیج کو خراب کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان کو توقع تھی کہ ''پاور شیئرنگ'' اور ''امریکہ کی پشت پناہی'' کی باتیں کر کے وہ بے نظیر بھٹو کو وطن واپسی سے پہلے ہی عوامی تائید سے محروم یا کم از کم اس تائید کو کم کر کے بی بی کو کمزور ضرور کر دیں گے۔ دانشور طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض افراد نے جو نفسیاتی جنگ کے حربوں پر یقین رکھتے ہیں بے نظیر کی جمہوری حیثیت سے سمجھوتہ کر لیا لیکن انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت میں خلا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں اسٹیبلشمنٹ کی ان توقعات کو ایک نئی زندگی دی گئی کہ پاکستان کی سیاست سے بھٹو خاندان کی مقبولیت ختم ہو جائے گی اور ایک ایسی جمہوریت کے نفاذ کا راستہ ہموار ہو جائے گا جس کا خواب ایوب خان سمیت ہر فوجی حکمران دیکھتا چلا آیا ہے۔

اس کے برعکس بے نظیر بھٹو کو علم تھا کہ اُن کی طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور اگر ایک بار وہ اپنے عوام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ اُن کی حمایت ضرور حاصل کر لیں گی۔ اس مقصد کے لیے اُن کو ملک کے اندر نقل و حرکت کی آزادی درکار تھی اور انہوں نے مذاکرات کے ذریعے اس (آزادانہ نقل و حرکت) کو ہی یقینی بنایا تھا۔ اپنے ناقدین اور مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے تند و تیز تبصروں کے باوجود انہوں نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام جمہوری قوتوں کے لیے گنجائش پیدا کی۔ وطن واپسی پر اُن کے شاندار استقبال اور ملک بھر میں عوام کی سیاسی بیداری کی لہر نے دوبارہ ثابت کر دیا کہ مسلسل پروپیگنڈہ کے باوجود بھٹو خاندان اب بھی ایک ناگزیر سیاسی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کی سیاست بے نظیر بھٹو کی شخصیت اور اس کی پارٹی کی موجودگی کے بغیر نامکمل ہے۔ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی پر اُن کے کراچی کے جلوس میں کارساز کے مقام پر جو خودکش حملہ کیا گیا وہ بے نظیر بھٹو کے لیے واضح پیغام تھا کہ اُن کو صرف ایسی صورت ہی میں خوش

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

شہادت کا سُرخ دوشالہ

زاہدہ حنا

کل خوابوں کی روشنی سے دمکتا ہوا آسمان کی طرف دیکھتا ہُوا سوالی چہرہ تھا، دعا کے لیے اُٹھے ہوئے آرزومند ہاتھ تھے۔ فضاؤں میں گونجتی ہوئی اُس کی آواز تھی جو وجد کے عالم میں زندگی کا نعرۂ مستانہ لگاتی تو لاکھوں لوگ اس آواز کے آہنگ پر رقص کرتے تھے۔

آج خواب دیکھتی ہوئی وہ آنکھیں بے خواب ہوئیں، دعا مانگتے وہ ہاتھ شل ہوئے، دلوں میں اُمید کے چراغ جلاتی ہوئی وہ آواز بُجھ گئی۔

اُس نے سندھ کے سرمد، صوفی عنایت اور ذوالفقار علی کی راہ پر چلتے ہوئے شہادت کا سرخ دوشالہ اوڑھا اور اپنے جاں نثاروں کے شور و شین اور گریہ و بین کی گونج میں تہہ خاک نیند کرنے چلی گئی۔

اب زمیں کا پیار باقی ہے فقط
آسماں کی مہربانی دیکھ لی

اُس کا سوگ صرف اُس کا ماتم داروں نے ہی نہیں منایا، ملک کے کروڑوں دل فگاروں کی آنکھوں نے اُسے بہ چشم نم رخصت کیا۔ اگر اس کے چاہنے والوں کا یہ عالم تھا کہ 'نے ہوش ہے، نے تاب و تواں ہے'، تو وہ بھی تھے جو اس سے سیاسی اور نظریاتی اختلاف رکھتے تھے مگر وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ

''جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے۔''

بے نظیر بھٹو کہنے کو پیپلز پارٹی کی رہنما تھیں لیکن اُن کے سفاکانہ قتل نے سارے ملک کو دہشت زدہ اور دل زدہ کر دیا۔ اس قتل کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی اور ملکوں ملکوں اُن کا سوگ منایا گیا۔ ایسے جیتے جاگتے، خواب دیکھتے اور خواب دکھاتے ہوئے رہنماؤں کی پیدائش کسی بھی سماج کے لیے وقت کی عطا اور اس کی جود و سخا ہوتی ہے لیکن ہمارے یہاں وہ 'حاکم شام' پائے جاتے ہیں جو ہر دس

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آمد یہ کہا جائے گا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سیاست کریں۔ انہوں نے محترمہ کو باہر نہ نکلنے اور عوام سے نہ ملنے کی ہدایت کی لیکن کارساز کے خودکش حملہ کے چند دنوں بعد ہی وطن عزیز کی سڑکوں پر جلوس میں شامل عوام کے ساتھ رابطے میں دکھائی دیں۔ یہی وہ انداز ہے جو بھٹو خاندان کے افراد عوام سے رابطے اور ملاقات کے لیے اختیار کرتے ہیں اور بے نظیر بھٹو اس روایت اور روش سے ہٹ کر کوئی الگ راستہ اختیار نہیں کر سکتی تھیں۔ 27 دسمبر کے سانحہ میں بے نظیر نے جامِ شہادت نوش کر لیا مگر انہوں نے اس مشعل کو روشن رکھا جو اُن کے والد ذوالفقار علی بھٹو نے جلائی تھی۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور حکومت کرنے کا اختیار اُن کو اور اُن کے منتخب کردہ نمائندوں کو ہی حاصل ہے۔ وہ تمام لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ غریب عوام کی بجائے ان کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہے وہ طاقت کے زور پر اور غیر ملکی امداد کے بل بوتے پر کچھ دیر کے لیے تو ضرور ایوان اقتدار میں براجمان رہ سکتے ہیں لیکن وہ اپنے جیتے جی اور موت کے بعد بھی عوام کی حقیقی محبت اور احترام کے حق دار نہیں ہو سکتے جو بھٹو خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بیس برس بعد ایسے رہنماؤں کو اپنے اور اپنے ادارے کے اقتدار پر سے صدقہ کر دیتے ہیں۔ ہمارا ایک منتخب وزیراعظم متنازع عدالتی فیصلے کی سولی پر چڑھایا گیا، ہماری دو مرتبہ وزیراعظم منتخب ہونے والی قومی رہنما کو قتل کیا گیا پھر اس کا قتل نامہ 'القاعدہ' کے نام درج ہوا اور دو مرتبہ منتخب ہونے والا ہمارا تیسرا وزیراعظم جلاوطنی اور ذلت و توہین کے جہنم میں بلایا گیا، اس پر قاتلانہ حملہ کرایا جاتا ہے اور اس کے سامنے بھی صبح و شام اُسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی جاری کردہ ''مبینہ ہٹ لسٹ'' لہرائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اپنے اقتدارِ مطلق کا اعلان ہے۔ اس بات پر اصرار ہے کہ جمہوریت آئین اور آزاد عدلیہ کا نام لے کر بلڈی سویلینز (bloody civilians) ہمارے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بنیں ورنہ ہم ایک ایک کو درسِ عبرت بنا دیں گے۔

وزارتِ داخلہ کے ترجمان اپنے خشک ہونٹوں پر ہر پانچ سیکنڈ بعد زبان پھیر کر کیسی کمال کہانیاں سناتے ہیں۔ پہلے یہ کہانی سنائی گئی کہ بےنظیر خودکش حملے کا شکار ہوئیں، پھر کہا گیا کہ اس خوفناک دھماکے سے اُن کی حرکت قلب بند ہوگئی۔ میڈیا نے کہا کہ انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا، اُن کی پارٹی کے رہنما مخدوم امین فہیم اور ناہید خان نے اس بات کی تصدیق کی لیکن وزارتِ داخلہ کے ترجمان فرماتے ہیں کہ یہ بیت اللہ محسود کا کام ہے۔ وہ میڈیا کو پشتو میں ہونے والی ایک گفتگو سُنواتے ہیں، ساتھ ہی اس کا ٹرانسکرپشن (transcription) صحافیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چند ایکسرے لہرائے جاتے ہیں، بی بی جس لینڈ کروزر میں سفر کر رہی تھیں اس کی کھلنے والی چھت کے لیور کی تصویر دکھائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ دھماکے سے لڑکھڑا کر بی بی جب گاڑی کے اندر گریں تو یہ لیور اُن کے سر پر لگا اور اسی کی وجہ سے اُن کی جان گئی۔ ہسپتال سے ڈاکٹر مصدق کی ''تصدیق شدہ'' نئی رپورٹ بھی آ جاتی ہے جس میں گولیوں کے بجائے کسی آہنی ٹکڑے سے لگنے والی ضرب کا ذکر ہے۔

کوئی وزارتِ داخلہ کے ان ترجمان سے پوچھے کہ جب ساری ''کارگزاری'' ایک لیور کی تھی تو پھر بیت اللہ محسود اپنے نوجوانوں کے کس کارنامے پر مولوی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے اور دونوں کے درمیان مبارک باد کا تبادلہ ہو رہا تھا؟ بی بی کی وہ آخری جھلکیاں جن میں ایک ہاتھ نمودار ہوتا ہے، ایک پستول گولیاں اُگلتا ہے اور انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے، وہ کس کا ہاتھ تھا؟ اور اسی پستول کی گولیوں نے ان کی جان لی یا کہیں بلندی پر بیٹھا ہوا کوئی ماہر نشانہ باز رائفل پر لگی ہوئی ٹیلی اسکوپ میں اُن کا سر اور اُن کی گردن دیکھ رہا تھا؟ جان ایف کینیڈی کا قتل اور اُن کی تفصیلات ہم میں سے کون بھلا پایا ہے؟ وہ بھی تو ریاست کے اندر قائم ریاست کی کارگزاری تھی۔ اس قتل پر آج

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھی امریکی انٹیلی جنس ایجنسی کے تاریک سائے ہیں۔

بےنظیر بھٹو کے قتل کے حوالے سے ہمیں وہ کہانیاں کیوں سنائی جا رہی ہیں جن پر کوئی ذہنی معذور ہی یقین کر سکتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پستول یا رائفل کی لبلبی پر اُنگلی تو کسی نامعلوم شخص کی تھی لیکن اس اُنگلی کو حکم اُن سے ملا تھا جو ملک پر اپنا دائمی اقتدار چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ ہر حد عبور کر سکتے ہیں، کسی بھی انتہا تک جا سکتے ہیں۔

حکومت کا اعتبار پہلے ہی کب رہا تھا، بےنظیر بھٹو کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے بعد اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات سنی جائے گی، اُسے وزن دیا جائے گا تو یہ محض اس کی خوش فہمی ہے۔ اُن کا قتل کسی سے بھی منسوب کیا جائے، اُسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی ٹیپ چلوا دی جائے تب بھی لوگ کسی بیان، کسی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کا اعتبار نہیں کریں گے۔ لوگ سب کچھ جانتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں بم کا دھماکہ ہوا وہ جگہ تھوڑی ہی دیر میں کیسی محنت اور مہارت سے دھو دی گئی۔ پریشر پائپوں نے خون کے دھبے دھو دیے، قاتل کے قدموں کے نشان دھو دیے لیکن کیا خون کے دھبے واقعی دھوئے جا سکتے ہیں.....؟ اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ بےنظیر جیسی قومی رہنما کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ آصف علی زرداری کی خواہش پر ہوا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ بیان درست ہے یا نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ناپسندیدہ سیاسی جماعتوں کے اراکین کی اتنی تابعدار کب سے ہوگئی کہ اس نے پوسٹ مارٹم جیسے بنیادی فرض سے رُوگردانی کی؟

اور اب بش بہادر سے لے کر چوہدری برادران تک سب ہی کے بیانات آ رہے ہیں کہ انتخابات مقررہ تاریخ پر ہونے چاہئیں۔ چوہدری برادران تو پیپلز پارٹی کے سوگوار رہنماؤں اور کارکنوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ بی بی چونکہ انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں، اس لیے انہیں اُن کی اس خواہش کو وصیت سمجھ کر اس کا احترام کرنا چاہیے اور انتخابات کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیے۔

کوئی اُن سے پوچھے کہ کون سے انتخابات؟ وہ جو اقتدار پر ناجائز قابضین کو اگلے پانچ برسوں کے لیے اس ملک کے سولہ کروڑ لوگوں کی زندگیوں کا مالک و مختار بنا دے؟ کس کی نگرانی میں ہونے والے انتخابات؟ اُن کی نگرانی میں جنہوں نے ہر قدم اور ہر مرحلے پر دھاندلی، بددیانتی اور خیانت کا ثبوت دیا ہے؟

اس وقت انتخابات میں حصہ لینا بےنظیر کے شہید خون سے غداری ہے، ان انتخابات میں حصہ لینا بش بہادر کی بچھائی ہوئی بساط کا مہرہ بننا ہے۔ صرف بےنظیر کے جاں نثار ہی نہیں ملک کا ہر

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

''وڈی بواء.....الوداع!''

فاطمہ بھٹو

میرے اور میری پھوپھی (بے نظیر بھٹو) کے تعلقات اگرچہ طویل مدت سے پیچیدہ رہے ہیں، تو یہ واقعی ایک حقیقت ہے، لیکن افسوس ناک حقیقت! سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سال کا عرصہ کچھ خوشگوار نوعیت کا نہیں رہا لیکن اب وہ مجھے مختلف انداز میں یاد آتی رہیں گی۔ اُن کی یادیں تو ہمیشہ آئیں گی، کیونکہ میں آخر کار اپنے گھرانے، خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ تشدد کا شکار ہوئیں اور تشدد کسی بھی شکل میں ہو، بہت ظالمانہ ہوتا ہے۔ میں آنکھوں میں آنسو لیے اور دل میں غم وغصہ لیے انہیں الوداع کہتی ہوں۔ بچپن میں ہی اپنی پھوپھی کو ''وڈی بواء'' کہا کرتی تھی۔ سندھی میں باپ کی ہمشیرہ کو اسی لقب سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے جب اُن کی شہادت کی خبر ملی تو مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ وڈی بواء کو کچھ ہوا ہے اور پھر فون پر مجھے افسوس ناک اطلاع دی گئی۔ بچپن کی باتیں ہیں کہ میں اور پھوپھو اکٹھے مل کر بچوں کی کتابیں پڑھا کرتی تھیں اور سیب اور دیگر میٹھی چیزیں بہت پسند کرتی تھیں۔ میں اور بے نظیر (پھوپھو) سالہا سال اکٹھے رہتی رہیں، میں نے کبھی کوئی ایسا مضمون نہیں لکھا جو ناممکن دکھائی دے۔ وہ مضامین لکھنے کا بے پناہ شوق رکھتی تھیں لیکن میرے اور اُن کے انداز تحریر میں فرق تھا۔ تاہم بعض لوگ ہم دونوں کا ہی اسی حوالے سے مقابلہ کرتے تھے۔ میرے لیے دو افراد کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل ہے۔ ایک حال سے متعلق اور دوسرے ماضی کے بارے میں۔ درحقیقت میں نے اُن کی سیاست سے کبھی اتفاق نہیں کیا اور نہ ہی اُن کے گرد جمع لوگوں سے کسی بات پر اتفاق کیا۔ ان لوگوں میں موقع پرست اور ابن الوقت شامل ہوتے تھے۔ اور ایسے افراد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے نظیر آنٹی کی پالیسیوں سے بھی کبھی متفق نہیں رہی تھی، اور اب وہ موت سے ہم کنار ہو گئی ہیں تو وقت آ گیا ہے کہ سکون سے یہ صدمہ برداشت کیا جائے۔ میں اس وقت سوگوار ہوں کیونکہ ہمارے خاندان کو ایک بڑا صدمہ دیکھنا پڑا ہے۔ میں بلاول کے لیے اور بختاور اور آصفہ کے لیے بھی سوگوار ہوں۔ میں اُن کے لیے اس وجہ سے بھی سوگوار ہوں کہ میں بھی

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

باضمیر شہری اُن لوگوں سے نفرت کر رہا ہے جو اس ظالمانہ قتل پر مگر مچھ کے آنسو بہا رہے ہیں، سوگ کا اعلان کر رہے ہیں، اخباروں میں تعزیتی اشتہارات شائع کرا رہے ہیں اور لوگوں کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہیں۔

وہ جو بے نظیر کی زندگی سے حسد کرتے تھے کیا انہیں اُن کی رُخصت پر رشک نہیں آیا؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ لوگ اُن کے ماتم دار تابوت سے سر ٹکرا کر دھاڑیں مار رہے تھے، بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ اُن کے تابوت کو چھونے کی آرزو میں ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اُن کے جاں نثار 60 اور 80 گز کے تاریک گھروں اور تنگ گلیوں میں رہنے والے غریب اور غیرت مند لوگ تھے۔ شفیق احمد عرف گوگا اور ظہیر احمد جیسے لوگ، شمع جل بجھی اور پروانے بھی اس پر نثار ہو گئے۔ گم نام قبروں میں سو گئے اور اپنے گھر والوں کو فاقوں اور ذِلتوں کے سپرد کر گئے۔ اس آس میں کہ شاید کبھی اچھے دن ان کے دروازے پر بھی دستک دیں گے۔

بے نظیر کو اُن کے چاہنے والے ''چاروں صوبوں کی زنجیر'' کہتے تھے۔ میاں نواز شریف اُن کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا کرتے کہ کل انہوں نے گلوگیر آواز میں انہیں ''چاروں صوبوں کی زنجیر'' کہا۔ وہ طویل جلا وطنی کے بعد واپس آئی تھیں اس وعدے کے ساتھ کہ ملک میں جمہوری، رواداری، خوشی، خوشحالی اور انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گی۔

بے نظیر نے شہادت کا سرخ دوشالہ اوڑھا اور ہم سے رخصت ہوئیں، انہوں نے اپنا قرض ادا کر دیا، اب یہ زندہ رہ جانے والوں کا قرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اُن کے خوابوں کی تعبیر کو ممکن بنائیں، دُکھے ہوئے دِلوں پر مرہم رکھیں..... کہ یہی بے نظیر کے غم کے شایان شان ہے۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

عبدالقادر حسن

بھٹو خاندان کا آخری خون آلود چراغ بھی اس ملک کے در و بام پر روشن ہو گیا۔ ظلم کی انتہا ہو گئی۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ سکتہ طاری ہونے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ پوری رات گزر چکی ہے ذہن ماؤف ہی رہا اور اب جب چند سطریں لکھنے پر مجبور ہوں کہ اس طرح شاید دل کا غبار قدرے کم ہو جائے، تو الفاظ غائب ہیں اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ زندگی بھر جس سے اختلاف کرتے رہے اس کے پاس ایسی کیا کرامت تھی کہ اس کی جدائی نڈھال اور بے حال کر گئی۔ یوں لگ رہا ہے اور ندامت اس حد تک دل و دماغ کے آر پار ہو رہی ہے جیسے آج وہ ہم سب پر طنز کر رہی ہو اور سرخرو ہو کر کہہ رہی ہو:

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

محترمہ بے نظیر بھٹو کو پورا پاکستان آنسوؤں، سسکیوں اور غم واندوہ کی انتہاؤں سے گزر کر وداع کر رہا ہے۔ یہ صرف ایک بیٹی، بہن کی موت نہیں اس پر پورا ملک داؤ پر لگ گیا ہے۔ اس سے تو بہت بہتر تھا وہ وطن واپس ہی نہ آتی مگر اُسے واپسی کا بہت شوق تھا۔ اس کے لیے اُس نے وہ سب کچھ کیا جو اُسے نہیں کرنا چاہیے تھا یا وہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ سب کچھ کر گزری کہ اپنے وطن عزیز کی بہاریں دیکھ سکے جواب، اس کے بغیر خزاؤں میں بدلتی جا رہی ہیں۔ وہ وطن لوٹنے سے پہلے سے ہی بار بار کہہ رہی تھی کہ اُس کی جان کو خطرہ ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ کیا ہے اور کیا کچھ کر سکتی ہے اور اُس کے دشمن کتنے طاقت ور ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اُس کی کسی حس نے اُسے آنے والے خطروں سے آگاہ کر دیا تھا مگر وہ اس کے باوجود اپنی ضد پر قائم رہی۔ اُس کی یہ ضد ہمیں لے ڈوبی۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

چھوٹی عمر ہی میں باپ سے محروم ہو گئی تھی۔ میں باپ یا ماں کی موت جیسا دکھ برداشت کر چکی ہوں۔

مجھے اُن پارٹی ورکروں کی موت پر بھی گہرا دکھ ہے جو 27 دسمبر کے المیے میں جان دے بیٹھے اور یقیناً اُن کے پسماندگان سے بھی گہری ہمدردی ہے۔ گرجا گھر ہو یا مندر یا مسجد ہو، وہاں عبادت کرنے والے اپنے اُن پیاروں کے لیے دعا کرتے ہیں جو دور بہت دور جا چکے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے مذاہب کے ترانے بھی گاتے ہیں جو اُمید سے بھرے ہیں اور مذہبی گیتوں میں اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ اگر اندھیرا ہے تو روشن سویرا بھی آئے گا۔ پریشانیوں کے بعد اچھا وقت بھی آئے گا۔

''وڈی بواء!'' میں آپ سے ہمیشہ مخلص رہی ہوں اور بچپن میں میں آپ سے اس کا وعدہ بھی کر چکی ہوں۔ آپ کے دنیا سے چلے جانے پر میں بہت دُکھی ہوں اور صدمے کی حالت میں ہوں۔ ہمارے خاندان کے چار قریبی رشتہ دار اور بھی ہیں جن کی موت پر ہم سوگوار ہیں اور جنہیں وحشیانہ طور پر قتل کیا گیا۔

میں اپنے دادا ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی۔ میں بچپن میں دادا شہید کی دھواں دھار تقاریر کی بلیک اینڈ وائٹ ویڈیو کیسٹ بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ میرے والد اُس وقت نوجوان تھے جب اُن کے باپ کو قتل کیا گیا۔ لیکن میرے باپ نے اپنے والد کے قتل کا انتقام لینے کو تادمِ مرگ یاد رکھا۔ جب میرے چچا شاہ نواز کا قتل کیا گیا تو میری عمر تین سال تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب پورا کنبہ پولیس کی حراست میں تھا تو وڈی بواء مجھے سہارا دیتی تھی اور کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ میں چودہ سال کی عمر تک پہنچی تو مجھ سے سب کچھ چھن گیا یعنی میرے باپ میر مرتضیٰ بھی قتل ہو گئے۔ وڈی بواء اب میں 25 سال کی ہو چکی ہوں اور میری سوچ کا مرکز گڑھی خدا بخش کا قبرستان ہے۔ جہاں خاندان کے افراد کی قبریں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں دعا کرتی ہوں کہ آپ کے بعد کسی اور کو الوداع نہ کہنے والی بنوں۔

روزنامہ جنگ، 26 جنوری 2008ء

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

آج اگر ایک دوسرے لیڈر میاں نواز شریف یہ نہ کہتے کہ وہ اس کا مشن لے کر چلیں گے اور وہ اس کی میت پر دھاڑیں مار مار کر نہ روتے تو ہماری مایوسی کے اندھیرے ہمیں نگل جاتے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ملک کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ ملک بھر میں جو ماتم برپا ہے وہ اسی زنجیر کے ٹوٹ جانے کی صدا اور اس کا ماتم ہے۔

بے نظیر کا قتل جو قوم کے لیے شہادت ہے ہماری حکومت کی انتہائی غفلت، لاپرواہی یا نالائقی کا المیہ ہے۔ جس طرح یہ سانحہ سامنے آیا اس کی تفصیلات بتاتی ہیں کہ اُن کی حفاظت کی طرف سے مکمل غفلت کا ثبوت دیا گیا۔ اُن کی گاڑی کو تیز رفتاری سے روانہ ہونا تھا لیکن پولیس وغیرہ کی بھاری نفری بھی اس کا راستہ صاف نہ کر سکی اور وہ بہادر خاتون نعروں کا جواب دینے پر مجبور ہو کر گاڑی کی چھت کھلوا کر سامنے آئی تو مشاق نشانہ باز نے اُس کے سر کو نشانہ بنایا اور وہ گاڑی میں گرتے ہی ختم ہو گئیں۔ جی ایچ کیو کی نظروں کے سامنے پاکستان کی اُمید کا چراغ گل ہو گیا۔ بے نظیر کی شہادت لاتعداد سوال چھوڑ گئی ہے اور یہ سارے سوال اس ملک کے مستقبل کے بارے میں ہیں۔ اب یہ میاں نواز شریف کی فہم و فراست اور جرأت و جسارت پر منحصر ہے وہ بے نظیر کا خلا کس طرح پُر کرتے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے پیپلز پارٹی میں اب کوئی ایسی شخصیت دکھائی نہیں دیتی جو بے نظیر کے ورثے کو سنبھال سکے۔ اُن کی شہادت سے پیپلز پارٹی کا گھر اُجڑ گیا ہے۔ اُن کی ایک بہن صنم بی بی زندہ ہے لیکن اس کا سیاست سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ بے نظیر شہید کی ماں اگر ہوش میں ہیں تو اس چوتھے قتل کو برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا پورا خاندان اس ملک کی نذر ہو گیا، باقی کچھ نہیں بچا۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہل صدق کی تربتیں

اس وقت سوگ اور سکتے کی جو کیفیت پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے اور لوگ یا تو گھروں میں سرنگوں ہو کر غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں یا پھر وہ بے تاب ہو کر باہر نکلتے ہیں اور دیوانہ وار سب کچھ تہس نہس کرتے چلے جاتے ہیں۔ عام پاکستانی حکمرانوں کو ایک فریق سمجھ رہا ہے اس لیے وہ کسی سرکاری اپیل پر کان نہیں دھر رہا۔ الیکشن کو تو فی الحال خواب ہی سمجھا جائے۔ فی الوقت تو اس سانحہ کے فوری اثرات سے عہدہ برآ ہونا ہے اور قوم کو حوصلہ دلانا ہے کہ وہ اس غم کی گھڑی میں تنہا نہیں ہے، قیادت سے محروم نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کی باقی ماندہ قیادت اور ملک کے دوسرے سیاست دانوں کا اب واحد فرض یہ ہے کہ وہ سب مل کر ایک ''بے نظیر'' بن جائیں اور اس عظیم نقصان کے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ازالے کی فکر کریں۔ شکر ہے کہ میاں نواز شریف نے اس کا احساس کیا ہے جو اتفاق سے بچ نکلے تھے کیونکہ اس سانحہ سے کچھ دن پہلے اُن کے استقبالیہ کیمپ پر حملہ ہوا جس سے چار کارکن جاں بحق ہو گئے جو میاں صاحب کے لیے ایک وارننگ تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دست قاتل کتنا دراز ہے اور اس کی خون کی پیاس کس قدر اُسے ہلکان کیے ہوئے ہے۔ بات صرف ایک شہادت پر ختم نہیں ہوتی، آگے چل کر کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن کسی کی جان کی حفاظت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں،

''زندگی کی سب سے بڑی محافظ موت ہوتی ہے۔''

اور یہ موت اللہ کے اختیار میں ہے لیکن جان بچانا بھی فرض ہے۔ یہ فرض ہر کسی کو خود ہی ادا کرنا ہے کیونکہ حکومت نے تو لگتا ہے ہماری جان و مال کی حفاظت سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے۔ میں جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو بھٹو خاندان کے قبرستان میں ایک مکین پہنچ چکا ہو گا۔

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

روزنامہ ایکسپریس

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو.....سابق ملٹری سیکرٹری کے تاثرات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقیوم

جولائی 1993ء میں جب نواز شریف بطور وزیراعظم اور اُس وقت کے صدر غلام اسحاق خان اپنے عہدوں سے سبکدوش ہوئے تو میں گوجرانوالہ چھاؤنی میں بطور بریگیڈیئر ایک انفنٹری بریگیڈ کا کمانڈر تھا۔ عبوری وزیراعظم معین قریشی جن کا انتخاب نواز شریف اور بے نظیر بھٹو صاحبہ کی مرضی سے ہوا تھا، نے اپنے ملٹری سیکرٹری کے انتخاب کے لیے جی ایچ کیو سے تین بریگیڈیئرز کا ایک پینل مانگا، جس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ عبوری وزیراعظم کے ساتھ اُن کے دفتر میں انٹرویو کے بعد انہوں نے مجھے اس ذمہ داری کے لیے چن لیا۔ اگرچہ اس وقت میں نیشنل ڈیفنس کالج سے وار کورس کر چکا تھا اور وار وِنگ میں دو سال بحیثیت ایک Faculty ممبر بہت کچھ سیکھنے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا لیکن وزیراعظم ہاؤس میں تعیناتی میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ بہرحال معین قریشی صاحب کے ساتھ تین ماہ بہت سبق آموز تھے لیکن میں نے اپنا سامان باندھے رکھا اور یہ سوچتے ہوئے کہ نیا سیاسی وزیراعظم جو آئے گا، اس کا یہ حق ہوگا کہ وہ اپنی ٹیم کا انتخاب خود کرے، اس لیے نئے ملٹری سیکرٹری کا چناؤ اس کی صواب دید پر ہی ہونا چاہیے۔ انتخابات کے بعد جب محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم بنیں تو وہاں میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھے انہوں نے ایک ماہ اپنے ساتھ کام کرنے کو کہا جس کے بعد وہ نئے ملٹری سیکرٹری کا انتخاب کرنا چاہتی تھیں۔ ایک ماہ کے بعد انہوں نے جی ایچ کیو کو بتایا کہ وہ مجھے ہی اپنا ملٹری سیکرٹری رکھنا پسند کریں گی۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز تھا۔ بے نظیر صاحبہ کی Reputation ایک ہارڈ ٹاسک ماسٹر کی سی تھی۔ ایک انگریزی سکولوں کی پڑھی ہوئی خاتون جس نے ایک امیر گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور پھر یورپ میں تعلیم حاصل کی ہو، اس کے لیے ایک دیسی قسم کے پینڈو سے فوجی آفیسر کو لمبے عرصے کے لیے برداشت کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ چونکہ صبح سے شام تک وزیراعظم کی ساری مصروفیات کو ترتیب دینے اور پھر اس ترتیب کے مطابق کارروائی کو چلانے میں بہت سی قباحتیں ہوتی ہیں اور ساری اُونچ نیچ کا ذمہ دار

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

ملٹری سیکرٹری ہی ہوتا ہے۔ آپ کی باس (Boss) اگر خاتون ہو، انگریزی میں بات چیت کرتی ہو اور اُن کا تھوڑا ترش مزاج ہونے کی مشہوری بھی ہو تو ایک دیہاتی مرد خواہ کتنا بھی روشن خیال کیوں نہ ہو اس کی مردانہ رگ پھڑکنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان سارے خدشات کے ساتھ میں نے جی ایچ کیو کے حکم پر یہ ڈیوٹی قبول کر لی اور اس کو ایک Challenge بھی سمجھا۔

چند مہینوں میں مجھ پر عیاں ہونا شروع ہو گیا کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک بہترین انسان پنہاں کر رکھا تھا۔ وہ انتہائی محنتی، فرض شناس، وقت کی پابند، قابل اور رحم دل خاتون تھیں۔ ہر آنے والی فائل کا ہر صفحہ اور ہر صفحے کی ہر لائن پڑھتی تھیں اور اس پر نہایت موزوں Observations دیتی تھیں۔ جب کبھی سر کا درد ہو جو اُن کو اکثر ہو جاتا تھا تو سر دوپٹے سے باندھ کر پانچ چھ بکس (Box) فائلوں کے نکال دیتی تھیں۔ بہت سی اہم تقاریر خود لکھتیں اور اُن کو بہتر انداز میں پڑھتیں اور سب سے زیادہ ہم لوگوں کے لیے سبق آموز اُن کے مختلف بین الاقوامی اداروں میں سوالات و جوابات کا Session ہوتا تھا۔ بے نظیر بھٹو کی اُردو کچھ کمزور تھی لیکن محنت کے ساتھ انہوں نے اس کمزوری کو بھی پورا کر لیا تھا۔ صبح آٹھ سے نو بجے تک اخبارات پڑھتیں، پھر ناشتہ کرتیں اور 10 بجے دفتر کا کام شروع کرتی تھیں۔ ایک بجے کھانا کھاتیں۔ 2 بجے سے شام پانچ بجے تک ڈاک نکالتیں اور رات ڈنر کے بعد تقریباً 11 بجے تک ساری ٹیلیفون کالز Return کرتی تھیں۔ مہینے میں دو دن اپنے حلقۂ انتخاب کے دورے اور ایک دن ممبران قومی اسمبلی سے ملنے کے لیے مقرر تھا۔ شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان واک کرتیں یا ٹریڈمل پر ورزش کرتی تھیں۔ وہ ایک بہت ہی Organised شخصیت تھیں۔ تین سالوں میں جو میں نے اُن کے ساتھ گزارے بہت کم موقعوں پر انہوں نے غصے کا اظہار کیا جو بہت وقتی ہوتا تھا اس کے بعد وہ Sorry بھی کہہ دیتی تھیں۔ بے نظیر صاحبہ کی سب سے اعلیٰ خوبی غریب پروری تھی، اُن کا دل نرم تھا اور ترس جلد کھا جاتی تھیں۔ سٹاف کے ساتھ ان کا رویہ بہت مشفقانہ رہتا تھا۔ میں قومی معاملات میں اس وقت تک نہیں بولتا تھا جب تک وہ میری رائے نہ مانگتیں۔ ایک دفعہ جب ہم کار میں اکیلے سفر کر رہے تھے تو مجھے کہنے لگیں، ''آپ کا کیا خیال ہے نواز شریف حکومت نے موٹروے کا منصوبہ غیر ضروری شروع نہیں کیا۔'' اُن کا خیال تھا کہ اس پراجیکٹ کو اب صرف دو لین تک محدود کر دینا چاہیے چونکہ اُن کے مطابق یہ پراجیکٹ صرف سیاسی شہرت کے حصول کے لیے تھا۔ میں نے کہا کہ میڈم اس پراجیکٹ پر فنڈز قومی خزانے سے لگ رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا مستقبل کا قومی منصوبہ ہے جو فی الحال پنجاب سے شروع ہوا ہے۔ یہ صوبہ آپ کا بہت بڑا ووٹ بنک بھی ہے۔ میں نے جب یہ کہنے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کی جسارت کی کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں نہ صرف اس منصوبے کو زور وشور سے مکمل کروا دیتا بلکہ میں لیڈر آف اپوزیشن نواز شریف صاحب کو دعوت دیتا کہ چونکہ آپ نے یہ منصوبہ شروع کیا تھا آپ اس کا افتتاح بھی کریں، اس سے ملک میں سیاسی تناؤ بھی کم ہو گا۔ ان کا فوراً Response تھا۔ ''Come on Brig Sahib I am not that great'' یہ کہنے کے باوجود انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ اس پراجیکٹ کو آگے بڑھایا۔ وہ اپنے پارٹی کارکنوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ساتھ کام کرنے والوں کی بہت عزت کرتی تھیں اور اگر کسی سے سخت ترین ناراضگی بھی ہو جاتی تو اگر وہ آکر بی بی کے سامنے رو پڑتا تو اس کی ساری زیادتیاں معاف کر دیتی تھیں۔ سٹاف کے بچوں کی شادیاں تک attend کرتیں اور اُن کو تحفے دیتیں۔ باہر سے ملنے والے تقریباً سارے تحفے سٹاف ہی میں تقسیم کر دیتیں۔ اپنے تین سالہ ملٹری سیکرٹری کے دور کی ساری عیدیں نوڈیرو کی شوگر ملز کے گیسٹ ہاؤس میں گزاریں، پہلی عید پر میں نے ایک عجیب چیز نوٹ کی، جو شاید اُن کے والد ذوالفقار علی بھٹو صاحب بھی کرتے تھے۔ عید والے دن انہوں نے مجھے بلایا عید مبارک کہی اور پھر مجھے ایک بڑا سفید لفافہ پکڑایا اور کہنے لگیں کہ یہ آپ کے لیے اور آپ کے سٹاف کے لیے عید کا تحفہ ہے۔ میں جب واپس اپنے کمرے میں آیا اور لفافہ کھولا تو وہ ہزار ہزار کے ایک سو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ عید کے بعد جب ہم نوڈیرو سے واپس اسلام آباد پہنچے تو میں نے وزیراعظم کے لیے ایک نوٹ تیار کیا جس میں لکھا کہ ''عید پر آپ نے ہمیں یاد رکھا اس پر میں آپ کا ممنون ہوں لیکن میرے خیال میں یہ موزوں نہیں کہ ہم آپ سے کچھ رقم بطور عید گفٹ لیں۔ ہم آپ کے ساتھ ڈیوٹی پر ہیں جس کی ہمیں تنخواہ ملتی ہے۔ پھر وزیراعظم کے ساتھ سٹاف کے فرائض ادا کرنا ویسے بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ ایک اچھی کتاب مجھے بطورِ عید گفٹ دیں۔ میں اسی استدعا کے ساتھ آپ کو یہ لفافہ واپس کر رہا ہوں مجھے اُمید ہے کہ آپ ناراض نہیں ہوں گی۔'' بےنظیر بھٹو صاحبہ نے بغیر ناراضگی کے وہ رقم واپس لے لی اور مجھے ایک بیرونی دورے پر نیویارک ایئرپورٹ کے ایک بک سٹال سے امریکہ کے سابق صدر نکسن کی ایک کتاب خرید کر دی جو آج بھی میری لائبریری کی زینت ہے۔

بےنظیر بھٹو صاحبہ بیرونی دوروں پر مکمل تیاری کر کے جاتی تھیں۔ تقاریر دو تین جگہ سے لکھواتیں سب کو پڑھتیں اور پھر ایک ڈرافٹ خود تیار کرتیں۔ اس کے علاوہ ہر (Meeting) میٹنگ کے لیے وزارت خارجہ کے گھسے پٹے Points کو الگ کر کے خود اپنے نوٹس تیار کرتی تھیں۔ سیاچن کی ٹھنڈی ہوائیں ہوں یا سندھ کی سخت ترین گرمی وہ اس کو نہایت ہمت کے ساتھ جھیلتیں۔

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بےنظیر بھٹو صاحبہ کے دوسرے تین سالہ دور پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جس کو میں ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دینے کی کوشش کروں گا۔

جون، جولائی 1996ء میں جب میں نے بی بی کو یہ کہا کہ اب میرے تقریباً تین سال ہو چکے ہیں اور میں اب ملٹری سیکرٹری کا عہدہ چھوڑ کر فوج میں اپنا فوجی کام کرنا چاہتا ہوں تو یہ اُن کے لیے ایک بم شیل سے کم نہ تھا۔ چونکہ وہ میرا بڑا احترام کرتی تھیں اور میرے کام کو پسند بھی کرتی تھیں۔ انہوں نے فوراً اس وقت کے آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کو کہا کہ اس کو ہدایت کریں یہ میرے ساتھ کام کرتا رہے۔ COAS نے مجھے جی ایچ کیو طلب کر کے کہا کہ وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری کے عہدے کو ہر کوئی اعزاز سمجھتا ہے اور آپ چھوڑ کر واپس آنا چاہتے ہیں۔ میرے لیے آپ کو اس وقت تک واپس لینا ممکن نہیں جب تک وزیراعظم صاحبہ اجازت نہ دیں۔ میں نے یہ بات آکر محترمہ کو بتائی تو انہوں نے کہا کہ پھر کیا خیال ہے میں نے کہا ''میڈم ایک وزیراعظم کی حیثیت سے اگر آپ حکم دیں تو میں نہ نہیں کر سکتا لیکن چونکہ آپ میرے اُوپر مہربان بھی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ حاضر فوجی افسروں کا سول عہدوں پر زیادہ دیر رہنا اُن کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں پر بُری طرح اثر انداز ہوتا ہے دوسرا وہ متنازعہ بھی ہو جاتے ہیں۔'' انہوں نے مجھے دوبارہ سوچنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی۔ اگلے روز میں نے لکھ کر معذرت کر لی تو بی بی نے میری عہدہ چھوڑنے کی استدعا منظور کر لی۔ بےنظیر بھٹو صاحبہ سے جدا ہونے کے بعد میں نے نوٹ کیا کہ اس عہد ساز شخصیت کے دل میں میری عزت اور بڑھ گئی۔ جلاوطنی کے آٹھ سالوں میں مجھے باقاعدگی سے اُن کے عید کارڈ اور نیک خواہشات کے پیغامات ملتے رہے۔ 2003ء میں جب بحیثیت چیئرمین پی او ایف میں دبئی گیا تو بی سی سی آئی کے ایک سابقہ آفیسر مسٹر اشرف نوابی صاحب نے مجھے فون پر کہا کہ محترمہ چاہتی ہیں کہ اگر ممکن ہو تو میں اُن سے مل لوں۔ میں نے اشرف نوابی صاحب کی وساطت سے بی بی کا یاد رکھنے کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ ''کیونکہ میں حاضر فوجی لیفٹیننٹ جنرل ہوں اور آپ ایک سیاست دان، یہاں سیاسی پناہ لیے ہوئے ہیں، میرا فوجی حکام کی اجازت کے بغیر آپ سے ملاقات کرنا میرے پیشے کی روایات کے خلاف ہو گا۔'' بہرحال میں نے اشرف نوابی صاحب کی وساطت سے بی بی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا، جس کا بی بی نے شکریہ ادا کیا۔ پاکستان آنے سے پہلے بی بی نے غالباً 13 اکتوبر کو مجھے ٹیلی فون کر کے اپنا پروگرام بتایا۔ میں نے اُن کو عرض کیا کہ آپ کی آٹھ سالہ جلاوطنی کے دوران پاکستان کے زمینی حالات بہت بدل چکے ہیں۔ آپ کو اپنی جان کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے اس کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کے بعد

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اسلام آباد میں میری اُن سے آخری ملاقات کوئی آدھا گھنٹہ ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ ملکی حالات اب ایسے ہیں کہ ہم کو اب پارٹی سیاست سے اُوپر اُٹھ کر ملک کو بچانا ہوگا۔ اس سے انہوں نے اتفاق کیا اور اسی لیے وہ نواز شریف صاحب سے مکمل رابطے میں تھیں۔ اُن کا آخری پیغام مجھے فرحت اللہ بابر صاحب نے نواب شاہ سے دیا کہ بی بی چاہتی ہیں کہ پنجاب کی انتخابی مہم میں اگر ممکن ہو تو میں اُن کے ساتھ رہوں۔ میں نے عرض کیا کہ چونکہ میں سیاسی طور پر غیر جانب دار شخص ہوں اس لیے یہ ممکن نہیں۔ اگلے دن اُن کے انتقال کی خبر ملی تو دل خون کے آنسو رو دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

روزنامہ نوائے وقت

منظوم نذرانۂ عقیدت

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

یہ چراغ کِس نے بُجھا دیا

شاہد حسن

سرِ شام کس نے ستم کیا کہ ہر ایک دل کو رُلا دیا
مری ارض پاک پہ یک بہ یک کوئی آسمان گرا دیا
کوئی فرد کب تھی وہ عہد تھی، اور اک عہد قتل ہو یہاں
کوئی دست ظلم شقی کا تھا کہ عجیب حشر اٹھا دیا
ابھی رات ہی کا اندھیر ہے، ابھی صبح ہونے میں دیر ہے
مری ارضِ جان تری خیر ہو، یہ چراغ کس نے بجھا دیا
وہ جو علم و فن کا جمال تھی، جو نسائیت کا کمال تھی
کوئی شاہ کار وجود تھی، جسے آج ہم نے گنوا دیا
یہ اجل کو کیسی تھیں عجلتیں کہ خزاں کے آنے سے قبل ہی
وہ جو خود پیام بہار تھی، اسے جام مرگ پلا دیا
یہ جو راستوں میں ہجوم ہے، یہ عقیدتوں کی جو دھوم ہے
یہ اسی کی ذات کا سحر ہے، تہ خاک جس کو سلا دیا
کوئی روشنی کی لکیر تھی کہ اسی پہ اس نے سفر کیا
کسی روح سے کسی روح نے کہیں جا کے خود کو ملا دیا
یہ عقیدتوں کی جو راہ ہے، تو اسی میں عزم و ثبات ہے
یہی موت اس کا نصیب تھی، اسے رب نے اجر وفا دیا
نہ رہے صفوں میں یہ ابتری، تو اسی کا اس نے بھرم رکھا
کبھی سرد شعلہ غم کیا، کبھی نفرتوں کو بجھا دیا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اِبہام

شبنم رومانی

ہر ایک منظر ہے دُھندلا دُھندلا
کہ جیسے پانی پہ عکس لرزاں
تمام رنگ ایک دوسرے میں کھلے ہوئے ہیں
تمام نقش اپنے وسوسوں سے دُھلے ہوئے ہیں
تمام خلق خدا ہے
چہروں پہ دُھند کی اک نقاب ڈالے
تمام سچائیاں ہیں
اپنے گلے میں صدیوں کے خواب ڈالے
یہ کیا
کہ پیٹھ کی سمت پاؤں سب کے پھرے ہوئے ہیں
یہ نیم تاریک رہ گزر
اور یہ نیم روشن تمام گھر
وحشتِ ہنر میں گھرے ہوئے ہیں
یہ آفتاب،
ایک جگمگاتا حجاب سا ہے
یہ ماہتاب،
ایک زخم خوردہ رباب سا ہے
یہ پھول

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جیسے ہوں ''قتل نامے'' کی سرخ مہریں
یہ شاہ راہوں کے قہقہے ہیں
کہ آبلے ہیں؟
جو پھوٹ کر آج اپنی حالت پہ رو پڑے ہیں
میں سوچتا ہوں
کوئی چھپ کر مجھی میں میرے فسونِ باطن کو بھانپتا ہے
میں لکھ رہا ہوں
مگر مرا ہاتھ کانپتا ہے!!

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

زندہ ہے

حمیرا راحت

لکھ رہی تھی وہ اپنی کرنوں سے
شب کے آنچل پہ روشنی سے لفظ
گھور اندھیرے میں چاندنی سے لفظ
جگنوؤں سے اُجالے مانگ کے وہ
زندگی کے اندھیرے رستوں میں
آگہی کے شکستہ طاقوں میں
ہر قدم پر دیے جلاتی رہی
اک نیا راستہ بناتی رہی
گو کہ پیروں میں بیڑیاں بھی تھیں
آرزو کا بدن دریدہ تھا
پھر بھی ہمت چٹان تھی اس کی
اور سچائی شان تھی اس کی
اک نئی صبح کی سفیر تھی وہ
اک جواں عزم کی اسیر تھی وہ
لوگ کہتے ہیں، مرنے والے لوگ
پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے
جانے کیوں مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے دنیا سے وہ گئی ہی نہیں
ہر دمکتی کرن میں زندہ ہے
روشنی کے بدن میں زندہ ہے
حق کی ہر انجمن میں زندہ ہے
وہ تو ہر اک ذہن میں زندہ ہے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نذرِ بے نظیر

احمد امتیاز

یہ کس کے واسطے فغاں ہے شہر بہ شہر
گلی گلی صف ماتم ہے، کُو بہ کُو کوئی قہر
جدھر بھی دیکھو نظر آرہی ہے آگ ہی آگ
یہ کس نے لوٹ لیا ہے مرے وطن کا سہاگ
خبر یہ کون سے منحوس پل نے پھیلادی
کہ ہم سے روٹھ گئی ہے وطن کی شہزادی
یہ میرے لوگ، یہ میرے وطن کے پیارے لوگ
فلک نے ان کو عطا کردیا ہے کون سا روگ
وہ زخم ہے جو دلوں میں سما نہیں سکتا
یہ بوجھ وہ ہے جو کوئی اٹھا نہیں سکتا
بسی رہے گی نگاہوں میں آخری تصویر
لہو سے خاک پہ لکھی ہے تو نے جو تحریر
کریں فرشتے تری رہنمائی جنت تک
تمہارا نام چمکتا رہے قیامت تک

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جس کو سب بے نظیر کہتے ہیں

انجم جاوید

وہ پری تھی، پری مثال تھی وہ
وہ تھی سورج کہ دیدۂ بینا
وہ کرن تھی کہ چودھویں کا چاند
آئینہ تھی کہ آئینہ تمثال
ذات میں اپنے بے نظیر تھی وہ
جس کو سب بے نظیر کہتے ہیں

اُس کے ہاتھوں میں تھا علم حق کا
وہ زباں کی کھری تھی، حق گو تھی
اِک اُبھرتی ہوئی سحر تھی وہ
سب کی اُمیدیں اُس سے وابستہ
اِک علامت تھی اتحاد کی وہ
جس کو سب بے نظیر کہتے ہیں

ایک تجسیم آگہی کی تھی
جس کی حکمت پہ ناز تھا سب کو
اِک زمانہ مرید تھا اُس کا
لے کے چلنا وہ سب کو جانتی تھی
وہ عجب شخصیت کی مالک تھی
جس کو سب بے نظیر کہتے ہیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

حق پرستی کا جوش لے کے اُٹھی
اُس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی
نہ کوئی خوف جسم و جاں پہ محیط
وہ قیامت کا ایک نمونہ تھی
جس کو سب بے نظیر کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں قتل کی گئی وہ
راہ حق میں شہید کی گئی وہ
میں سمجھتا ہوں آگہی کا چراغ
خون سے اُس کے ہو گیا روشن
ویسا لائیں گے اب کہاں سے ہم
جس کو سب بے نظیر کہتے ہیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کب پیاس بُجھے گی؟

احفاظ الرحمٰن

کب اس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بُجھے گی
کب غم کے ان ویرانوں میں
خارگہوں میں
قتل گہوں میں
زہریلے سانپوں سے بھری سہی راہوں میں
آس امید کا پھول کھلے گا
کب اس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بُجھے گی

کب دہشت کے ہرکاروں کا بھید کھلے گا
کب حاکم کی عیاری کا تاج گرے گا
مظلوموں کے پیمانوں میں
ناداروں کی زخم رسیدہ، نم آنکھوں میں
خوشی کا کوئی رنگ کھلے گا
کب اس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بُجھے گی

کب عدل وانصاف کا پرچم لہرائے گا
کب بندوق کا سر خم ہوگا
پرجا کی ان کٹیاؤں میں
بے بس، بے کس گلیاروں میں
پھلواری کا روشن ہوگا
کب اس خوں میں غرق زمیں کی پیاس بجھے گی
کب پیاس بجھے گی!
کب پیاس بجھے گی!!

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

الوداع الوداع بنتِ ارضِ ایشیا!

سید شہباز گردیزی

ماتمی فضا ہوئی
کیسے موسموں میں تو
قوم سے جُدا ہوئی
ہم سے کیا خطا ہوئی
دیس کی سحر سے آج
روشنی ہوئی خفا
الوداع، الوداع بنتِ ارضِ ایشیا
صبح کی آنکھ اشکبار
دن بھی سوگوار ہے
شام ہے بجھی بجھی
رات بے قرار ہے
ظالموں نے ظلم کی
آج کر دی انتہا
الوداع، الوداع بنتِ ارضِ ایشیا
اب کسے سکون ہے
شہر خون، خون ہے
مبتلائے سوگ ہیں
بے پناہ روگ ہیں
غم زدہ یہ لوگ ہیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

اے ہماری بادشاہ
الوداع، الوداع اے بنتِ ارضِ ایشیا
کیسے حال میں ہمیں
چھوڑ کر چلی ہے تو
رو رہے ہیں دیس کے
شہر، شہر، گلی، گلی
وقت کے یزید نے
دیکھ لی حسینیّت
آج ترے روپ میں
تو ہماری رہنما
الوداع، الوداع بنتِ ارضِ ایشیا
نقش جیسے آب پر
قاتلوں کے نام کو
وقت یوں مٹائے گا
وہ سبق سکھائے گا
تجھ پہ ہو میرا سلام
محسنہ ہے قوم کی
اے شہیدِ بے خطا
اے کنیزِ کربلا
الوداع، الوداع بنتِ ارضِ ایشیا

بے نظیر کا شریک غم

پیر سید نصیر الدین (گولڑہ شریف)

یہ تخت فاخرہ پر تاجدار بیٹھے ہیں
کہ تیر وقت کی زد میں شکار بیٹھے ہیں

قبائے صبر کئے تار تار بیٹھے ہیں
یہ کس کی یاد میں سب سوگوار بیٹھے ہیں

اُجڑ گیا ہے یہ کس بدنصیب کا گلشن
یہ کس کے سوگ میں لوگ اشکبار بیٹھے ہیں

وہ آصفہ ہو، بلاول ہو یا کہ بختاور
نڈھال غم سے یہ گرد مزار بیٹھے ہیں

ترے جیالے تری راہ میں بینظیر اب بھی
لیے ہوئے دل امیدوار بیٹھے ہیں

نہ بھول پائیں گے تا زندگی، خدا شاہد
وہ تیرے ساتھ جو لمحے گزار بیٹھے ہیں

تسلیاں انہیں دینے کو آئے گا اب کون
ترے غریب سر رہگذار بیٹھے ہیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org
Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

جنہیں گماں تھا کہ دے تجھ کو موت شاید مات
وہ جیت کے بھی تو بازی کو ہار بیٹھے ہیں

یہ غم کوئی ترے بچوں سے پوچھے، جو تجھ کو
خود اپنے ہاتھوں لحد میں اُتار بیٹھے ہیں

دراز عمر ہو آفاق میں بلاول کی
جو اپنے نانا کی اک یادگار بیٹھے ہیں

ہے خانوادہ بھٹو کو تیرے عزم پہ ناز
جو لٹ چکے ہیں مگر باوقار بیٹھے ہیں

نکل کے ان کو دکھا دے ذرا جھلک اپنی
تیری لحد پہ ترے جانثار بیٹھے ہیں

تو وہ خطیبہ، خطابت کو ناز ہے جس پر
تری ہی یاد میں سب دل فگار بیٹھے ہیں

تو ایک چاند، جو ہو تیرگی کے حلقے میں
تو ایک گل، کہ تیرے گرد خار بیٹھے ہیں

بلاول، آصفہ بختاور اور زرداری
لیے ہوئے علم ذوالفقار بیٹھے ہیں

ہے آرزو کہ تیری مغفرت ہو اور انہیں
عطا ہو صبر، جو غم سے دوچار بیٹھے ہیں

نصیر ان سا زیاں کار کوئی کیا ہو گا
جو آپ اپنے مسیحا کو مار بیٹھے ہیں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

کالا دن 4 اپریل

(حزیں لدھیانوی)

سینے میں سچ کے جھوٹ کا نیزہ گیا ہے آج
قانون کا مذاق اڑایا گیا ہے آج

لہرائی آسماں نے پھر انگشت برق کی
اک آسماں کی سمت اشارہ گیا ہے آج

پھیلی ہے بوئے کرب فضا سوگوار ہے
یارو وہ پھول آگ میں پھینکا گیا ہے آج

قید بدن میں جھک نہ سکا جس کا سر کبھی
مقتل میں سر کٹا کے بقا پا گیا ہے آج

تاریکیوں نے وار کیے جس پہ بے شمار
وہ بن کے حریت کا اُجالا گیا ہے آج

وہ جس کے غم میں سارا زمانہ ہے سوگوار
ہو کے امر دلوں میں جگہ پا گیا ہے آج

لوح جہاں پہ چھوڑ کے اک سطر روشنی
سوئے فلک زمیں کا ستارہ گیا ہے آج

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

تاریخ یہ لکھے گی وہ انساں عظیم ہے
پھانسی کے جھولنے پہ جو لہرا گیا ہے آج

انجام انتہائے ستم اب قریب ہے
طوفان احتجاج کا پھر چھا گیا ہے آج

لڑتا رہے گا سیل ہوا سے سدا حزیں
وہ دیپ جو لہو سے جلایا گیا ہے آج

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بے نظیر بھٹو شہید

(یہ نظم صنعتِ توشیح میں ہے جس کے ہر شعر کے پہلے مصرع کا حرف اول لینے سے "بے نظیر بھٹو شہید" برآمد ہوتا ہے)

سرور انبالوی

ب بڑی محترم اور مدبر بڑی — مثال اپنی دنیا میں تھی آپ ہی
ی یہ صورت، یہ سیرت، یہ فہم و ذکا — خداوندِ عالم کی تھی خاص عطا
ن نوید امن کی، خلق کا اک دیا — کہ ذہنوں کو اس نے اُجالا دیا
ظ ظفریاب دنیا سے ہو کر گئی — وہ روتا ہمیں چھوڑ کر چل بسی
ی یہ رتبہ بلند اس کو حاصل ہوا — شہیدوں میں نام اس کا لکھا گیا
ر رہے گی وہ زندہ قیامت تلک — نہ ہو پائے گی ماند اس کی چمک
بھ بھٹکتے ہوؤں کو دکھائے گی راہ — نہ کم ہو گی اس کی کسی آن چاہ
ٹ ٹپکتے ہیں جو اشک اس کے لیے — وہ دامن میں آکر گہر بن گئے
و وفا کا دیا تجھ سے روشن ہوا — ابد تک وہ جلتا رہے گا سدا
ش شہادت کا رتبہ تجھے مل گیا — ترا نام عالم میں اُونچا ہوا
ہ ہوئی سرخرو قوم خوں سے ترے — ترے خوں سے ذرے ستارے بنے
ی یہ کربل ہوئی خوں سے تیرے بپا — لہو سے کیا تو نے روشن دیا
و دلوں میں جو جلتا رہے گا صدا
لحد نور سے تیری بھر دے خدا

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

نظم

(جوہر میر)

اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں
مت پوچھو کیا کھو آئی ہوں، مت پوچھو میں کیا لائی ہوں

کچھ منظر ہیں، کچھ یادیں ہیں، کچھ آنسو، کچھ فریادیں ہیں
کچھ لمحوں کی سوغاتیں ہیں، کچھ گھڑیوں کی رودادیں ہیں

کچھ سنگ زنوں کے تحفے ہیں، جو کچھ بھی ملا، لے آئی ہوں
اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں

دنیا میں چپ ہوں تو دنیا چپ ہے، میں بولوں تو دنیا بولے
جھوٹوں کا بھرم تو کھلنا ہے، اب کھولے کوئی یا کل کھولے

جو عدل کی سولی پہ نہ بہکا، اس عیسیٰ کی سچائی ہوں
اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں

وہ آخری وصل کا لمحہ تھا، جو ہجر کے غم میں بہنے لگا
میں روئی تو وہ ہنسنے لگا، میں تڑپی تو وہ کہنے لگا

میں آزادی کی خوشبو ہوں، میں زنداں کی رشنائی ہوں
اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

وہ پاؤں تلے کی مٹی ہے، کچھ اس کا خوف نہ کھاؤ تم
آندھی میں تنکے اُڑتے ہیں، تنکوں سے نہ گھبراؤ تم

تم بادل بن کر چھا جاؤ، میں بجلی بن کر آئی ہوں
اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org

بھٹو اب بھی زندہ ہے

گل بخشالوی

مرے دیس کا روشن مستقبل پائندہ ہے تابندہ ہے
اک دور حسیں آئندہ ہے بھٹو اب بھی زندہ ہے

کھیتوں اور کھلیانوں میں اک جذبہ ہے دہقانوں میں
تعبیر کا اس کے وقت آیا وہ خواب ہے جو ارمانوں میں
مزدور کا حق تابندہ ہے
بھٹو اب بھی زندہ ہے

اک شعور بپا ایوانوں میں اک رقص ہوا میدانوں میں
مر مر کے جی وہ اُٹھتے ہیں کیا جذبہ ہے پروانوں میں
دشمن اپنا شرمندہ ہے
بھٹو اب بھی زندہ ہے

Shahadat Sey Shahadat Tak; Copyright © www.bhutto.org